

بسم الله الرحمن الرحيم

تم صرف میری ہو  
زارون علی

تم صرف میری ہو

بعض دفعہ آپ کی ایک غلطی زندگی بھر کا عذاب بن جاتی ہے۔

**جملہ حقوق بحق مصنف و ناشر محفوظ**

کتاب کا نام: تم صرف میری ہو

مصنف: زارون علی

ناشر: راه ادب پبلیکیشنز

سروق: شناء اقبال

سن اشاعت: مارچ 2022

تعداد: 1000

قیمت: 800

ISBN No.: 978-969-7984-01-2

## انتساب

اس شخصیت کے نام جو سراپا محبت ہے۔ جس نے مجھے محبت کرنا سکھایا، مجھے اندر ہیروں سے نکالا اور  
میرے لیے مشعل راہ بنی۔ میری ہم راز، میری ہم قدم، میری ہم سفرنور۔

## پیش لفظ

میں ربِ کریم کا شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اپنے افکار، احساسات اور جذبات کو زیب قرطاس کر سکوں۔

ناول ”تم صرف میری ہو“ لکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اس کا ایک ایک لفظ مجھے اتنا ہی عزیز ہے جتنی ایک ماں کو اس کی اولاد۔ وہ اس کی نگہداشت میں اپنی ساری زندگی وقف کر دیتی ہے تب جا کر اعجازِ ثمر حاصل ہوتا ہے یہی حال مصنف کا ہے۔

محبت اور معاشرے پر بہت سے قابلِ قدر مصنفین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ ہر دور کے دو ایسے موضوعات رہے ہیں جو کسی بھی انسان کے اندر فکر کے دریچے واکرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ”محبت“ وہ ازلی جذبہ ہے جس کا وجود تخلیق کائنات سے شروع ہوا اور ابد تک رہے گا۔ محبت ایسا جذبہ ہے جو دنیا میں موجود رہتے ہوئے روح میں اترتا ہے اور ہر ذی روح کو معاشرے سے جوڑے رکھتا ہے۔

ناول ”تم صرف میری ہو“ زارون کی نور سے انتہا کو چھوٹی اور دلوں کو تسخیر کر لینے والی محبت کی ایسی داستان ہے جو ایک طرف بے شمار اتار چڑھاؤ کے باوجود آخر میں اپنا آپ منوالیتی ہے تو دوسری طرف معاشرے کے ان تلخ حقائق کو اجاگر کرتی ہے جو موجودہ دور کا بدترین المیہ ہے۔

ناول میں اگر ایک طرف محبت تمام رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے دلوں میں پروان چڑھتی ہے تو دوسری جانب یقین، رشتتوں کے تقدس، جذبات اور احساسات کو پامال کیا جاتا ہے۔

”یقین“، جو کسی بھی رشتے کا طاقتو رجڑ ہونے کی بنیاد پر اسے پائیدار بناتا ہے اگر ناپید ہو جائے تو وہ رشتہ بکھر نے لگتا ہے اور بے یقینی کی اس چکلی میں ایک لڑکی کو ہی ہر حال میں پسنا پڑتا ہے، اس کے علاوہ

کچھ ایسے لوگ بھی آپ کے رو بروآتے ہیں جو آپ کے اعتماد کی دھجیاں اڑا دیتے ہیں۔ کسی پر جلد بھروسہ کرنا آپ کو کسی بڑے خسارے میں بٹلا کر سکتا ہے جس سے نکلنا ایک مشکل امر ہے۔ رشتؤں کے نام پر لوگوں کے مکروہ چہروں، مقابل کوشہ اور مات دینے والے چال بازوں کی کایا کس طرح پلٹ جاتی ہے یہ کہانی آپ کو اس سے روشناس کروائے گی۔

جہیز جیسی فرسودہ رسم اور معاشرے میں راجح غیر اسلامی رواج کی وجہ سے انسانی جان کو نقصان پہنچانے والوں کے لیے بھی اس میں ایک سبق موجود ہے کیوں کہ ظلم جب حد سے تجاوز کرتا ہے تو سب سے بڑی منصف ذات (اللہ تعالیٰ) ناصرف اپنے طریقے سے اسے روکتی ہے بلکہ ظالم پر آشکار کر دیتی ہے کہ اس کے سامنے وہ کس قدر بے حیثیت ہے۔

ناول کے مرکزی کردار ”زارون“ اور ”نور“ ہیں۔ ”زارون“ کا کردار ایک مضبوط مرد کی حیثیت سے اپنا آپ منواتا اور آنے والے تمام نامساعد حالات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے لیے اس کے اپنے دنیا کی ہرشے سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اور وہ ان کے لیے کسی بھی حد تک جانے کا حوصلہ رکھتا ہے البتہ ”نور“ کا کردار ایک ایسی لڑکی کا کردار ثابت ہوتا ہے جو اپنوں کی بے اعتباری کی وجہ سے ڈراور تھائی کا شکار رہتی ہے۔

ناول میں مرکزی کرداروں کے علاوہ باقی تمام کردار بھی اہمیت کے حامل ہیں جن کی وجہ سے محبت اور معاشرے کے تلخ حلقائق کو زیب قرطاس کرنا آسان ہوا۔

مجھے امید ہے کہ آپ اس ناول کو پڑھ کرداد دیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اس کتاب کو لکھنے میں مجھے بہت سے پیارے لوگوں کا ساتھ میسر رہا۔

سرِ فہرست میرے والدین جنہوں نے میرے اس شوق کو پروان چڑھایا اور مجھے اس قابل بنایا کہ میں اپنی کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکوں، میری ہر کامیابی میرے والدین کے نام جن کی بدولت میں

آج اس مقام پہ ہوں اور یہ میرے والدین کی ہی دعاؤں کا شمر ہے کہ آج میں اپنی تیسری کتاب کو مکمل کر پایا ہوں۔

اس کے بعد میری ہر تحریر "نور" کے نام جو سراپا محبت ہے جس نے میرے لکھنے کے اس سفر میں ہمیشہ میرا ساتھ دیا، میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے اعتماد دیا اس کا مجھ پر اعتماد اور یقین ہی مجھے آج اس مقام تک لا یا ہے کہ میں آپ سب کے سامنے اس کتاب کو پیش کر سکوں۔

آخر میں میں اپنے ان احباب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جو اس کتاب کی اشاعت کے مراحل میں میرے ساتھ تعاون کرتے رہے محترمہ مریم صدیقی اور طوبی صدیقی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کتاب کی ادارت کی اور اس ذمے داری کو بھر پور طریقے سے بھایا، محترمہ خالدہ پروین صاحبہ جنہوں نے میری تحریر کی اصلاح کی، ثناء اقبال کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کہانی کے عین مطابق اور میری پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے سرور ق کی تزئین و آرائش کا اہتمام کیا۔

میرے قارئین (محبت و خلوص کا پیکر) جو مجھے بے انتہا محبت و عزت سے نوازتے ہیں۔ میرے لکھنے ہوئے کوسرائیتے ہیں اور مجھے مزید بہتر سے بہتر لکھنے کا حوصلہ فراہم کرتے ہیں۔

بہترین ادا کار محترم سید محسن گیلانی صاحب اور رانا ز وہبیب علی صاحب کا خصوصی شکریہ کہ انہوں نے بھی میری کتاب کو پڑھا اور اپنی قیمتی رائے سے نوازا۔

زارون علی

شام کے بڑھتے ہوئے سائے اور موسم کے بدلتے تیور دیکھ کر نور کی جان پر بن آئی تھی اُس نے حاشر کو سنے کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے اپنے ڈیپارٹمنٹ کا رخ کیا تاکہ بارش تیز ہونے سے پہلے وہاں پہنچ کر حاشر کا انتظار کر سکے جو اُس کی بیس بار یاد ہانی پر بھی ابھی تک اُسے لینے نہیں پہنچا تھا۔

”آج گھر جاتے ہی ابو سے شکایت کروں گی اور حارت بھائی سے بھی“، نور نے تیز قدم اٹھاتے یونیورسٹی میں موجود چند نفوس کو دیکھا جو اُسی کی طرح یا تو کسی کے انتظار میں بیٹھے تھے یا پھر لیٹ کلاس کے چکر میں اس وقت یہاں بارش میں خوار ہو رہے تھے۔

”افف اللہ کیا مصیبت ہے“، تیز ہوتی بارش سے گھبرا کر اُس نے بھاگ کے اپنا اور ڈیپارٹمنٹ کا چند قدم کا فاصلہ طے کیا اور وہاں قدم رکھتے ہی ایک اور مصیبت اُس کے لیے تیار تھی۔

”آج کا دن ہی منحوس ہے“۔

ڈیپارٹمنٹ میں ہر جگہ سناٹاڈ دیکھ کر اُس نے واپس پلنے کا سوچا مگر اُس سے پہلے ہی اُسے میم فاطمہ اور میم حنا اسٹاف روم میں بیٹھی نظر آ گئیں۔

”شکر ہے کوئی تو ہے یہاں“، دل میں کہتے اُس نے سامنے کلاس کا رخ کیا تاکہ اپنے بیگ سے موبائل نکال کر حاشر کا پوچھ سکے مگر قسمت یہاں بھی اُسے دغادے چکی تھی۔ اُس کے موبائل کی بیٹری ڈیڈ ہونے والی تھی موبائل بس بند ہونے کے قریب تھا۔

”اللہ یہ ساری مصیبتوں میری زندگی میں آج ہی آنی تھیں“، خود کلامی کرتے اس سے پہلے کہ وہ میسج ٹائپ کرتی اسکرین آر جے کے نام سے بلنک ہوئی۔

”کہاں ہو؟ کہیں اپنے خالہزاد کے خیالوں میں کھو کر اپنے چار سالہ پرانے دوست کو تو نہیں بھول گئیں؟“، غصے والے اور شکنی ایموجیز کے ساتھ سینڈ کیے گئے میسج پر اب نور نے ابر واچ کا تے آنکھیں نکالیں اور نقاب اُتارنے کی زحمت کیے بغیر ہی چیسر پر بیٹھ کر میسج ٹائپ کرنے لگی۔

”تو یونی ہوں اور حالہ زاد سے ایک مہینے بعد شادی ہے ابھی ہوئی نہیں کہ اُس کے خیالوں میں کھو جاؤں اور رہی بات چار سال پرانے دوست کی اُس سے میں ایک گھنٹے میں گھر آ کر بات کرتی ہوں،“ ناراضی والے ایموجی کے ساتھ اُس نے حاشر کے بجائے آر جے کو مسیح سینڈ کیا تاکہ وہ پریشان نہ ہو۔ (جو ان چار سالوں میں اُس کے لیے ایک اچھے دوست کے ساتھ ساتھ اپنی نرم اور خیال کرنے والی طبیعت کے سبب نور کی زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکا تھا اور اُس نے آج تک کبھی نور سے کوئی غیر اخلاقی بات نہیں کی اور اب اُس کی شادی پر وہ سب سے زیادہ خوش تھا۔ ہر معاملے میں نور کا ساتھ دینا اُس کی ہر بات کو اہمیت دینا ہر تکلیف میں اُس کے ساتھ رہنا حتیٰ کہ اُس کے سر درد پر وہ ساری ساری رات جاگتا اور بے چین رہتا تھا اور بار بار اُس سے مسیح کر کے اُس کی طبیعت کا پوچھتا جس سے نور اکثر تنگ بھی آ جایا کرتی تھی پر اُس کا فکر کرنا ہر وقت اپنے لیے بے چین دیکھنا اب نور کو بھی اچھا لگتا تھا) اُس کا موبائل آف ہو گیا۔

”اُفف اب کیا کروں میں،“ موبائل ہاتھ میں لیے اُس نے متلاشی نظر وہ سے باہر دیکھا جہاں کچھ لوگ ڈیپارٹمنٹ میں وققے و قفقے سے داخل ہو رہے تھے۔ جوشکل سے تو یونی کے اسٹوڈنٹ ہی لگ رہے تھے مگر پھر بھی نور کو ایک ساتھ تقریباً بیس کے قریب لوگ دیکھ کر گھبراہٹ ہوئی۔ تب ہی وہ اپنا نقاب ٹھیک کر کے گاؤں پہنچی میں کو صاف کرتے بیگ اٹھا کر کمرے سے باہر نکلنے لگی تاکہ دوبارہ گیٹ کے پاس جاسکے مگر جیسے ہی اُس نے قدم باہر کی جانب بڑھائے ان میں سے ایک شخص (جس کا چہرہ باقیوں کی نسبت رومال سے ڈھکا ہوا تھا) اُس کی طرف آیا۔

”عالیاں بیہاں آؤ،“ اُس لڑکے نے اپنے ہی جیسے خوب نوجوان جو ہاتھ میں کچھ کاغذات پکڑے کھڑا تھا اسے اشارہ کرتے کمرے کی طرف آنے کا کہا اور باقیوں کو آنکھ کے ذریعے سب پر نظر رکھنے کا کہا تب ہی دو شخص اسٹاف روم اور باقی دوسرے کمروں کی جانب بڑھے۔ نور نے یہ سب دیکھ کر بیگ

سنچا لتے ہوئے جلدی سے باہر کا رخ کیا مگر اس سے پہلے ہی رومال والے شخص نے اُس کے سامنے آ کر اس کا راستہ روکا۔

”کیا مسئلہ ہے آپ کو؟“ نور نے گھبراہٹ کے باوجود بھی دلیری کا مظاہرہ کرتے اُس کی کالی خوب صورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی مسئلہ نہیں اور تم سے مجھے کبھی کوئی بھی مسئلہ نہیں ہو سکتا“، عالیان کا اشارہ کرتے اُس نے نور کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ دو قدم پیچے ہوتے کمرے میں واپس اُسی کرسی پہ جا بیٹھی جس پر وہ پہلے بیٹھی تھی۔

”پلیز مجھے جانے دو“، اس لڑکے کے ساتھ مزید پانچ لوگوں کو کمرے میں داخل ہوتے اور دروازہ بند کرتے دیکھ کر اب صحیح معنوں میں اُس کی جان نکلی تھی۔ اُس نے اُس نقاب پوش لڑکے کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو وہ اُس کی خوف سے بھری آنکھیں دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”گھبرا نے کی ضرورت نہیں جب تک میں ہوں، یہاں کیا دنیا کا کوئی شخص بھی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا بس پر سکون رہو اور قاری صاحب آپ شروع کریں“۔

اُس کے گلے سے اُس کا یونی کارڈ (جس میں اُس کے شناختی کارڈ کے ساتھ ساتھ سکندر صاحب کی بھی ایک شناختی کارڈ کی کاپی موجود تھی جو نور نے اپنی بھلکڑ طبیعت کی وجہ سے اُس میں رکھی تھی تاکہ کل فارم فل کرتے وقت اُسے پریشانی نہ ہو) نکال کر ایک شخص جو شکل سے قاری یا کسی مسجد کا امام لگ رہا تھا۔ ان کو پکڑاتے ہوئے باقی سب کو بیٹھنے کا اشارہ کرتا خود بھی نور کے ساتھ والی چیسر پر بیٹھ گیا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ نور جس کی خوف کی وجہ سے بولتی بند ہو چکی تھی۔ اُس نے گھٹی ہوئی آواز میں اپنے پاس اُسی نقاب پوش کو بیٹھتے دیکھ کر پوچھا جس کا چہرہ رومال کی وجہ سے وہ دیکھنیں پار رہی تھی۔

”نکاح کر رہا ہوں تم سے“، کالی آنکھوں والے شخص نے جتنی تسلی سے جواب دیا نور نے اتنی ہی حیرت سے اُس کے ساتھ ساتھ ان پانچ نفوس کو دیکھا جو کہیں سے بھی غنڈے یا چور نہیں لگ رہے تھے۔

”میں یہ سب نہیں کر سکتی آپ کیوں کر رہے ہیں ایسا؟“ اُس نے اب خوف کے ساتھ ساتھ باپ اور بھائیوں کی بدنامی اور اپنی عزت کے ڈر سے مراحت کی اور ساتھ ہی اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر اُس سے پہلے ہی اُسے اپنے پیٹ پہ کسی چیز کا دباو محسوس ہوا۔

”خاموشی سے بیٹھی رہو اور جو میں بول رہا ہوں وہی کرو“، لفظوں کے ساتھ ساتھ اُس نے پستل کی نال کا دباو نور کے پیٹ پہ ڈالتا تو وہ ڈر کی وجہ سے پسینے میں نہا گئی۔

”پلیز میرے ساتھ ایسا مت کرو“، قاری صاحب نے اُس کالی آنکھوں والے کے اشارے پر نکاح شروع کیا تو نور نے ایک بار پھر سے مراحت کی۔

”کہا ناچپ کر کے بیٹھو اور جو قاری صاحب پوچھ رہے ہیں بس اُس کا جواب دو“، لمحے میں سختی کے ساتھ ساتھ اب اُس کی آنکھوں میں بھی غصہ دکھائی دے رہا تھا۔

”میں یہ سب نہیں کروں گی بے شک تم جو مرضی کرو“، اُس نے پستل کی پرواکیے بغیر اپنی عزت کی خاطر چیخ کر کہا اور ساتھ ہی کرسی سے اٹھی۔

”ٹھیک ہے۔ تمہیں تو میں کسی صورت نہیں مار سکتا۔ بس تمہاری میم اور جو کچھ اسٹوڈنٹس دوسری کلاس میں موجود ہیں انہیں تمہارا انکار اور یہ چیخنا چلانا دو منٹ میں اس دنیا سے اُس دنیا میں پہنچا دے گا۔“

نور کے چیخنے کا کوئی بھی اثر لیے بغیر اُس نے موبائل نکال کر کال ملائی اور اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک شخص کا نام لے کر اسے شوٹ کرنے کا کہا تو نور کی آنکھیں خوف سے مزید پھیل گئیں۔

”پلیز ایسا مت کرو انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے“، باقی پانچوں نفوس کو خاموش دیکھ کر نور نے

اُس کا لی آنکھوں والے کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

”بگاڑا تو میں نے بھی تمہارا کچھ نہیں پھر کیوں مجھے زبردستی کرنے پر مجبور کر رہی ہو،“ اٹھ کر اُس کے قریب آتے اُس نے بہت پیار اور نرمی سے کہا۔

”پلیز،“ نور نے زور سے آنکھیں بند کر کے اُسے خود سے مزید قریب ہونے سے روکا۔

”ہم اور کے شباب اب اچھے بچوں کی طرح بیٹھو اور جو قاری صاحب پوچھ رہے ہیں جواب دو،“ پسٹل دوبارہ سے اُس کے پیٹ پر رکھتے وہ بے حد نرمی سے بولا۔

”پلیز میرے بھائی،“ نور نے پھر سے کچھ بولنا چاہا مگر اُس سے پہلے ہی اُس شخص نے ہوا میں فائز کیا جو پسٹل میں لگے سائلنسر کی وجہ سے بے آواز چھٹ سے ٹکراتے وہاں موجود سب لوگوں کو ساکت کر گیا۔

”اب ایک اور لفظ نہیں، جو بول رہا ہوں وہ کرو،“ اُس کے بازو کو سختی سے اپنی گرفت میں لیتے اُس نے نور کو بٹھایا، ساتھ خود بھی بیٹھتے قاری صاحب کو نکاح شروع کرنے کا کہا۔ جو اُس شخص کی دہشت سے پہلے ہی کافی خوف زدہ تھے گولی چلانے سے اور ہو گئے۔ اسی لیے اُس کی بات پر اثبات میں سر ہلاتے کا نپتی آواز میں نور کی طرف متوجہ ہوئے جواب بے بسی سے بیٹھی رور رہی تھی۔

”بیٹا آپ کو زارون علی ولدا خشام علی حق مہر سکھ رانج الوقت پچاس لاکھ۔۔۔“ قاری صاحب نے بولنا شروع کیا تو نور نے اُس شخص کے خوف سے اُن کی کوئی بات سنے بغیر ہاں میں سر ہلایا اور بے دھیانی میں اُن کی بتائی جگہ پر دستخط کرتے وہ دل میں اُس شخص کا قتل کرنے کا ارادہ کر چکی تھی۔ جس نے کچھ ہی دیر میں اُس کی اور اُس کے گھر والوں کی عزت کو یوں نیلام کر دیا تھا۔ اس کی رضا مندی کے بعد قاری صاحب نے اُس شخص سے وہی سوال کیا اور اُس کے دستخط کرتے ہی دعا کے بعد سب اُسے مبارکباد دینے لگے جواب کافی خوش لگ رہا تھا مگر نور بالکل ساکت، آنکھوں میں بے یقینی لیے اُس سارے

ماحول سے بے خبر گم صمی میٹھی آنسو بہار ہی تھی۔

”آپ لوگ باہر انتظار کریں میں آتا ہوں“، ان سب سے کہتے وہ اُس کی جانب متوجہ ہوا جس کی آنکھوں سے مسلسل گرتے آنسو اُسے تکلیف دے رہے تھے۔

”تو سویٹ ہارت آج سے تم میری ہو صرف میری“، ان کے جاتے ہی زارون نے دروازہ بند کر کے نور کا ہاتھ تھامات تو وہ بدک انٹھی۔

”تم نے جو میرے ساتھ کرنا تھا کرچکے اب پلیز میرے قریب مت آنا“، اُس کی بات پر ہوش میں آتے اُس نے خالی کمرے کو دیکھ کر بدواستی سے کہا۔

”قریب کب آیا؟ بس تمہیں منہ دکھائی دینا چاہتا ہوں“، دو قدم آگے بڑھاتے ہوئے اُس نے نور کے نقاب میں چھپے چہرے کو دیکھتے اپنی پیش رفت جاری رکھی۔

”پلیز تم جو بھی ہو پلیز میرے قریب مت آنا“، پیچھے دیوار کے ساتھ لگتے اُس نے بھر سے ہاتھ جوڑ لے۔

”قریب آنے کا شرط فکیٹ مجھے چند منٹ پہلے اللہ کی طرف سے مل چکا ہے اور رہی بات کچھ کرنے کی تو میری جان میں ایک کام تمہاری مرضی کے خلاف کر چکا ہوں دوسرا نہیں کروں گا“، دیوار پر ایک ہاتھ رکھتے اُس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑی پسٹل نور کی پسلی پر رکھی۔

”مجھے جانے دو“، خوف سے آنکھیں بند کرتے وہ اُس کی اس قدر قربت پر پریشان ہوئی۔

”چلی جانا ویسے بھی تمہارا بھائی ابھی اپنی بائیک ٹھیک کروار ہاہے۔ اُسے آنے میں کچھ وقت لگے گا۔ تب تک تم اور بس میں“، آنکھوں میں شوخی لیے اُس نے نور کے کان کے قریب ہوتے سرگوشی کی تو وہ حاشر کے حوالے پر رونا بھول کر پوری آنکھیں کھوں کر اُسے دیکھنے لگی جو مسکراتی آنکھوں سے اُسے دیکھتے اوپر لگے سونچ بورڈ پہ ہاتھ مار کر لائٹ بند کر چکا تھا۔

”پلیز“، اس کا ہاتھ اپنی کمر پر محسوس کرتے وہ اندھیرے اور انجان شخص کی قربت پر پریشان ہو کر پھر رونے لگی کیوں کہ باہر شام کے سائے ڈھلنے اور بارش کی وجہ سے پہلے ہی اندھیرا تھا اور اب اس کے لائٹ بند کرنے سے پورا کمرا تاریکی میں نہا گیا مگر پھر بھی ایک طرف دروازے کی جھری سے تھوڑی سی روشنی آرہی تھی۔

”رویامت کرو تمہارا رونا مجھے تکلیف دیتا ہے“، پسٹل کی نال مزید اس کے پیٹ میں گھساتے وہ باہر سے آنے والی ہلکی روشنی میں اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”پلیز، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے“، نور نے اس کا رومال ہٹانے کی جرأت نہیں کی۔

”کچھ نہیں بگاڑا، تم تو میری جان ہو“، ہاتھ سے اس کی پن اُتار کر اُسے نقاب سے آزاد کرتے وہ اس کے گلابی چہرے کو دیکھنے لگا جو رونے کی وجہ سے سرخ ہو چکا تھا۔

”بیوٹیفل، مائی ڈال“، مسکراتے ہوئے زارون نے اس کی بھوری آنکھوں میں دیکھا اور ساتھ ہی اُسے اپنی آنکھیں بند کرنے کا حکم دیا جواب کسی بھی تاثر کے بغیر اُسے دیکھ رہی تھی۔

اس پر کوئی اثر ہوتا نہ دیکھ کر زارون نے پسٹل پینٹ میں رکھتے اس کی کمر میں ہاتھ رکھ کر خود سے قریب کیا جو بے خوفی سے اب اُسے دیکھ رہی تھی مگر اس کے اگلے عمل سے وہ ڈراور بے خوفی غصے اور بے بسی میں بدل چکی تھی۔ جب زارون نے خود اندھیرے والی سائیڈ پر ہوتے اُسے کمر سے پکڑ کر تھوڑا اوپر کرتے اپنارومال ہٹا کر اس کے ہونٹوں پر جھک کر اپنے رشتے کی پہلی مہر ثبت کی تو نور نے اس کے عمل پر اس کی شرط کو سختی سے مٹھی میں دبوچ کر اپنی آنکھیں زور سے بند کیں۔ چند سینٹ بعد وہ اپنی شدت کا اظہار کر کے پیچھے ہٹا تو اس کے چہرے پر رومال پھر سے موجود تھا۔

”شادی مبارک ہو مائی بیوٹیفل ڈال“، پیچھے ہٹ کر اس کی بند آنکھوں کو دیکھتے ہوئے وہ بولا اور اس کے اسکارف کو پکڑ کر واپس پن لگاتے پھر سے اس کے کان کے قریب جھکتے سرگوشی کی۔

”مجھے ہمیشہ پاک چیزیں پسند ہیں اور میں کبھی بھی کسی ناپاک چیز کو نہیں چھوتا اور تم میرے لیے چیز نہیں بلکہ میری پنسز ہوا اور تمہیں میں کیسے نامحرم ہو کر چھو سکتا تھا“، اپنی بات مکمل کرتے اُس نے لائٹ آن کی اور اُس کی کمر سے ہاتھ ہٹاتے الگ ہوا تو نور نے جلدی سے اپنی آنکھیں کھولیں گے جو رو نے کی وجہ سے سرخ ہو چکی تھیں۔

”آجاؤ بہر“، دروازہ کھولتے اُس نے کارڈ پھر سے اُس سے تھما یا اور باہر کھڑے اپنے لوگوں کو اشارہ کرتے ڈیپارٹمنٹ کا دروازہ کھولنے کا کہا۔

”کیا سوچ رہی ہو چلو تمہارا بھائی آگیا ہے“، اُسے وہیں کھڑا دیکھ کر زارون نے بیگ اُس کو پکڑا یا جو حاشر کے آنے کا سنتے ہی کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر بیگ اٹھاتے جلدی سے باہر کی جانب بھاگی۔ اُس کے جاتے ہی زارون نے اپنے بندوں کو باہر نکلنے کا کہتے اپنی شناخت کے متعلق وہاں موجود لوگوں کے ساتھ ساتھ نور کے ذہن میں بھی کئی سوال چھوڑ گیا تھا۔

خوف کے مارے وہ کہیں بھی دیکھے بغیر تقریباً بھاگتے ہوئے اپنے بے جان وجود کو لے کر گیٹ تک پہنچی مگر وہاں حاشر کی بجائے حارت کو دیکھتے ہی اُس کی ہمت جواب دے گئی۔

”سوری نور وہ حاشر کی بائیک خراب ہو گئی تھی اور اُس نے بتایا ہی مجھے اتنی دیری سے“، حارت اُسے دیکھتے ہی اُس کے قریب آ کر بتانے لگا مگر اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نور کی آنکھوں کے آگے اندر ہیرا آیا اور وہ حارت کے بروقت پکڑنے سے اُس کی بانہوں میں ہی جھوول گئی۔

”نور، نور العین کیا ہوا ہے تمہیں؟“، حارت نے اُس کو سنبھالتے فکر مندی سے آواز دی اور اُس کے جسم میں کوئی حرکت نہ دیکھ کر جلدی سے اپنی گاڑی میں ڈالا اور اگلے دس منٹ میں وہ اُسے لے کر ہسپتال پہنچ چکا تھا۔ جہاں تقریباً ایک گھنٹے بعد اُسے ہوش آیا۔

”میں کہاں ہوں؟“، آنکھیں کھولتے خود کو ایک انجان جگہ پر دیکھ کر اُس نے بیٹھنے کی کوشش کی تو

حارت نے آگے بڑھ کر اسے ایسا کرنے سے روکا۔

”ہم ہسپتال میں ہیں، پریشان نہ ہو اور لیٹ جاؤ“، نرمی سے کہتے وہ اُسے لٹانے لگا تو نور کو اپنے بے ہوش ہونے کے بارے میں یاد آیا اور اُس کے ساتھ ہی اُس سے چند منٹ پہلے ہونے والا واقعہ بھی جس کی وجہ سے اُس کی یہ حالت ہوئی تھی۔

”کیا ہوا ہے میری گڑیا کیوں ایسے پریشان ہو رہی ہو؟ بس بی پی لوٹھا اس لیے ڈاکٹر نے ڈرپ لگا دی“، حارت جو اُس کے قریب ہی کھڑا تھا اُس نے یہ سوچ کر اُسے تسلی دی کہ شاید وہ یہاں آنے سے اور ڈرپ کو دیکھ کر پریشان ہے۔

”بھائی مجھے گھر جانا ہے“، نور نے اُس کی بات سنتے ہی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔

”بس یہ ڈرپ ختم ہو جائے تو چلتے ہیں اور تم دیکھنا آج حاشر کو مجھ سے کیسے جوتے پڑتے ہیں۔ ایک کام کہا تھا وہ بھی اُس سے نہیں ہوا“، اب کی بار حارت نے حاشر کے وقت سے نہ پہنچنے پر غصہ کیا تو نور نے اپنے بھائی کی پریشانی پر آنکھیں بند کرتے اپنے آنسو اندر اُتارے۔

”پیونیورسٹی میں کچھ ہوا تھا کیا؟“، حارت نے اُس کے جواب نہ دینے پر نرمی سے پوچھا۔

”نہیں بھائی کچھ نہیں ہوا بس میں گھبرا گئی تھی۔ بارش بھی بہت تیز ہو رہی اور یونی بھی خالی تھی تو مجھے ڈر لگنے لگا“، حارت کے پوچھتے ہی نور نے اُس کے سوال سے زیادہ وضاحت دی تاکہ اُسے شک نہ ہو مگر کب تک؟ کب تک وہ یہ بات سب سے چھپائے گی۔ سکندر صاحب تو پہلے ہی اُس کے آگے پڑھنے کے خلاف تھے اور اگر انہیں یہ بات پتا چل جائے تو وہ اُسے زندہ دن کر دیں گے۔ کوئی بھی اُس کی بات کا یقین نہیں کرے گا۔ یہ سوچ آتے ہی اُس کی آنکھیں پھر سے آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”نور کیا ہوا ہے؟ میری گڑیا کوئی مسئلہ ہے یا کسی نے کچھ کہا ہے تو مجھے بتاؤ“، حارت کو اُس کے بار بار رو نے پہ پریشانی ہونے لگی اسی لیے اُس نے اپنی بات پھر سے دوہرائی۔

”نہیں بھائی کچھ نہیں ہے۔ آپ کو پتا تو ہے مجھے بارش سے کتنا ڈر لگتا ہے اور شام بھی ہو گئی تھی اندھیرا ہو رہا تھا،“ اپنے آنسو صاف کرتے اُس نے خود کو مزید رو نے سے روکا۔

”ہاں جانتا ہوں اندھیرے میں تمہاری جان نکل جاتی ہے۔ ویسے حد ہے نور خود کو تھوڑا مضبوط کرو۔ دیکھو تمہارے جیسی ہی لڑکیاں ہوتی ہیں جو اکیلے پوری دنیا گھوم آتی ہیں،“ اب کی بارہارث نے اُس کی بات پر مسکراتے ہوئے مثال دے کر سمجھانے کی کوشش کی جواکثر ہی وہ بات بات پر کرتا تھا۔

”جی اُن کے ابو میرے ابو جیسے نہیں ہوتے تب ہی وہ دنیا گھوم آتی ہیں،“ نور نے تلخ ہوتے سکندر صاحب کا حوالہ دیا تو حارث بھی اُس کی بات سنتے چپ ہو گیا۔

”اپھا چھوڑو یہ سب یہ بتاؤ کوئی دوست بنائی یا نہیں؟“ حارث نے اپنے دو مہینے سے پوچھے جانے والے سوال کو پھر دو ہرا یا۔

”نہیں ابھی تو نہیں بنائی،“ نور کا دھیان اب مکمل طور پر حارث کی طرف تھا۔

”تو بنا لو دو مہینے سے تمہیں کہہ رہا ہوں پر تم ہو کہ سنتی ہی نہیں اور دیکھو آج وہاں تمہاری کوئی دوست ہوتی تو تم اتنا پریشان نہ ہوتیں،“ حارث نے ہمیشہ کی طرح اُسے چھوٹے بچوں کی طرح نصیحتیں شروع کیں تو نور بھی مسکراتے ہوئے اُس کی باتوں کا جواب دینے لگی اور اگلے آدھے گھنٹے میں ڈرپ ختم ہوئی تو حارث اُسے لے کر گھر آیا جہاں سکندر صاحب کا پارہ ساتویں آسمان پر تھا۔

”کہاں سے آ رہی ہو تم؟“ انہوں نے حارث کو نور کا ہاتھ پکڑے اندر داخل ہوتا دیکھ کر چیخ کر پوچھا۔

”وہ ابو حاشر کی با تیک خراب ہو گئی تھی تو مجھے یونیورسٹی پہنچنے میں دیر ہو گئی،“ نور کے بجائے حارث نے جواب دیا تو سکندر صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

”میں نے تم سے بات نہیں کی اس سے کر رہا ہوں،“ نور جو پہلے ہی ڈری ہوئی تھی سکندر صاحب

کی گرج سے مزید سہم کر حارت کے پچھے چھپ گئی۔

”ابو میں آپ کو بتا رہا ہوں نا مجھے دیر ہو گئی تھی اور راستے میں اتنی بارش اور ٹریفک تھا کہ...“

”میں نے تم سے نہیں پوچھا نور العین تم جواب دو،“

سکندر صاحب کو پتا تھا کہ حارت نور کی غلطی ہوتے ہوئے بھی انہیں بھنک تک نہیں پڑنے دے گا۔ تب ہی انہوں نے سہمی کھڑی نور کو مخاطب کیا۔ جو تھی تو ان کی بیٹی ہی مگر اس کی پیدائش کے پچھے دیر بعد ہی عالیہ بیگم کی موت نے سکندر صاحب کو ہمیشہ کے لیے نور سے بدگمان کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی بات کو پکڑ کر یونہی شروع ہو جاتے تھے۔

”نور تم اپنے کمرے میں جاؤ،“ حارت نے اس کی طبیعت کے پیش نظر سکندر صاحب کی پرواکیے بغیر اس سے کہا جو اس کی بات سنتے ہی جلدی سے اپنا بیگ تھامے سیڑھیاں چڑھتے اپنے کمرے میں چل گئی۔

”ابو کیا ہو جاتا ہے آپ کو؟ کیوں آپ اس کے پچھے پڑے رہتے ہیں ہر وقت اور میں نے جب اس پ کو بتایا کہ غلطی میری اور حاشر کی تھی تو آپ اسے کیوں ڈانت رہے ہیں؟“ حارت نے ان کے سامنے آکر غصے کے باوجود نرمی سے بتایا۔

”مجھے اس لڑکی پہ ذرہ برابر اعتبار نہیں یہ پیدا ہوتے ہی اپنی ماں کو نگل گئی اور اب ہمیں بھی کسی قابل نہیں چھوڑے گی،“ سکندر صاحب نے اپنی بہن کی پڑھائی ہوئی پٹی پر بولتے ہوئے (جونور کی پھوپھو ہونے کے ساتھ ساتھ طلاق یافتہ ہو کر اپنی ایک بیٹی سارہ کے ساتھ پچھلے بیس سال سے سکندر صاحب کے ہی گھر میں موجود اپنی پوری حکمرانی جمائے پیٹھی ہمیشہ سارہ کو اچھا اور نور کو سکندر صاحب کی نظروں میں گرانے کی کوشش میں لگی رہتیں) حارت کو مزید غصہ دلایا۔

”پہلی بات یہ کہ امی کو نور العین کی وجہ سے کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ پہلے ہی مختلف بیماریوں میں بنتا تھیں۔“

اور دوسری بات زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس میں کسی انسان کا قصور نہیں۔ باقی مجھے یقین ہے کہ میری بہن کبھی ایسا کوئی کام نہیں کرے گی جس کی وجہ سے مجھے یا آپ کو شرمندگی ہو، دلوں کا انداز میں جواب دیتے وہ سکندر صاحب کو مزید کچھ بولنے کا موقع دیے بغیر سیڑھیاں چڑھتے اور نور کے کمرے میں آگ کیا تاکہ اُسے دیکھ سکے۔

”اس کا بھی دماغ ٹھیک کرنا ہی پڑے گا مجھے“، اُسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر سکندر صاحب نے خود کلامی کی اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

”بس کرو رونا پہلے ہی طبیعت خراب ہے“، حارث نے اُس کے کمرے میں آتے ہی اُسے گھٹنوں پہ سر کے رو تاد کیکھ کر ڈالنا۔

”آپ نے ابو کو کیوں نہیں بتایا کہ ہم ہسپتال میں تھے؟“ نور نے ہچکیوں کے درمیان اُس سے پوچھا۔

”اس لیے کہ وہ مزید کوئی ایشو بنا کر تھیں نہ ڈانٹیں۔ شکر کرو پھوپھو اور سارہ گھر پہ نہیں تھیں ورنہ آج تمہارے ساتھ ابو نے میری بھی طبیعت صاف کر دینی تھی“، اُس کے آنسو صاف کرتے وہ مسکراتے ہوئے اُسے ڈرانے کی کوشش کرنے لگا تو نور نے سوچتے ہوئے جھر جھری لی۔

”بھائی پلیز نہ تنگ کریں پہلے ہی ابو کے غصے کو دیکھ کر میری جان نکلی ہوئی ہے“، کہتے ہوئے اُس نے حارث کے ہاتھ میں پکڑا اپنی کا گلاس لبوں سے لگایا۔

”بس کرو اور نہ ڈرا کرو اتنا، یہ جو تم بات پر رونے لگ جاتی ہونا پھوپھو اور سارہ کو اسی لیے اتنی شہ ملی ہوئی ہے۔ اُن سے زیادہ یہ گھر تمہارا ہے۔ اس لیے خود کو مضبوط کرو اور اپنے حق کے لیے لڑنا سیکھو“، اب کی بار حارث نے تھوڑی سختی سے بات کی وہ نور کی رونے والی عادت سے بے حد عاجز تھا۔

”ہونہہ.....!! ابو نے کبھی مجھے حق ہی نہیں دیا کہ میں اس گھر کو اپنا کہہ سکوں اور ویسے بھی اب ایک

مہینہ ہی کی توبات ہے۔ میں ابوسمیت آپ سب کی جان چھوڑ دوں گی، نور نے اپنی شادی کا حوالہ دیا جو حارث کی بے جا مخالفت کے باوجود بھی سکندر صاحب نے طے کر دی تھی اور اس شرط پر ہی نور کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کی بھی اجازت ملی تھی۔

”یہ گھر ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا شادی کے بعد بھی۔ میں اور حاشر جب تک زندہ ہیں تمہیں بھی بھی کوئی تکلیف نہیں آنے دیں گے اور حاشر سے یاد آیا یہ بد تیز ہے کہاں ابھی تک گھر نہیں آیا“، حارث نے بات کرتے کرتے حاشر کی غیر موجودگی کا نوٹس لیا اور نور کو اب کچھ دیر آرام کرنے کا کہتے خود حاشر کو کال کرنے کی غرض سے باہر آ گیا۔

”میں حارث بھائی کو سب بتا دوں؟“ نور نے اپنے آپ سے سوال کیا مگر پھر حارث کے رد عمل اور خود سے بدگمان ہونے کا سوچتے اُس نے اپنا ارادہ ترک کیا۔ اب بس ایک ہی شخص تھا جسے وہ یہ سب بتا سکتی تھی اور وہی اُس کی کوئی مدد کر سکتا تھا۔

آرجے کا خیال ذہن میں آتے ہی اُس کے جسم میں جان آئی۔ اُس نے جلدی سے اپنا موبائل بیگ سے نکال کر چار جنگ پر لگایا اور اُسے آن کرتے ”کہاں ہیں؟“ کا مسیح ٹائپ کرتے آرجے کو سینڈ کیا جس کا جواب اُس کی امید کے مطابق فوراً ہی آ گیا۔

”میں اسی دنیا میں ہوں پر تم کہاں ہو ایک گھنٹے کا بولا تھا تم نے اور اب پورے تین گھنٹے بعد مسیح کیا ہے، غصے والے ایمو جی کے ساتھ اُس نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا تو نور نے اُسے اپنی طبیعت خرابی کا بتایا جس پر وہ اب پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ اُسے اپنا خیال نہ رکھنے پڑا انٹ رہا تھا۔

”اُفف آرجے بس کریں اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں مجھے، میری پہلے ہی طبیعت خراب ہے اور سے حارث بھائی کو بھی میری وجہ سے اتنا کچھ سننا پڑا ابو سے“، نور نے اُس کے نان اسٹاپ نصیحتوں اور مشوروں سے بھرے مسیح آتے دیکھ کر غصے سے بھرا مسیح کرتے اُس کو بریک لگانے کا کہا۔

”میں ڈانٹ نہیں رہا مجھے فکر ہو، ہی تھی تمہاری مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ تم ٹھیک نہیں ہو اور میں کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ اپنے ابوکو ان کے حال پہ چھوڑ دو۔ ان کی باتوں کو دل پنه لیا کرو“، آر جے نے پھر سے اپنا لیکھر شروع کیا تو نور نے زچ ہو کر اس کے آگے ہاتھ جوڑے ایموجی سینڈ کیا۔

”ہونہہ اٹھ جاؤ کچھ کھاؤ اور بس اپنا خیال رکھو۔ کھانا کھا کے بتا دینا میں پھر کھاؤ گا۔“

”افف آر جے ایک تو میں آپ کی اس عادت سے تنگ ہوں“، نور نے اس کی بات پر مسکراتے ہوئے مسیح طاپ کیا۔

”تو مجھے اچھی لگتی ہے اپنی یہ عادت تمہاری فکر میں نہیں کروں گا تو تمہیں تو اپنی کوئی پرواہ نہیں“، اس نے ایک بار پھر سے اپنا پسندیدہ کام شروع کیا تو نور بھی اب سب بھلائے اُسے تسلی دینے لگی کہ وہ ٹھیک ہے پروہ جانتی تھی کہ اب وہ نہ ساری رات خود سوئے گانہ اُسے سونے دے گا۔

زین (آر جے کا اصل نام زین تھا مگر لوگ اُسے زیادہ تر آر جے کے نام سے ہی جانتے اور پہچانتے تھے تب ہی نور بھی اس کے اصل نام کے بجائے اُسے آر جے کہہ کر پکارتی تھی) سے اس کی بات فیس بک پر ہوئی۔ جو چند مہینوں میں ہی دوستی کے ساتھ ساتھ اعتبار اور یقین کے ایسے رشتے میں بندھی کہ نور اپنی ہربات اور پریشانی اُس سے شیر کرنے لگی۔ زین بھی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات اُس کو بتاتا۔ ان چار سالوں میں وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب ہونے کے باوجود بھی اپنی حدود میں رہے کیوں کہ نور نے زین کو پہلے ہی اپنی بچپن کی ملنگنی کے بارے میں بتا دیا تھا۔



سکندر صاحب دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ والد صاحب کا کپڑے کا اچھا خاصا کار و بار ہونے کی وجہ سے انہوں نے بچپن کافی خوشحالی میں گزارا مگر کار و بار دونوں بھائیوں کے ہاتھوں میں جاتے ہی اُن کی لا پروا طبیعت کی وجہ سے بر باد ہونے میں چند مہینے لگے تب ہی وہ باقی زمینوں وغیرہ سے اپنا حصہ

لے کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مار باپ اور دو بہنوں کا بوجھ سکندر صاحب پر ڈال کر دوسرا شہروں میں آباد ہو گئے۔ ان حالات میں سکندر صاحب نے اپنے حصے کی رقم سے دوبارہ سے کپڑے کا کاروبار شروع کیا جو صدق صاحب (سکندر صاحب کے والد) کی اچھی جان پہچان اور سکندر صاحب کی اپنی نرم اور مخلص طبیعت کی وجہ سے دن بدن ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ بہنوں کا فرض ادا کرنے کے بعد صدق صاحب نے اپنے ہی ایک دوست کی بیٹی سے سکندر صاحب کی شادی کی جن کی آمد سے گھر کے ساتھ ساتھ کاروبار میں بھی مزید وسعت آئی۔ عالیہ بیگم خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سمجھ بوجھ رکھنے والی خاتون تھیں انہوں نے سکندر صاحب کا زندگی کے ہر موڑ پر ساتھ دیا۔ دو سال بعد اللہ نے پہلی اولاد حارت کی شکل میں دی تو سکندر صاحب کے ساتھ ساتھ صدق صاحب اور عذر اخاتون (سکندر صاحب کی والدہ) بھی بہت خوش تھیں۔ گھر میں نئے مہماں سے جیسے بہاری آگئی تھی۔ فریحہ اور رافعہ (سکندر صاحب کی بہنیں) بھی بھتیجے کی پیدائش پر کافی خوش تھیں تب ہی اللہ نے فریحہ پر بھی چار سال بعد اپنا کرم کیا اور حارت کے ایک سال کے ہوتے ہی فریحہ کی گود میں نئی سارہ آگئی جس کے پیدا ہوتے ہی سکندر صاحب نے اپنے صاحزادے کے لیے سارہ کو پُختا۔ وقت ایسے ہی تیز رفتاری سے گزر اور دو سال بعد اللہ نے سکندر صاحب کو ایک اور پیارے سے بیٹی سے نوازا جس کی پیدائش پر انہوں نے خوشی کا اظہار کرتے اللہ سے بیٹی کی دعا کی انہیں شروع سے ہی بیٹیاں بہت پسند تھیں۔

حاشر کی پیدائش کے بعد وہ ہر وقت عالیہ بیگم سے یہ بات کہتے کہ اب اللہ مجھے بیٹی دے دے پر چار سال تک اللہ نے ان کی یہ دعا قبول نہیں کی اور ان چار سالوں میں صدق صاحب کے ساتھ ساتھ عذر ا بیگم بھی ان کا ساتھ چھوڑ کر ابدی نیند سوچکی تھیں۔ حارت کے ساتھ ساتھ حاشر بھی اسکوں جانے لگا تو ایک بار پھر سے عالیہ بیگم کی گود ہری ہوئی اور اس بار سکندر صاحب کی خوشی پہلے سے کہیں زیادہ تھی کیوں کہ اس بار ڈاکٹر نے بیٹی کا بتاتے ان کی اتنے سالوں کی خواہش کو پورا کر دیا تھا۔ انہیں بے صبری

سے اپنی نئی پری کا انتظار تھا۔ جو چند مہینوں بعد اس دنیا میں آئی تو عالیہ بیگم جیسے نقش اور اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھوں اور دودھیا رنگت سے وہ سکندر صاحب کے ساتھ ساتھ حارت اور حاشر کو بھی کسی گڑیا جیسی لگی مگر عالیہ بیگم کی بگڑتی حالت کی وجہ سے سب ہی اُس گڑیا کو بھول گئے۔ نور العین (جس کا نام بھی سکندر صاحب نے خود رکھا) کی پیدائش کے پچھے گھنٹے بعد، ہی عالیہ بیگم اُن سب کو روتا ہوا چھوڑ کر اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے چلی گئیں تب ہی سب خاندان کے ساتھ ساتھ فریجہ بیگم نے بھی نور کو منحوس قرار دیتے سکندر صاحب کا دل اُس کی جانب سے بدگمان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن رافعہ نے اپنی صائم طبیعت کے پیش نظر سکندر صاحب کو سمجھایا اور پانچ مہینوں تک نور کا خیال رکھا۔ جو ماں کے لمس تک کونہ پا سکی تھی۔

سکندر صاحب نے سب کے کہنے کے باوجود بھی دوسری شادی نہیں کی اور نور کے لیے ایک آیا کا انتظام کیا مگر حارت اسکوں سے آتے ہی سارا وقت نور کے ساتھ رہتا اور خود اُس کے سارے کام کرتا (وہ شروع سے ہی ایک سمجھدار بچہ تھا جو آٹھ سال میں ہی ماں کے پھر نے پر خود کو سنبھالتے اپنے دونوں چھوٹے بہن بھائی کو دیکھتا اُن کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا) کیوں کہ وہ نرم سی گڑیا اُسے شروع دن سے ہی بہت پسند تھی اور نور بھی حارت کے لمس اور آواز سے اتنی مanos تھی کہ اُس کے گھر آتے ہی وہ اپنے نئے ہاتھ پاؤں چلانے لگتی۔ سکندر صاحب عالیہ بیگم کی وفات کے بعد بالکل بکھر چکے تھے اور اپنے کاروبار کو بھی دوسروں کے آسرے پر چھوڑ کر خود سارا دن کمرے میں بند رہتے مگر رافعہ کے سمجھانے پر انہوں نے خود کو سنبھالا اور پھر سے اپنے کاروبار کو دیکھنے لگے تب ان ہی دنوں میں فریجہ کے شوہرن دوسری شادی کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں طلاق کا تھہ دیتے سات سالہ سارہ کے ساتھ رات کے پھر گھر سے نکلا تو وہ سکندر صاحب کے در پر آ بیٹھیں۔ بیوی کے غم کے بعد اب بہن کا دکھ سکندر صاحب کو آدھا کر گیا۔ انہوں نے فریجہ کو اپنے ہونے کا یقین دلاتے حوصلہ دیا اور کچھ سالوں تک دوسری شادی کے

لیے بھی کہتے رہے مگر فریجہ نے انکار کرتے اب اُن کے بچوں کی بھی ذمے داری لے لی سارا گھر اب فریجہ بیگم چلاتی تو سکندر صاحب بھی کچھ سال کہنے کے بعد خاموش ہو گئے۔

نوراب چار سال کی ہو چکی تھی اور اُس نے بھی حاشر کے ساتھ اسکول جانا شروع کر دیا جو حارت کے عکس شراری ہونے کے ساتھ سکندر صاحب کے لاڈ پیار کی وجہ سے کافی ضدی بھی تھا۔ شروع شروع میں وہ نور کا کافی خیال رکھتا مگر پھر اپنی لاپروا طبیعت کی وجہ سے وہ اُس پر بالکل دھیان نہیں دیتا اور گھر میں بھی سکندر صاحب کی ہر وقت ڈانٹ اور فریجہ بیگم کی روک ٹوک اور ہر وقت سارہ کو اُس پر ترجیح دینے اور سکندر صاحب کے سامنے نور کو بُرا بنانے کے چکر میں لگے رہنے کی وجہ سے وہ بہت چڑچڑی ہو گئی، ہر وقت چپ چاپ گھر کے کسی کو نہ میں بیٹھی رہتی یا پھر بات بات پر رونے لگتی۔ اسکول سے بھی مسلسل آتی شکایت پر جہاں سکندر صاحب نے نور کو ڈانٹا وہیں حارت نے اپنی چھوٹی معصوم سی بہن کو سینے سے لگاتے ماں باپ، بہن بھائی سب کا فرض ادا کرنے کا سوچ لیا، اب وہ کانج سے آ کے خود نور کو پڑھاتا۔ اُس کے ساتھ کھیلتا اُس سے وقت دیتا۔ حارت کو دیکھتے حاشر بھی اب نور اعین کا خیال کرنے لگا مگر اتنے سال گزرنے کے باوجود بھی سکندر صاحب کے لبھے میں کوئی نرمی نہیں آئی اور اگر کبھی آ بھی جاتی تو فریجہ بیگم پھر سے اُن کے کان بھرنے میں درنہیں لگاتی۔



”یار بس کرو، کب تک ایسے گھن چکر بنے پھرتے رہو گے؟“ زارون نے عالیاں کو پچھلے دو گھنٹے سے فلیٹ میں ادھر سے ادھر چکر لگاتا دیکھ کر ٹوکا۔

”تو اور کیا کروں بھنگڑے ڈالوں کہ میرے یار نے زبردستی ایک لڑکی کی زندگی تباہ کر دی،“ زارون کی بات سنتے ہی عالیاں جو پہلے ہی تپا ہوا تھا اُس نے مزید جلتے ہوئے کہا۔

”تو ڈال لو اس میں کیا ہے اور زبردستی کس بات کی نور میری تھی اور ہمیشہ میری ہی رہے گی،“ اس

کے غصے کی پرواکیے بغیر زارون نے کندھے اچکاتے جواب دیا تو عالیان کو اُس کا اتنا پرسکون ہو کر جواب دینا زہر لگا۔

”یارو یہ سے ایک بات بتاؤ؟“ اب کی بار اُس نے زارون کے قریب صوف پر بیٹھتے سوال کیا۔

”ہاں ایک کیا دو پوچھ لو،“ نظریں ٹیکی وی کی اسکرین پر جمائے اُس نے لاپرواٹی سے اجازت دی۔

”کیا تمہیں اپنے عمل پر ذرہ برابر بھی افسوس نہیں ہے؟“ عالیان نے ریموت اُس کے ہاتھ سے جھپٹ کر ٹیکی وی بند کرتے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”کیوں؟ افسوس کس بات کا اپنی محبت کو حاصل کرنا کون سا گناہ ہے اور میں نے نکاح کیا ہے کوئی اُسے اٹھا نہیں لایا جو تم بار بار ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو،“ غصے سے ریموت اُس کے ہاتھ سے لیتے وہ دنیا جہاں کا غرور اپنی آنکھوں میں لیے بولا تو عالیان کو اُس کی سوچ اور رویہ پر افسوس کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آیا۔

”وہ قسم سے زارون اگر مجھے پتا ہوتا ناکہ تم اس لیے مجھے یونیورسٹی لے کر جا رہے ہو تو میں کبھی تمہارے ساتھ نہ جاتا۔ مجھے تو بار بار اُس لڑکی کا رونا اور فریاد کرنا یاد آرہا ہے۔ تم نے اچھا نہیں کیا اور ویسے تو تم بہت اصول پسند ہو بھی کسی غیر قانونی کام میں کسی کا ساتھ نہیں دیتے تو اب اپنی دفعہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ تم اُس کے گھر رشتہ بھی تو بھیج سکتے تھے نا؟“ (عالیان جسے زارون نے ایم جنسی میں یونیورسٹی پہنچنے کا کہا تھا اُسے بالکل بھی خبر نہیں تھی کہ زارون کوئی ایسا کام کرنے جا رہا ہے) اُس نے اپنے ذہن میں آتے کئی سوالوں میں سے ایک سوال پوچھا جو ضروری تھا۔

”ہاں پر مجھے پتا تھا اُس کے گھروالے کبھی نہیں مانیں گے اور گھروالے دور کی بات نور خود بھی کبھی نہیں مانتی کیوں کہ وہ اپنے باپ اور بھائیوں کے لیے اپنی محبت کیا اپنی جان تک قربان کر سکتی ہے اور

پچھلے دس سال سے میں محبت کرتا ہوں اُس سے بلکہ محبت کیا عشق ہے مجھے اُس سے وہ بھی جنون کی حد تک اور تم تو جانتے ہو میں تو اپنی چیزوں کے معاملے میں کبھی کوئی لچک نہیں رکھتا اور وہ تو پھر میری محبت ہے۔ اذیت دے رہا تھا مجھے بار بار اُس کا نام کسی اور کے نام کے ساتھ سننا، یہ سب بتاتے غصے کے مارے اُس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں تو عالیان نے اپنے جان سے پیارے دوست کی یہ حالت دیکھ کر خاموشی اختیار کی کیوں کہ اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

”اچھا بس تم اب پریشان نہ ہو اور بتاؤ آگے کیا کرنا ہے؟“ شام والی بات پر مٹی ڈالتے اُس نے زاروں سے آگے کا پروگرام پوچھا۔

”کچھ نہیں بس اب مجھے جلد از جلد نور کو اپنے پاس اپنے گھر میں لے کر آنا ہے اور کیسے یہ میں تمہیں کچھ دن میں بتا دوں گا،“ صوفی کی بیک سے ٹیک لگاتے اُس نے کہا تو عالیان نے اثبات میں سر ہلا�ا اور مزید کچھ کہے بغیر کچن میں چائے بنانے چلا گیا۔

زاروں علی جس کا تعلق ایک جا گیر دار گھرانے سے تھا۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ بچپن سے ہی بڑی مغرور طبیعت کا مالک تھا۔ جو چیز پسند آ جاتی وہ اُسے ہر حال میں چاہیے ہوتی اور احتشام صاحب نے بھی آج تک اُسے کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی اُس کی زبان سے نکلی ہر خواہش کو پلک جھیکتے پورا کر دیا جاتا۔ نور کو اُس نے پہلی بار عالیان کے کالج میں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ تقریباً بارہ سال کے قریب تھی اور شاید وہ کسی کے ساتھ آئی تھی اور اب اُس کے نہ ملنے کی وجہ سے مسلسل رورہی تھی۔

زاروں جس کی عمر اٹھا رہ سال تھی (عالیان جو اُس کا دوست تھا مگر چونکہ زاروں کو یہ کالج پسند نہیں تھا۔ اس لیے احتشام صاحب نے اُس کا ایڈیمیشن دوسرے کالج میں کروادیا مگر گھر ساتھ ساتھ ہونے کی وجہ سے اُن میں ابھی بھی کافی دوستی تھی اور آج عالیان کی گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے اُس نے زاروں کو کال کرتے پک کرنے کا کہا) اُس کا دل بس نور کی معصومیت اور گلابی نرم گالوں پر اٹک سا گیا تھا۔ اُس

نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آگے قدم بڑھائے مگر اُس سے پہلے ہی ایک لڑکا اُس کے قریب آیا (جو شکل سے اُس کا بھائی لگ رہا تھا) اور اُسے چپ کرواتے اپنے ساتھ لے گیا پر زارون کا دل جیسے کسی نے اپنی مٹھی میں قید کر لیا ہو۔ اُس نے جلدی سے باہر کی طرف قدم بڑھائے پر اُس سے پہلے ہی حارت نور کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر لے جا چکا تھا۔ اگلے دن زارون نے عالیان کے کالج میں آتے ہی اُس لڑکے کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی (جس کا نام تک بھی وہ نہیں جانتا تھا) مگر ایک ہفتہ بعد تک اُس کی ہر کوشش بے کارگئی۔

اُس نے کافی لڑکوں سے جاننے کی بھی کوشش کی مگر کسی کو بھی اُس کے بارے میں نہیں پتا تھا تب ہی وہ مايوس ہوئے بغیر اُسے ایک مہینے تک تلاش کرتا رہا مگر اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ اُس دن کے بعد کالج ہی چھوڑ گیا یا پھر وہ کالج کا اسٹوڈنٹ تھا، ہی نہیں پر زارون نے تب بھی امید نہیں چھوڑی اور عالیان کے ساتھ مل کر کالج میں کافی لوگوں سے اُس کے بارے میں پوچھا پر مسئلہ یہ تھا کہ اُسے اُس لڑکے کا نام معلوم نہیں تھا اور نہ ہی یہ پتا تھا کہ وہ کون سی کلاس میں ہے۔ دو مہینے بعد بھی کوئی سراہاتھ میں نہ آتے دیکھ کر وہ کچھ مايوس ہوا اور ویسے بھی اُسے اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے لیے کچھ ہی دنوں میں مانچسٹر جانا تھا۔ اسی لیے وہ وقتی طور پر یہ سب بھلائے اپنی تیاری میں لگ گیا مگر آج اتنے سال بعد بھی وہ اُس چہرے کو بھلانہیں سکا تھا اور ابھی کچھ سال پہلے جب وہ پاکستان والپس آیا تو اُس نے عالیان کے ساتھ مارکیٹ میں اُسے دیکھا (جس نے پچھلے چھ سالوں میں ایک سینئنڈ بھی اُسے سکون لینے نہیں دیا) جواب بھی اُسی دن کی طرح اپنے کھوجانے پر رورہی تھی اور بڑی ہونے کے باوجود بھی بچپن والی معصومیت ابھی بھی اُس کے چہرے پر باقی تھی۔

زارون نے عالیان کو پیچھے چھوڑتے جلدی سے قدم اُس کی جانب بڑھائے کیوں کہ اب وہ اس

موقع کو اپنے ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا پر اس سے پہلے ہی ایک لڑکی اور ایک عورت اُس کے قریب آئیں اور وہ ان کی طرف بڑھتے ہی عورت کے گلے لگتے پھر سے رونے لگی۔

”نور کیا ہو گیا ہے کیا بچوں والی حرکت ہے یہ، ہم دونوں یہیں پر ہی تھے“، عورت نے اُسے لوگوں کی وجہ سے خود سے الگ کرتے سمجھایا تو اُس کا نام زارون کے کانوں میں پڑا۔

”زارون کیا ہوا ہے یہاں کیوں کھڑے ہو؟“ عالیان جوزارون کے ساتھ ہی ماخستر میں اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے لیے گیا تھا اور اتنے سال ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کی دوستی مزید گہری اور پختہ ہو چکی تھی۔

”کچھ نہیں بس وہ نور۔۔۔“، زارون نے پچھے مڑتے ہوئے اُسے جواب دیا اور دوبارہ پلت کر دیکھا تو وہ وہاں موجود نہیں تھی۔

”کون نور؟“ عالیان نے زارون کے منہ سے زندگی میں پہلے بار ایک لڑکی کا نام سنتے ہی حیرت سے پوچھا۔

”کہاں گئی، اُف تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے وہ آج پھر سے گم ہو گئی ہے“، زارون کو عالیان پر تپ چڑھی تو اُسے زارون کی بے چینی دیکھتے سمجھا آئی کہ وہ یہ کانج والی ہی لڑکی تھی جس نے اتنے سالوں سے زارون کے دل و دماغ پر قبضہ کیا ہوا تھا۔

”مطلوب میری ہونے والی بھا بھی آخر تھیں مل ہی گئی پر تم نے اتنے سالوں بعد بھی اُسے کیسے پہچان لیا؟“، زارون کو ایک طرف بڑھتا دیکھ کر عالیان نے تجسس سے پوچھا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم۔ وہ بڑی ضرور ہوئی ہے پر بدی نہیں، اب زیادہ بولومت اور ڈھونڈو اُسے“، رک کر عالیان کی بات کا جواب دیتے اُس نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا تو عالیان بھی خاموشی سے زارون کے پچھے چلتے ایک بار پھر سے نور کو تلاش کرنے لگا۔

☆☆☆

”کہاں تھے تم؟“، حارث جو کب سے حاشر کو کال کر رہا تھا مگر وہ رسیو کرنے کے بجائے بار بار کاٹ رہا تھا اور اب آدھے گھنٹے بعد وہ انگلی میں چابی گھماتے گھر کے اندر داخل ہوا۔

”میں نے بتایا تو تھا کہ بائیک خراب ہو گئی ہے میری“، حاشر نے حارث کی بات سنتے ہی لاپرواں سے بتایا۔

”بائیک خراب تھی یا نئی بنوار ہے تھے جو اتنا ٹائم لگا اور جب میں نے تم سے تم سے کہا تھا کہ نور العین کو وقت پر یونیورسٹی سے پک کر لینا تو کیوں نہیں کیا؟ تمہیں پتا ہے آج تمہاری وجہ سے اُس کی کتنی طبیعت خراب ہوئی ہے بے ہوش ہو گئی تھی وہ پریشانی سے“، حارث نے سختی سے مگر اپنی آواز آہستہ رکھتے ہوئے حاشر کو اُس کی غلطی کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

”بے ہوش کیسے ہو گئی کیا ہوا تھا؟ ایک تو اس کی پریشانیاں اور ڈر، توبہ ہے انسان خود کچھ ہمت کر لیتا ہے اور میں اس کے موبائل پر کال کر رہا تھا پر وہ بند تھا تب ہی میں نے تمہارے نمبر پر کال کر کے بتایا“، حاشر نے شرمندہ ہونے کے بجائے احسان جتنے والے انداز میں کہا تو حارث کو مزید غصہ آیا جو وہ فریکھ بیگم اور سارہ کو آتا دیکھ کر ضبط کر گیا۔

”یہ تم دونوں کیا کچھ ہری پکار ہے تھے اور میرے آتے ہی چپ کیوں ہو گئے؟“ فریکھ بیگم نے اُن دونوں کو مشکلوں کیا کچھ ہری پکار ہے تھے پوچھا تو حارث نے حاشر کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

”وہ پھو پھو ہم سوچ رہے تھے کیوں نا آپ کو اب تمام کاموں سے آزادی دے دی جائے، میرا مطلب ہے آپ ایسا کریں حارث اور نور العین کے ساتھ ساتھ میرے بھی ہاتھ پیلے کر دیں ایک ساتھ دو دو بہوئیں آئیں گی تو سوچیں آپ کو کتنا فائدہ ہو گا، ویسے بھی اس سارہ کو تو کچھ آتا نہیں ہو سکتا ہے میرے والی ہی کام کی نکل آئے“، حاشر نے اُن کا دھیان بٹانے کے لیے بات کا رخ بدلا تو سارہ نے اپنی

تعریف پر اُسے گھوڑتے ہوئے کمرے کا رخ کیا اور فریجہ بیگم حاشر کی بات پر اُسے ایک چپت رسید کرتے سارہ کی خوبیاں گنو ان لگیں۔



اگلا ایک ہفتہ نور فریجہ بیگم کے کہنے پر یونیورسٹی نہیں گئی اور آج حارت کی ڈانٹ پر وہ یونی آئی تو اُس کی نظریں بس سب کی آنکھوں پہنچیں۔ وہ ہر چہرے میں اُس شخص کا چہرہ تلاش کر رہی تھی جس نے اُسے ایک ہفتے سے پریشان کیا ہوا تھا۔ ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی اُسے گھبراہٹ ہونے لگی کہ کوئی اُسے پہچان نہ لے یا اُس دن کے واقعہ کا ذکر کرتے اُس سے کوئی سوال نہ پوچھ لے اسی لیے وہ سر جھکائے جلدی سے اپنی کلاس کی جانب بڑھی پر اُس سے پہلے ہی میم فاطمہ نے اُسے آواز دی جس پر اُس کے قدموں کے ساتھ ساتھ دل بھی تھم سا گیا اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ضرور اُس دن کے متعلق اُس سے کچھ پوچھیں گی۔

”جی میم“، اُس نے حوصلہ کرتے رخ موڑا۔

”نور آپ کا فارم ابھی تک جمع نہیں ہوا اور آج لاست ڈیٹ ہے اس لیے آج ہر حال میں مجھے سب سمت کرو کے جائیے گا“، اپنی بات کہتے وہ آگے بڑھ گئیں تو نور نے اپنی رکی ہوئی سانس بحال کی۔

”اللہ پلیز میری مدد کریں، مجھے اس مصیبت سے نکال دیں“، دل میں دعا کرتے اُس نے کلاس میں قدم رکھا اور اُس دن کا تمام منظر ایک بار پھر سے اُس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اپنی چیز سنبھالتے اُس نے اپنی آنکھوں کو بھی آنسو بہانے سے روکا اور موبائل نکالتے بلاوجہ ہی اُس میں چیزیں دیکھنے لگی تب ہی ایک لڑکی جو اُس کے قریب بیٹھی تھی اُس نے اُسے مخاطب کیا۔

”جی“، نور نے سراٹھاتے اُسے دیکھا۔

”آپ کی کوئی فرینڈ نہیں ہے کیا؟“، اُس نے سوال پوچھتے نور کی نظروں میں سوال دیکھ کر ساتھ

وضاحت بھی دی۔

”وہ اصل میں جب بھی میں آپ کو دیکھتی ہوں آپ اکیلی ہی بیٹھی ہوتی ہیں اس لیے پوچھ رہی ہوں“، خدیجہ نے نرمی سے سوال کیا تو نور نے نفی میں سر ہلاایا۔

”نہیں ابھی تک تو کوئی دوست نہیں“، موبائل بیگ میں رکھتے اُس نے جواب دیتے اُس لڑکی کا جائزہ بھی لیا جس کی لیٹی شرط، جیز کے ساتھ کھلے بال اور میک اپ سے اٹا چہرہ نور کو کچھ خاص پسند نہیں آیا۔

”تو ٹھیک ہے میری بھی کوئی فرینڈ نہیں، پلیز آپ میری دوست بن جائیں ویسے بھی مجھے آپ کا یہ حباب اور معصوم سا چہرہ بہت پسند ہے“، اُس لڑکی نے کہنے کے ساتھ ہی نور کا ہاتھ پکڑا تو اُس کے انداز پر وہ ایک دم سے بوکھلا گئی۔

”جی جی ضرور“، زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجائتے نور نے اثبات میں سر ہلایا تو خدیجہ نے آنکھوں میں چمک لیے اُس کا ہاتھ چھوڑا۔

”بس آج سے ہم دونوں بیسٹ فرینڈ ہیں“، نور کا جواب سنتے ہی خدیجہ نے خوشدی سے کہا تو اُس کے حلیہ کے بر عکس نور کو وہ اچھی لگی تب ہی وہ اُس کی باتوں کا جواب دیتے خود بھی اُس کے متعلق پوچھنے لگی۔ ایک ہی دن میں وہ ایک دوسرے کے بارے میں کافی حد تک جان چکی تھیں اور اس میں بڑا ہاتھ خدیجہ کا تھا (جو تھی تو نور سے کچھ سال بڑی پر اپنے بات کرنے کے انداز اور سوچ سمجھ کی وجہ سے اُس نے بہت جلد نور کو اپنے آپ سے مانوس کر لیا تھا)۔

سارا دن خدیجہ کے ساتھ رہنے اور اُس کی باتوں کی وجہ سے نور کچھ وقت کے لیے اُس کا لی آنکھوں والے کا خیال اپنے ذہن سے نکال چکی تھی۔ واپسی پر اُس نے حارث کو بھی اپنی دوست کے متعلق بتایا تو وہ بھی خوش تھا کہ نور کے ساتھ یونی میں کسی کا ساتھ بن گیا پر نور کی بار بار خدیجہ نام کی گردان

پروہاب تنگ آنے کے ساتھ ساتھ کچھ پریشان بھی ہوا۔

”اچھا نور بس کرو اب اور ایک ہی دن میں کسی پر اتنا اعتبار نہیں کرتے کچھ وقت لیتے ہیں کسی کو جانے میں تاکہ یہ پتا چل سکے کہ وہ شخص اعتبار کے قابل ہے بھی یا نہیں“، حارت نے ہمیشہ کی طرح اُسے سمجھایا تو نور کی زبان کو بریک لگی۔

”دنہیں بھائی سچ میں وہ بہت اچھی ہے، تھوڑی مادرن ہے پر عادت اور اخلاق کی بہت اچھی ہے“، نور نے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”تم خود معصوم ہو اس لیے تم جس سے بھی ملتی ہو تمہیں وہ شخص بھی اپنے جیسا معصوم اور اچھا ہی لگتا ہے لیکن نور کسی پہ اتنی جلدی اعتبار نہ کیا کرو پہلے کچھ دیر اُسے جانچا کرو اس کی عادتوں، باتوں اور طریقہ کار پر غور کیا کرو، دنیا میں بہت سے لوگ اپنے چہروں پر اچھائی کا نقاب چڑھائے تم جیسوں کو بے وقوف بنادیتے ہیں“، آخری بات پر اُس نے ہلکی سی چپت نور کے سر پر رسید کی جواب کسی سوچ میں گم تھی۔

”سمجھ آئی کچھ یا اگلی بھی گئی؟“، گاڑی مارکیٹ کے باہر روکتے اُس نے پوچھا تو نور نے بولنے کے بجائے اثبات میں سر ہلا کیا۔

”ٹھیک ہے میں اب صبح اُس لڑکی سے بات نہیں کروں گی“، چہرے پر فکر لیے اُس نے جتنی عقل مندی سے کہا حارت کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

”نور کب بڑی ہو گی تم؟ حد ہے میں نے یہ نہیں کہا کہ اُسے چھوڑ دو بس یہ کہا ہے کہ سوچ سمجھ کر اعتبار کیا کرو اور یہ جو دماغ اللہ نے دیا ہے نا سے کبھی استعمال بھی کر لیا کرو“، اب کی بارصاف الفاظ میں کہتے وہ گاڑی سے اُتر اور اُسے بھی اُترنے کا کہا۔

فریجہ بیگم کے کہنے پر وہ نور کو مارکیٹ لے آیا تھا جہاں انہوں نے اُس کی اور سارہ کی شادی کی کچھ

شاپنگ کی اور شام گئے جب وہ گھر لوٹیں تو سکندر صاحب اور حاشری وی دیکھنے میں مصروف تھے۔ سارہ نے آتے ہی اپنی تمام شاپنگ سکندر صاحب کو دکھانی شروع کی (جسے وہ بہت شوق اور پیار سے دیکھ رہے تھے) نور خاموشی سے اپنی چیزیں اٹھا کر کمرے میں آگئی۔ اُس دن کے بعد سکندر صاحب اب اُسے کسی بات پر نہیں ڈالنٹے تھے اور فریجہ بیگم بھی شاید اُس کی شادی کی وجہ سے اُسے کاموں کا نہیں کہتیں یا پھر سارہ میں وہ اتنی مصروف تھیں کہ انہیں اب نور کی کوئی غلطی نظر نہیں آتی جسے بہانہ بنا کر وہ سکندر صاحب کو بھڑکا سکیں۔



کمرے میں آتے ہی ایک دم اُس کا دل بھرا یا تھا، اُسے آج عالیہ بیگم کی کمی شدت سے محسوس ہوئی (جنہیں بس اُس نے تصویروں میں دیکھا اور حارت اور حاشر سے سنا ہی تھا)۔

امی کا شاپ زندہ ہوتیں تو میں آپ کو بتاسکتی کہ میں کتنی تکلیف میں ہوں، دراز سے عالیہ بیگم کی تصویر زکال کردیکھتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تب ہی اُس کے موبائل کی اسکرین بلنک ہوئی اور ساتھ ہی آر جے کے میسجر آنے لگے جو اپنی آفس کی کسی مصروفیت کی وجہ سے سارا دن اُس سے بات نہیں کر پایا تھا۔

”کہاں ہو یا رہی کیسی ہو؟ کیا کر رہی ہو؟ کھانا کھایا؟ دن کیسا گزر؟ مجھے مس تو نہیں کیا ہو گا؟“ جیسے کئی میسجر اُس نے سینڈ کیے ہوئے تھے نور نے موبائل اٹھاتے میسچ کا جواب دینے کے بجائے اُس کے نمبر پر کال کی جس پر زین کو نا صرف حیرت ہوئی بلکہ اُس نے کال ریسیو کرنے کے بجائے بے یقینی سے اسکرین کو دیکھا کیوں کہ ان چار سالوں میں پہلی بار نور نے اُسے کال کی تھی۔

”کیا ہوا؟ کال کیوں کر رہی ہو؟“ اُسے لگا شاید کوئی اور کال کر رہا ہے اس لیے اُس نے کنفرم کرنا ضروری سمجھا۔

”مجھے بات کرنی ہے“، نور جو آج خود کو بہت بے بس اور اکیلا محسوس کر رہی تھی پتا نہیں اُس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ اتنے سال بعد اُس نے خود سے زین سے یہ بات کی۔

”اوکے میں کرتا ہوں“، مسیح پڑھتے زین نے اُس کا نمبر ڈائل کیا اور موبائل کان سے لگائے دوسری طرف فون اٹھانے کا انتظار کرنے لگا۔

”نور کیا ہوا؟“ کال رسیو ہوتے ہی اُس نے رونے کی آواز سنی تو وہ ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”کیا ہوا ہے یار؟ روکیوں رہی ہو؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟“ زین نے پھر سے سوال کیا تو نور نے اپنے آنکھیں صاف کرتے دروازہ لاک کیا اور بالکوں میں آگئی۔

”کیا ہوا ہے؟ روکیوں رہی ہو؟ طبیعت ٹھیک ہے؟“ بے چینی سے اپنا سوال دوہرائے وہ دوسری طرف اُس کے بولنے کا منتظر تھا۔

”آر جے“، نور نے اُس کا نام لیا اور ساتھ ہی پھر سے رونے لگی۔

”کیا ہوا ہے بول نور، دیکھو تم مجھے اب پریشان کر رہی ہو، مجھے بتاؤ کسی نے کچھ کہا ہے؟“ زین نے اُس کی آواز سنتے ہی (جو اُس کی سوچ سے بھی زیادہ نرم تھی) فکر مندی سے پوچھا۔

”کچھ۔۔۔ نہ۔۔۔ یہ کہا۔۔۔“ نور نے خود پہ ضبط کرنے کے باوجود بھی ٹوٹے الفاظ میں جواب دیا۔

”اچھا رونا بند کرو تمہیں پتا ہے نا مجھے تمہارا رونا پریشان کر دیتا ہے تکلیف دیتا ہے مجھے، پلیز چپ کرو اور بتاؤ کیا ہوا ہے؟“ زین نے اُسے بہلانے کی کوشش کرتے بولنے کے لیے اکسا یا (وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ لڑکی کب اس کے لیے اتنی خاص ہو گئی کہ اُس کی چھوٹی سی تکلیف پر بھی اُس کا دل تڑپ اٹھتا تھا)۔

”آر جے وہ۔۔۔“ نور نے اُسے کچھ بتانا چاہا مگر اُس سے پہلے ہی ایک دم سے گھر کی لائٹ چلی

گئی۔ نور نے چاروں طرف گھروں میں جلتی لائٹس کو دیکھتے ایک نظر اپنے گھر کو دیکھا تو اُسے سمجھ آئی کہ بس اُن کے گھر کی لائٹ بند ہوئی ہے۔ اندھیرے سے گھبرا تے اُس نے زین کو جواب دینے کے بجائے کال کاٹی اور موبائل کی لائٹ آن کرتے بالکونی سے کمرے میں آئی تاکہ باہر جاسکے مگر اُس سے پہلے ہی کسی نے پیچھے سے آتے اُسے اپنے حصار میں قید کیا اور اُس کے چیخنے سے پہلے ہی اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھتے اُس کی آواز کو باہر جانے سے روکا۔

”کس سے بات کر رہی تھیں؟“ اُس کے بال ہٹا کر اُس کے کان کے قریب ہوتے اُس شخص نے سرگوشی کی تو نور کی آنکھیں پوری کھل گئیں اور موبائل اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے قالین پر گرا۔

”میں نے پوچھا کس سے بات کر رہی تھیں؟“ اُس کا رخ اپنی طرف موڑتے زارون کے لمحے میں پہلے سے زیادہ سخت تھی۔

”کیا وہ؟ کون تھا جس سے بات کر رہی تھیں؟ اور جب میں ایک بار کہہ چکا ہوں کہ تم صرف میری ہوتے سمجھ میں نہیں آتا کیا؟“ اُس کی کمر پر دباو ڈالتے خود سے مزید قریب کرتے وہ جتنے غصے سے بولانور کو اپنی سانس بند ہوتی محسوس ہوئی۔

وہ میں لے

”کیا میں؟ کسی غیر محرم سے تو بڑی باتیں کر لیتی ہو اور بڑا رورہی تھیں اُس کے سامنے اور محرم کو

دیکھتے ہی بولتی بند ہو گئی واہ، کیا بات ہے نور العین آپ کی، تم سخرا نہ انداز میں کہتے، وہ اب اُس کو دیوار کے ساتھ لگا چکا تھا۔

”پلیز---“ نور نے اُسے خود سے قریب ہوتا دیکھ کر اپنے دو پٹے کو دونوں ہاتھوں میں دبوچے آنکھیں بند کیں تو زارون نے اُس کے چہرے پر آتی بالوں کی لٹوں کو پیچھے کیا۔

”جان ہوتم میری اور جو انسان میرا ہو وہ بس میرا ہی ہوتا ہے میں کسی بھی طور شرائحت برداشت نہیں کرتا اس لیے آئندہ خیال رکھنا اور اپنے یہ آنسو صرف تم میرے لیے بہایا کرو، کیوں کہ یہ تمہیں مزید خوبصورت بنادیتے ہیں؟“ ہاتھ کے پوروں سے اُس کے رخسار پر بہتے آنسو صاف کرتے اب اُس کے انداز میں نرمی آچکی تھی۔ اُس نے آنسو صاف کرتے اُس کے سرخ رخساروں کو چھوا تو نور کو اُس سے خوف اور وحشت محسوس ہوئی۔

”پلیز---“ اُسے اپنی اوپر جھکتا دیکھ کر نور نے مرا جھٹ کی مگر زارون نے اُس کی کوئی بھی بات سنے بغیر ایک بار پھر سے اپنے لمس سے واقف کروا یا جس پر نور نے اُس کے سینے پر ہاتھ رکھتے اُسے پیچھے کرنے کی کوشش کی مگر وہ کسی چٹان کی مانند کھڑا اُس کے نازک ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی پیش رفت کرتا دروازے پر ہونے والی تیز دستک نے نور کے ساتھ ساتھ اُسے بھی ہوش کی دنیا میں لاتے الگ ہونے پر مجبور کیا۔

”لو یو بے بی، بہت جلد میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا بس دوبارہ کسی اور سے بات کرنے کی غلطی مت کرنا“، اپنارومال ٹھیک کرتے وہ حارت کی آواز پر جلدی سے اپنی بات مکمل کر کے بالکونی کی طرف بڑھا تو نور نے حارت کی آواز اور تیز ہوتی دستک پر جلدی سے دروازے کی طرف قدم بڑھانے اور وہاں حارت کو ہاتھ میں ٹارچ پکڑے کھڑا دیکھ کر جلدی سے اُس کے ساتھ لگتے رونے لگی، جو اسے جزیر خراب ہونے کا بتاتا لائٹ جلد آجائے کی تسلی دیتے

نیچے لے آیا تھا

☆☆☆

”مل آئے اپنی بے بی ڈال سے؟“ اُسے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتا دیکھ کر عالیان نے اُس کے چہرے کی چمک دیکھ کے سوال کیا۔

”مل آیا“، رومال ایک سائیڈ پر چھینگتے اُس نے تھکے ہوئے انداز میں صوفے سے ٹیک لگاتے جواب دیا۔

”یارو یہ ستم یہ سب ٹھیک نہیں کر رہے اور کیوں بدگمان کر رہے ہو اسے خود سے؟“ عالیان نے ایک بار پھر سے نور کی سائیڈ لی تو زارون نے سیدھے ہو کر بیٹھتے اُسے گھورا۔

”تم میرے دوست ہواں لیے تمہارے منہ سے نور کا ذکر اور اُس کی سائیڈ لینا برداشت کر لیتا ہوں پر احتیاط کیا کرو کیوں کہ تمہیں پتا ہے نامیری برداشت اپنی چیزوں کے معاملے میں بہت کم ہے،“ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے اُس نے بڑی نرمی سے عالیان کو دھمکی دی جو موبائل پر مصروف ساتھ اُس کی بات بھی سن رہا تھا۔

”ہونہہ مجھے دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں اور ہاں وہ لڑکی کوئی چیز نہیں بلکہ انسان ہے اور ایک بار تو تم اُس سے زبردستی کر چکے ہو پر بار بار اُسے ایسے ڈرا کے تم اپنا ہی نقصان کر رہے ہو،“ عالیان جو پہلے ہی پریشان تھا اُس نے زارون کا ہاتھ ہٹاتے اسے وارن کیا۔

”کیا نقصان کر رہا ہوں؟“ زارون نے موبائل اُس کے ہاتھ سے لیتے (جس پر وہ بار بار کسی کو کال کر رہا تھا) سوال کیا۔

”یار موبائل دو مجھے اور کتنی بار کہا ہے ایسے میرے موبائل کو چیک مت کیا کرو“، عالیان نے اُس کے ہاتھ سے موبائل جھپٹتے بے زاری سے کہا تو زارون کو اُس کی بات پر حیرت کے ساتھ ساتھ غصہ بھی

آیا۔

”ٹھیک ہے میں دوبارہ ہاتھ نہیں لگاؤں گا تمہارے موبائل کو اور سوری مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ اب مجھ سے بھی زیادہ اہم ہو گئی ہے تمہارے لیے، سر جھکتے اُس نے اپنی بات مکمل کی اور عالیان کی کوئی بات سنے بغیر غصے سے انٹھ کراپنے کمرے میں چلا گیا۔

”اف ایک تو میں پہلے ہی پریشان ہوں اور اوپر سے اس نواب کا بھی منہ بن گیا ہے، عالیان نے ایک بار پھر سے نمبر ڈائل کرتے خود کلامی کی (جو بھی بھی بند تھا)۔

”پتا نہیں کہاں گم ہو گئی ہے۔ انسان بتاہی دیتا ہے پر نہیں میدم کو تو بس غائب ہونے کی جلدی ہوتی ہے، موبائل کی اسکرین کو دیکھتے اُس نے سوچا اور اپنی کار کی چابی اٹھاتے زارون کے کمرے کے بند دروازے کو ایک نظر دیکھتے اونچی آواز میں اُسے اپنے ریڈ یو اسٹیشن جانے کے بارے میں بتایا اور کچھ دیر جواب کا انتظار کرتے دوسری طرف خاموشی پا کر اسے واپس آ کر منانے کا سوچتے اپارٹمنٹ کی دوسری چابی لیتے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”کیا ہو گیا ہے نور؟ کیوں ایسے بچوں کی طرح ڈر رہی ہو، لائٹ ہی آف ہوئی ہے نا؟ آجائے گی کچھ دیر میں،“ حارت نے اُسے مسلسل رو تاد کیچھ کر ٹنگ آ کر ٹوکا۔

”اس کی توعادت ہی ہے اپنے ساتھ ساتھ سب کو پریشان کرنے کی،“ (سارہ جو پہلے ہی حارت کی اس عادت سے عاجز تھی کہ وہ اُس کے بجائے نور کو ہر بات اور کام میں فو قیت دیتا تھا) اُس نے حارت کی بات سنتے ہی جلدی سے کہا۔

”تو اچھا ہے نا بہنیں بھائیوں کو ہی پریشان کرتی ہیں نہ کہ تمہاری طرح اپنے ہونے والے شوہر کو، پر ایک بات ہے تم حارت کو ہی پریشان کرو گی نا کیوں کہ بھائی تو تمہارا ہے ہی نہیں،“ حاشر جو فیوز ٹھیک

کرتے اندر آ رہا تھا اُس نے سارہ کا طنز سنتے جواب دیا جس پر اُس کے ساتھ ساتھ فریجہ بیگم کو بھی آگ لگ چکی تھی۔

”حاشر ذرا سوچ سمجھ کر بولا کرو“، سارہ سے پہلے فریجہ بیگم نے اُسے باور کروا یا کہ وہ اپنی زبان کنٹرول میں رکھے۔

”پھوپھو یہ بات آپ سارہ کو بھی سمجھا سکتی ہیں نا کیوں وہ نور سے ہر وقت ایسے بات کرتی ہے؟“  
حاشر نے بھی فریجہ بیگم کے الفاظ میں رد و بدل کر کے جواب دیا تو سکندر صاحب کی گھر پر موجودگی کی وجہ سے حارت کو درمیان میں بولنا پڑا (کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ بات جو بھی ہو ختم نور پر ہی ہو گی)۔

”حاشر بد تمزیزی مت کرو“، حارت نے اُسے گھورا اور نور نے بھی ماحول گرم ہوتا دیکھ کر جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کیں جواندھیرے سے زیادہ اُس شخص کے خوف اور اپنی بے لبی پر آنسو بہار ہی تھیں۔  
”بولنے دو سے اور میری بیٹی تو ویسے بھی تم لوگوں کا کھاتی ہے تو با تین بھی سُن لے گی“، فریجہ بیگم نے جان بوجھ کر اوپنی آواز میں کہتے رونا شروع کیا تو سکندر صاحب جو آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں موجود تھے باہر ہونے والے شور پر لا وَنْخ میں آئے۔

”کیا ہوا فریجہ تم رو کیوں رہی ہو؟“ انہوں نے آتے ہی فریجہ بیگم کو آنسو بہاتا دیکھ کر سوال کیا تو حاشر کے ساتھ ساتھ نور اور حارت کو بھی سانپ سونگھ گیا۔

”ہونا کیا ہے، بس یہ دن دیکھنا باقی تھا“، ناک کو دو پٹے سے صاف کرتے وہ جتنی مہارت سے ڈرامہ کر رہی تھیں حارت کو ان کے ساتھ ساتھ حاشر پر بھی غصہ آیا جواب خاموشی سے سر جھکائے کھڑا تھا۔

”ہوا کیا ہے؟“ سکندر صاحب نے ایک نظر سب کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ہونا کیا ہے، بس مجھے یہ بتا دیں کہ اتنے سال میں نے آپ کی اور آپ کے بچوں کی خدمت اس

لیے کی تھی کہ آج یہ لوگ اٹھ کر مجھے اور میری بیٹی کو آپ کے در پر بیٹھنے کے طعنے ماریں، فریجہ بیگم نے باقاعدہ آنسوؤں کے ساتھ انہیں دوچار باتیں خود سے اخذ کر کے بتائیں۔

”کس نے طعنہ مارا تھا ہیں اور کس میں اتنی ہمت ہے کہ وہ سارہ کو کچھ کہئے،“ سکندر صاحب کی گرج پر جہاں نور سہم کر حارث کو دیکھنے لگی وہیں حاشر کو بھی آج اپنی خیریت محسوس نہ ہوئی۔

”کسی نے کچھ نہیں کہا بس آپ چھوڑیں،“ فریجہ بیگم نے بات بدلنے کی کوشش کی تاکہ سکندر صاحب مزید اصرار کرتے اُن سے پوچھیں۔

”سارہ تم بتاؤ کیا ہوا ہے؟“ فریجہ بیگم کو چپ رہنے کا اشارہ کرتے سکندر صاحب نے سارہ سے سوال کیا جس نے بغیر دیر کیے حاشر کی بات اُن کے کانوں میں ڈالی۔

”اپنا بھی بتاؤ نا تم نے پہلے نور کو کیا کہا تھا،“ سارہ کو بولتا دیکھ کر حاشر نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی پر اُس سے پہلے ہی سکندر صاحب کا ہاتھ اٹھا اور حاشر کے گال پر پڑتے نشان چھوڑ گیا۔

”ابو،“ حارث نے آگے بڑھتے مداخلت کی۔

”دوبارہ میری بہن کو یا بھانجی کو ایسی بات کہی تو منہ توڑ دوں گا میں تمہارا اور یہ گھر جتنا تم لوگوں کا ہے اتنا ہی سارہ کا بھی ہے اس لیے دوبارہ جو بھی بولنا سوچ سمجھ کر بولنا،“ انگلی اٹھاتے اُنہوں نے حاشر کو وارن کیا جو اپنی تذلیل پر گال پر ہاتھ رکھے خاموش کھڑا بے یقینی سے سکندر صاحب کو دیکھ رہا تھا جنہوں نے آج تک اُسے اُف تک نہیں کہا تھا۔

”بھائی صاحب بس کریں، کچھ نہیں بچہ ہے منہ سے نکل گیا اور سارہ تمہیں کیا ضرورت تھی بتانے کی،“ سب کچھ کروانے کے بعد فریجہ بیگم نے آگے بڑھتے سکندر صاحب کو روکا تو حاشر نے ایک افسوس بھری نظر ان پر ڈالی اور لمبے ڈگ بھرتے گھر سے باہر نکل گیا۔

”حاشر کو،“ حارث نے اُسے آواز دیتے اس کے پیچھے ہی قدم بڑھائے تو نور نے سکندر صاحب

کی طرف دیکھا جواب فریجہ بیگم اور سارہ کو اپنے ساتھ لگائے حوصلہ دے رہے تھے۔

☆☆☆

”السلام علیکم، امید ہے کہ آپ سب ٹھیک ہوں گے پر آج میرا موڈ ٹھوڑا خراب ہے“، عالیان نے شو شروع کرتے اپنے چاہنے والوں کو مخاطب کیا۔

”آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میرا موڈ کیوں خراب ہے؟“ رات دس بجے کے قریب اُس کی آواز کئی سماعتوں کے ساتھ زارون کے کانوں میں بھی گونج رہی تھی۔

”تو اس کی وجہ میرا بد تمیز دوست ہے جو آج مجھ سے خفا ہے“، سانگ کے ساتھ ساتھ اُس نے اپنے خراب موڈ کی وجہ بتائی تو زارون کے چہرے پر غصے کے باوجود بھی مسکراہٹ آگئی۔

”میں ناراض ہی رہوں گا اور تمہاری اُس سہیلی کی تو میں ایسی خبر لوں گا جس نے کچھ ہی سالوں میں تمہیں مجھ سے دور کر دیا ہے“، اُس کی بات سنتے ہی زارون نے دل ہی دل میں ارادہ کیا اور ایف ایم آف کرتے اٹھ کر بالکونی میں آ کر نور کے بارے میں سوچنے لگا جس کے لمس کی خوبیوںہا بھی تک اپنے آپ سے آتی محسوس کر رہا تھا۔

بے بی ڈال، آنکھیں بند کرتے اُس نے نور کا چہرہ اپنے سامنے آتے ہی مسکراتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ ”جان ہوتم میری نور، زارون سانس لینا تو بھول سکتا ہے مگر تم سے الگ ہونا تمہیں کسی اور کا ہوتے دیکھنا یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے پتا ہے میں نے جو کچھ کیا وہ غلط تھا پر پلیز تم مجھ سے کبھی بھی آرہی تھی۔“

☆☆☆

سکندر صاحب فریجہ بیگم اور سارہ کو لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے تو نور نے بھی کچھ دیر حاشر اور

حارت کا انتظار کرنے کے بعد اپنے کمرے کا رخ کیا جہاں داخل ہوتے ہی کچھ دیر پہلے ہونے والا واقعہ اُس کے دماغ میں گردش کرنے لگا۔ اُس نے جلدی سے آگے بڑھتے ٹیرس کا دروازہ بند کرتے پر دے آگے کیے اور پھر سارے کمرے کا جائزہ لیتے سکون کا سانس لیا کہ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ ”اللہ پلیز میری مدد کر، پہلے میری زندگی میں کم مصیبتوں تھیں جواب یہ شخص بھی میری زندگی بر باد کرنے کے لیے آگیا ہے، بے بُی سے سرگھٹنوں پر رکھتے اُس نے سوچا اور دل ہی دل میں اللہ سے آنے والے وقت کے لیے دعا میں مانگنے لگی جس کو سوچتے ہی اُس کی روح کانپ جاتی تھی۔

”میں حارت بھائی کو سب بتاؤں گی“، نور نے اپنی شادی میں ایک ہفتہ باقی رہنے کا سوچتے ہی دل میں ارادہ کیا کیوں کہ وہ نکاح پر نکاح نہیں کر سکتی تھی۔

”نہیں میں نہیں بتاؤں گی ایک حارت بھائی ہی تو ہیں جو میرا خیال کرتے ہیں“، اپنی ہی سوچ کو رد کرتے اُس نے ایک بار پھر سے بالکونی کی طرف دیکھا جہاں سے وہ شخص اندر آیا تھا۔

”میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ جیسے تم نے میری زندگی بر باد کی ہے نا میں بھی تمہاری زندگی بر باد کر دوں گی“، نور نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے خود کلامی کی اور اپنے موبائل پر نظر پڑتے ہی اُس نے کچھ سوچتے ہی موبائل اٹھایا جہاں آر جے کی بہت سی کالز کے ساتھ میسجر بھی موجود تھے۔

”تمہیں چڑھے نا کہ میں کسی سے بات نہ کروں؟ کوئی مجھے نہ دیکھے؟ تو دیکھو اب میں تمہیں کیسی سزادیتی ہوں“، زارون کو مخاطب کرتے اُس نے اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو ایک بار پھر سے صاف کیا اور مسیح طائب کرتے آر جے کو سینڈ کرنے لگی۔



شوختم کرنے کے بعد وہ دو بجے کے قریب واپس اپارٹمنٹ میں آیا تو زارون کے کمرے کا دروازہ

ابھی بھی بند تھا۔

”اُفف تھک گیا آج تو“، عالیان نے شوز اتارے بغیر ہی صوفے پر گرنے والے انداز میں لیٹتے خود کلامی کی اور کچھ منٹ لیٹے رہنے کے بعد کچھ سوچتے ہوئے اٹھ کر زارون کے کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھا جو لاک نہ ہونے کی وجہ سے کھلتا چلا گیا۔

”تم سوئے نہیں ابھی تک؟“ اس کو لیپ ٹاپ پر مصروف دیکھ کر عالیان نے حیرت سے پوچھا کیوں کہ زارون کی عادت تھی کہ وہ گیارہ بجے تک ہر حال میں سو جاتا تھا۔

”نہیں، اور کسی کے کمرے میں آنے سے پہلے دستک دیتے ہیں نہ کہ منه اٹھا کر اندر چلے آتے ہیں“، بات کرتے ہوئے اس کی انگلیاں جو مسلسل کی بورڈ پر چل رہی تھیں کچھ سینکڑز کے لیے رکیں پر اس نے عالیان کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

”ہونہہ میں دستک دے کر آتا تو تم نے اندر سے ہی دفع کر دینا تھا مجھے اور کیا یہ ناراض محبوبہ کی طرح منه بچلائے بیٹھے ہو۔ اٹھو مجھے بھوک لگی ہے کھانا کھائیں“، عالیان نے اس کی ناراضی کی پرواکیے بغیر لیپ ٹاپ پر ہاتھ مارتے اُسے بند کیا۔

”مجھے بھوک نہیں اور تمہاری محبوبہ یقیناً مان گئی ہو گی جو تمہیں میری یاد آگئی“، زارون نے اس کی حرکت پر گھورتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر اندازہ لگایا۔

”ہاں، ناراض تو وہ کبھی مجھ سے ہو ہی نہیں سکتی، پر جب کچھ بتائے بغیر غائب ہو جاتی ہے نا تو بس میں پریشان ہو جاتا ہوں کہ پتا نہیں کیا ہوا؟“، عالیان نے اپنے دانتوں کی نمائش کرتے زارون کی بات کی تصدیق کی تو زارون نے اُسے کھاجانے والی نظروں سے دیکھا۔

”ہم اچھی بات ہے۔ ویسے مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی؟“، زارون نے لیپ ٹاپ گود سے نکال کر بیڈ پر رکھتے پر سوچ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”کس بات کی؟“ عالیان نے سنجیدگی سے اُس کے قریب بیٹھتے سوال کیا۔

”یہی کہ نہ تم نے اُسے دیکھا نہ اُس نے تمہیں، تو! پھر یہ پیار ہو کیسے گیا؟ اور کیا وہ لڑکی انہی ہے؟ جو تم جیسے بندر کو دل دے دیا؟“، زارون نے جتنی نرمی سے اُس کی عزت افزائی کی عالیان بس اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

”پہلی بات کہ پیار نہیں بس ہم دوست ہیں اور دوسری بات بے شک میں تم جیسا ہیر نہیں ہوں پر شکر ہے تم جیسا جلا بھی نہیں ہوں جو کسی لڑکی سے زبردستی نکاح کر لوں اور بعد میں بھی اُسے بدر و حوں کی طرح رات کو جا کر ڈراؤں کہ تم صرف میری ہونوڑ،“ عالیان نے موقع ملتے ہی بھر پور طریقے سے زارون کی ٹانگ کھینچی تو اُس نے پاس پڑا کشن اٹھا کر اُسے رسید کیا جو اُس نے لگنے سے پہلے ہی کچ کیا۔

”ابھی اتنے بھی تم طاقتو نہیں ہوئے کہ عالیان قیوم کو مار سکو،“ مسکراتے ہوئے اُس نے مغروناہ اندر میں کہتے واپس کشن زارون کی طرف اچھالا جسے سیکنڈ میں کچ کرتے زارون نے عالیان کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر واپس پھینکا جو سیدھا اُس کے منہ پر جا کر لگا۔

”زارون شرم کرو ایک معصوم انسان کو مارتے تمہارے ہاتھ نہیں کا نپتے“، عالیان نے مزید کوئی پیش رفت کرنے سے خود کو روکتے کشن واپس بیڈ پر رکھا۔

نہیں کا نپتے جیسے معصوم انسان کا دل نہیں کا نپتا میرے سامنے میری ہی بیوی کا نام اتنی دلیری سے لیتے ہوئے، اپنے الفاظ کے ساتھ ساتھ اُس کی آنکھوں میں بھی اب سنجیدگی تھی۔

”اچھا بھی مجنوں معاف کر دو مجھے، میں دوبارہ نور بھا بھی کو بہن کہہ کر بُلا لوں گا تاکہ تمہارے اندر جو سڑا ہوا دل ہے نا وہ مطمئن رہے،“ اُس کی بات سنتے ہی عالیان نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تو زارون کے چہرے پر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ آگئی۔ (کیوں کہ اُس کی زندگی میں دی جان کے علاوہ وہی ایک شخص تھا جس سے وہ اپنے دل کی ہر بات کہہ دیتا تھا باقی اکلوتے ہونے کے

ساتھ ساتھ احتشام صاحب کی دوسری شادی اور کچھ دیر پہلے ہونے والے اپنے ماں کے انتقال نے اُسے اپنے باپ کے ساتھ ساتھ ہر انسان اور چیز سے بدگمان کر دیا تھا)۔



”امی آپ لوگوں کو کیا جلدی ہے میری شادی کی؟ جب میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے آپ کی معصوم، خوبصورت بھائی پسند نہیں تو کیوں آپ اور ابو میرے ساتھ مل کر زبردستی کر رہے ہیں؟“ جنید جو اس مہینے میں دس بار خالدہ بیگم کو یہ بات کہہ چکا تھا آج پھر ان کو مارکیٹ جانے کے لیے تیار دیکھ کر اُس نے چڑھتے ہوئے اپنی بات کہی۔

”تمہیں مسئلہ کیا ہے نور سے؟ اچھی خاصی، پیاری اور پڑھی لکھی ہے اور ساتھ باپ کی اتنی جائیداد کی مالک بھی جو حارت اور حاشر کے ساتھ ساتھ اُس کی بھی ہے،“ خالدہ بیگم نے اُس کے قریب بیٹھتے پھر سے لاپچ دیا۔

”میں مانتا ہوں وہ پیاری ہے اور بہت زیادہ ہے پرمجھے وہ پسند نہیں، کیوں کہ میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھے ملائکہ پسند ہے اور میں شادی بھی اُسی سے کروں گا“، جنید نے ہٹ دھرمی برقرار رکھتے دوڑوک جواب دیا تو سلیم صاحب بھی کمرے میں داخل ہوئے (جو بھی ابھی اپنی دکان بند کر کے آئے تھے)۔

”ٹھیک ہے اگر تمہیں اُس ملائکہ سے ہی شادی کرنی ہے تو پھر ہمیں ہمیشہ کے لیے بھول جانا،“ خالدہ بیگم نے سلیم صاحب کی طرف دیکھتے اپنا فیصلہ سنا یا تو جنید نے مدد طلب نظر وہ سلیم صاحب کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہے تمہاری ماں اور ایسی کوئی بات تھی تو تمہیں پہلے بتانی چاہیے تھی اس وقت نہیں جب شادی میں بس چند ہی دن بچے ہیں،“ (سلیم صاحب جو خالدہ بیگم کی طرح لاپچی تو نہیں تھے پر خود

بھی بیٹی کے باپ ہونے کی حیثیت سے انہیں سکندر صاحب کی عزت کا خیال تھا) سلیم صاحب نے خالدہ بیگم کی نسبت سختی سے بات کی۔

”ٹھیک ہے اگر آپ لوگ میرا ساتھ نہیں دیں گے تو میں خود ہی دیکھ لوں گا جو کرنا ہوا،“ سلیم صاحب کو بھی خالدہ بیگم کی سائیڈ پر دیکھ کر جنید نے غصے سے کہا اور ان دونوں کو ایک نظر دیکھ کر گھر سے باہر نکل گیا۔

”اس بڑے کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے ہاتھ آئی دولت گوانے کے چکر میں ہے اور وہ ملائکہ اُس کے باپ کے پاس ہے ہی کیا دینے کو،“ جنید کے جاتے ہی خالدہ بیگم نے اپنا سر پکڑا تو سلیم صاحب کو ان کی سوچ پر افسوس ہوا جو خالدہ ہونے کے باوجود بھی بس نور کو دولت کی خاطر ہی اپنا ناچاہتی تھیں۔



کل رات کے واقعہ کہ بعد گھر کے ماحول میں کافی کشیدگی آگئی تھی سب نے خاموشی سے ناشستہ کیا اور حاشر کی غیر موجودگی پر جہاں حارث کو دکھ ہوا وہاں فریجہ بیگم کافی مطمئن تھیں۔ نور بھی یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو کر نیچے آئی تو سکندر صاحب ہمیشہ کی طرح اُس کے آتے ہی سارہ کو اپنی چائے کمرے میں لانے کا کہہ کر اٹھ کر چلے گئے۔

”حاشر بھائی کہاں ہیں؟ اُن کا موڈا بھی بھی خراب ہے کیا؟“ نور نے سارہ کے ساتھ فریجہ بیگم کو بھی کچن میں جاتا دیکھ کر حارث سے سوال کیا جو رات کچھ سمجھانے کے بعد حاشر کو گھر لے کر آیا تھا۔

”ٹھیک ہے تم پریشان نہ ہو اور جلدی کرو دیر ہو جائے گی،“ حارث نے اُسے تسلی دیتے ناشستہ کرنے کا اشارہ کیا تو نور بھی خاموشی اختیار کرتے ہوئے ناشستہ کرنے لگی۔ نور کے یونیورسٹی پہنچتے ہی اُس کا پہلا سامنا خدیجہ سے ہوا جو شاید اُسی کے انتظار میں تھی۔

”یا راتنالیٹ کیوں آئی ہو؟“ اُس نے نور کو دیکھتے ہی اُس کی طرف آتے سوال کیا۔

”لیٹ تو نہیں ہوئی، میں تو کلاس کے ٹائم پر ہی آتی ہوں“، حارت کی کل والی باتیں دماغ میں آتے ہی اُس نے اپنی گھری کی طرف دیکھتے سنجدگی سے جواب دیا۔

”تو جلدی آیا کرونا پہلے تو تمہاری کوئی دوست نہیں تھی پر اب تو میں ہوں“، خدیجہ نے اُس کے لمحے کی سنجدگی کو محسوس کیے بغیر مسکراتے ہوئے اُس کے قریب بیٹھ کے کہا تو نور کو اپنا ایسے بات کرنا اچھا نہیں لگا۔

”ٹھیک ہے کل سے میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی“، موبائل پر آر جے کے میسج کا جواب دیتے اُس نے خدیجہ کو تسلی دی اور سرداںش کے آتے ہی موبائل بند کر کے سب اسٹوڈنٹس کی طرح سیدھے ہوتے اُن کی طرف متوجہ ہوئی۔



زارون کی ناراضی رات کو ہی ختم ہو گئی تھی اور اب وہ آفس کا کچھ کام ختم کرنے کے بعد عالیان کو باقی تمام کام سنبحا لئے کابول کر ہو یہی کے لیے روانہ ہوا کیوں کہ دی جان کتنے دنوں سے اُس کو گاؤں کا چکر لگانے کا کہہ رہی تھیں۔ دو گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ ہو یہی پہنچا جہاں اُس کا پہلا سامنا ہی شہنہاز بیگم سے ہوا۔

”اُف آتے ہی غلط انسان کو دیکھ لیا اب سارا وقت برا گزرے گا“، سلام کرنے کے بجائے اپنے سن گلاسز اٹارتے زارون نے اپنے لمحے کی مخصوص تلنی (جو شہنہاز بیگم کو دیکھتے ہی خود بخود آ جاتی تھی) کو برقرار رکھتے خود کلامی کی مگر وہ اتنی اوپنجی تھی کہ شہنہاز بیگم کے ساتھ ساتھ وہاں موجود ملازموں کو بھی با آسانی سے سنا لی دی۔

”تو آنکھوں پہ پٹی باندھ لینی تھی نایا پھر یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی“، شہنہاز بیگم کہاں چپ رہنے والوں میں سے تھیں۔

”مجھے کوئی ضرورت نہیں اپنی آنکھوں پہ پڑی باندھنے کی اور یہ تمہارا نہیں بلکہ میرے باپ کا گھر ہے اس لیے میرے سامنے زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں،“ غصے کے باعث اپنے ہاتھ کی مٹھی کو بند کرتے اُس نے سرخ آنکھوں سے شہناز بیگم کو گھورا (جو عمر میں تو پینتیس، چھتیس کے قریب تھیں مگر اختشام صاحب کی دولت دیکھ کر انہوں نے اُن کی بیوی اور جوان بیٹی کی بھی پرواکیے بغیر بڑی چالاکی کے ساتھ انہیں اپنے جال میں پھنسایا اور ایک ہی سال کے اندر اُن سے شادی کر لی جس کی خبر کچھ مہینوں پہلے ہی زارون کے ساتھ ساتھ فاطمہ بیگم کو بھی ملی، جسے دل پر لیتے وہ ایک مہینے میں ہی انتقال کر گئیں۔ اختشام صاحب جنہوں نے زندگی میں کبھی زارون کو کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اور اب بھی شہناز بیگم کے کہنے کے باوجود بھی وہ زارون کی ہر ضرورت پوری کرتے پر یہ الگ بات تھی کہ اب زارون کا دل اُن کی کسی بھی مہربانی پر نرم نہیں پڑتا تھا)۔

”تم شاید بھول رہے ہو کہ تمہارے باپ نے یہ جو یلی میرے نام کر دی ہے اور اس کی مالک اب میں ہوں اور تم یہاں میری اجازت کے بغیر کھڑے ہو یہی بہت ہے ورنہ جیسے تم میرے ساتھ بات کر رہے ہو نا میں ایک حکم دوں تو یہ ملازم تمہیں اٹھا کر یہاں سے باہر پھینک دیں،“ تکبر کے باعث گردن مزید اکڑاتے وہ زارون کے سامنے آ کھڑی ہوئیں تو وہاں موجود ملازموں کے درمیان سرگوشیاں ہونے لگیں۔

”ہم گذ، ویسے شاید تم مجھے جانتی نہیں کہ مجھے یہ جو یلی اپنے نام کروانے کے لیے نہ تو کسی وکیل کی ضرورت پڑے گی اور نہ ہی تمہاری اس لیے منہ سے الفاظ سوچ سمجھ کر نکالو، ورنہ تم مجھے باہر پھنکوانے کی بات کر رہی ہو میں تمہیں یہاں زندہ دفن بھی کر دوں تو تمہارے شوہر تک کو خبر نہیں ہوگی،“ دو قدم اُس کی طرف بڑھاتے زارون نے آنکھوں کے ساتھ ساتھ الفاظ میں بھی بلا کی سختی لیے شہناز بیگم کو خبردار کیا جو اُس کی آنکھوں کو دیکھتے ہی دو قدم پیچھے ہو گئیں۔

”کوشش کرنا جب تک میں یہاں ہوں میرے منہ نہ لگو“، اُسے وارن کرتے وہ جیسے ہی دی جان کے کمرے کی طرف بڑھا شہناز بیگم نے ہوش میں آتے ہی تمام ملازموں کو گھورا جوان کی عزت افزائی پر مسکرا رہے تھے۔

”دفع ہو جاؤ سب یہاں سے“، چلاتے ہوئے انہوں نے کہا تو سب ملازم وہاں سے غائب ہو گئے۔

”بات کرتی ہوں سائیں سے“، (اپنی بے عزتی پر اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ زارون کا گلادبا دیتیں) خود کلامی کرتے وہ سیڑھیاں چڑھتے اپنے کمرے میں چل گئیں۔



ساجدہ خاتون جوزارون کی دادی تھیں مگر وہ پیار سے اُن کو دی جان کہتا تھا۔ انہوں نے اپنی نرم طبیعت کی وجہ سے فاطمہ کے انتقال کے بعد بہت پیار سے زارون کو سنبھالنے کی کوشش کی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب رہیں اور زارون جواب احتشام صاحب سے تھوڑی بہت بات کر لیتا اُس میں بھی ساجدہ بیگم کا بڑا ہاتھ تھا۔

”آگیا میرا عل“، اُس کے قدموں کی آواز سنتے ہی ساجدہ بیگم جو آنکھیں بند کیے تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں فوراً آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھا۔ جہاں زارون آج بھی آہستہ آہستہ قدم رکھتے اپنی اچانک آمد پر انہیں چونکا دینے کے چکر میں تھا۔

”افف دی جان کیا ہے آپ کو؟ میرا سارا سر پرانے خراب کر دیا“، زارون نے اُن کی ہمیشہ سے اُس کی خوبصورتی سے اُسے پہچان لینے کی عادت پر بدمزہ ہوتے ہوئے کہا اور اُن کے مسکرانے پر خود بھی مسکراتے ہوئے اُن کی جانب بڑھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“، اُن کے پر نور اور شفاف چہرے کو دیکھتے (جوزارون کو ہمیشہ ہی سکون دیتا

تھا) اُس نے سرآن کی گود میں رکھا۔

”ہاں اللہ کا بڑا حسان ہے کہ اُس نے اس عمر میں بھی چلنے پھرنے کے قابل رکھا ہوا ہے اور تم بتاؤ کہاں مصروف تھے اتنے دنوں سے کہہ رہی تھی کہ حویلی کا چکر لگا لو پر لگتا ہے کوئی بڑی مصروفیت تھی جو دی جان کے بلانے پر بھی میرے شہزادے نے کان نہیں دھرے“، اُس کے بالوں میں نرمی سے ہاتھ چلاتے وہ زارون کی آنکھوں میں چمک دیکھتے ہی سمجھ چکی تھیں کہ آج کوئی بہت خاص بات تھی۔

”جی بس ایک کام میں پھنسا ہوا تھا۔ شکر ہے ہو گیا پر اب آپ دعا کریں کے آگے بھی سب ٹھیک سے ہو جائے پھر میں اگلی بار اپنے ساتھ ساتھ آپ کو ایک اور سر پرانے دوں گا جو باقیوں کا تو پتا نہیں پر آپ کو بہت پسند آئے گا“، اٹھ کر بیٹھتے زارون نے تجسس برقرار رکھتے ساجدہ بیگم سے کہا جو آج سات آٹھ مہینے بعد اُس کے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ کے بجائے حقیقی خوشی دیکھ کر اندر سے مطمئن ہوئیں۔

”ٹھیک ہے میں انتظار کروں گی اور دعا بھی، اختشام سے ملے؟“ اُسے والپس گود میں سر رکھتا دیکھ کر ساجدہ بیگم نے پوچھا تو زارون نے نفی میں سر ہلا�ا۔

”کچھ دیر میں مل لوں گا ابھی تو بس سکون سے کچھ دیر آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں“، شہنماز بیگم سے ہونے والی بحث کا بتانے کے بجائے زارون نے نرمی سے جواب دیا اور ان سے گاؤں کے حالات و واقعات کے بارے میں پوچھنے لگا۔



یونیورسٹی سے گھر آتے ہی نور نے کچھ دیر آرام کرنے کے بعد حاثر کے کمرے کا رخ کیا تاکہ اُس سے کھانے کا پوچھ سکے کیوں کہ صحیح کی طرح وہ دوپھر کے کھانے پر بھی موجود نہیں تھا۔ ”آ جائیں“، دروازے پر دستک سنتے حاثر جو اپنے سی ایس ایس کے پیپر کی وجہ سے پڑھنے میں مصروف تھا اُس نے سر اٹھاتے آنے والے کو دیکھا۔

”نوراعین آؤ وہاں کیوں کھڑی ہو؟“، کتاب بند کرتے اُس نے نور کو دیکھتے ہی خوشدی سے کہا۔  
 ”وہ آپ کھانے کے لیے ٹیبل پر نہیں آئے میں نے سوچا پوچھ لوں کہ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“، اُس نے بیڈ کے قریب آتے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

”وہ میں نے گیارہ بجے ناشستہ کیا تھا اس لیے بھوک نہیں تھی اور تم کس کے ساتھ واپس آئی ہو؟“، حاشر نے حیرت سے سوال کیا کیوں کہ حارت چھوڑ نے آتا اُسے تو حاشر کو دیکھنے کم رے میں ضرور آتا۔

”حارت بھائی کے ساتھ، ان کی کوئی میٹنگ تھی اس لیے گیٹ پر چھوڑ کر چلے گئے، اس کی بات کا جواب دیتے وہ سامنے موجود سنگل صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔

”ہم اچھا تم نے کھانا کھایا؟“، اُس کا جواب سن کے حاشر نے مطمئن ہوتے ہوئے سوال کیا۔  
 ”جی کھالیا اور آپ ناراض ہیں کیا رات والی بات سے؟“، نور نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، میں کسی سے ناراض نہیں ہوں اور ویسے بھی رات گئی بات گئی“، اپنے انداز سے لاپرواں ظاہر کرتے حاشر نے جواب دیا تو نور اُس کے چہرے کا بدلتارنگ دیکھ چکی تھی۔

”پھر بھی ابو کو پھوپھو کی بات کا یقین کر کے آپ کو ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا۔“

”چھوڑ و پکھ نہیں ہوتا۔ ویسے بھی غلطی میری تھی مجھے سارہ کے منہ نہیں لگنا چاہیے تھا نہ میں اُسے کچھ کہتا نہ بڑھتی اور تم کیا یہ میرا دل جلانے والی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو، مجھے چھوڑ و اور اپنا بتاؤ، شاپنگ مکمل ہو گئی یا نہیں؟“، حاشر نے سر جھکلتے بات بدلتی تو نور نے بھی مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا تب ہی وہ اُسے اپنی شاپنگ کے متعلق بتانے لگی۔



زارون دی جان سے باتیں کرتے کرتے وہیں سو گیا اور شام سات بجے کے قریب اُس کی آنکھ

موبائل پر ہونے والی مسلسل بیل سے کھلی۔

”ہیلو، اُس نے دیکھے بغیر ہی موبائل اٹھا کے کان سے لگایا۔

”ہیلو کے بچے تم نے کہا تھا میں پانچ بچے تک آ جاؤں گا اور اب ٹائم دیکھ لو کیا ہو رہا ہے۔ سات نج گئے ہیں اور یہ تم اس وقت سور ہے ہو کیا؟“ عالیان جو ایک ضروری میٹنگ جس میں زارون کا ہونا لازمی تھا اُس کا انتظار کر کر کے اکیلے ہی اٹینڈ کر کے آیا تھا اور اب پچھلے آدھے گھنٹے سے کال کر کے اُس کے فون نہ اٹھانے پر مزید براہم ہوا۔

”ہاں، کیوں اس وقت سونے پر کوئی پابندی ہے کیا؟“ زارون نے سیدھے ہو کر لیٹتے عالیان کی آواز پر آنکھیں کھولیں۔

”نہیں پابندی کوئی نہیں اور تم پر تو بالکل بھی کسی بات یا چیز کی پابندی نہیں ہے اس لیے سکون سے نیند پوری کرو اور جب سب کاموں سے فارغ ہو جاؤ تو کال کر لینا بتا دوں گا کہ کس کام کے لیے تمہیں پچھلے آدھے گھنٹے سے فون کر رہا تھا،“ عالیان نے زارون کی بات سنتے ہی بڑی نرمی سے بتیں سنائی اور کھٹ سے کال کاٹ دی۔

”اُف کیا مصیبت ہے،“ موبائل کان سے ہٹاتے اُس نے اسکرین کو گھورا اور کمرے میں ایک نظر دوڑاتے دی جان کو تلاش کیا جو شاید وہاں موجود نہیں تھیں تب ہی وہ فریش ہونے کے بعد ان کی تلاش میں باہر آیا تو وہ اُسے سامنے ہی احتشام صاحب کے ساتھ بیٹھی نظر آ گئیں۔

”السلام علیکم،“ زارون نے اُن دونوں کے قریب آ کر احتشام صاحب کو سلام کیا جو اُسے دیکھتے ہی اُٹھے اور اپنے سینے سے لگایا۔

”کیسا ہے میرا شیر؟“ الگ ہو کر انہوں نے جتنی خوشدی سے پوچھا زارون نے زبان سے جواب دینے کے بجائے اثبات میں سر ہلاتے اُتنی ہی بے رخی دکھائی۔

”دی جان آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟“ زارون نے احتشام صاحب کو نظر انداز کرتے ہوئے ساجدہ بیگم کے قریب بیٹھتے سوال کیا۔

”اس لیے کہ اپنی نیند پوری کر لو اتنے سکون سے سوئے تھے تم کہ مجھے مناسب نہیں لگا جگانا،“ اس کی کالی خوبصورت آنکھوں میں بے وقت نیند کی وجہ سے سرخ ڈورے دیکھ کر وہ مسکرائیں۔

”میری ایک ضروری میٹنگ تھی آج، جہاں مجھے پانچ بجے پہنچنا تھا،“ زارون نے اکتاہٹ سے بتایا۔

”تو کیا ہوا اپنی دی جان کے لیے ایک میٹنگ نہیں چھوڑ سکتے تم؟“ ساجدہ بیگم نے احتشام صاحب کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے اپنے پوتے سے اعتراض کیا۔

”آپ کے لیے تو میں دنیا کا ہر کام، ہر میٹنگ چھوڑ دوں،“ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے زارون نے نرمی اور پیار سے کہا۔

”تو اپنے باپ سے بھی ناراضی چھوڑ دے، اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے،“ (ساجدہ بیگم جو زارون کے لمحے کی وجہ سے احتشام صاحب کا اُترنا ہوا چہرہ دیکھ کر اندر سے افسردہ ہو چکی تھیں) انہوں نے زارون کا موڈٹھیک دیکھ کر سمجھایا۔

”ہم میری ان سے کوئی ناراضی نہیں اور رہی بات غلطی کے احساس ہونے کی تواب ان کی کوئی بھی تلافی میری ماں کو واپس نہیں لاسکتی۔ اس لیے پلیز دی جان دوبارہ مجھے اس بات کے لیے مت کہیے گا جو میں کبھی چاہ کر بھی پوری نہیں کر سکتا،“ زارون نے احتشام صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے لمحے میں سختی سموئے جواب دیا تو انہوں نے نا امیدی سے ساجدہ بیگم کی طرف دیکھا جوز ارون کی ضد کو اچھی طرح جانتی تھیں۔

”اچھا نہیں کروں گی دوبارہ یہ بات۔ انٹھورشیدہ نے کھانا لگا دیا ہے۔ کھانا کھاتے ہیں مجھے تو

بہت بھوک لگی ہے، آنکھوں ہی آنکھوں میں احتشام صاحب کو تسلی دیتے انہوں نے بات بدی تو زاروں بھی کچھ کہے بغیر ان کا ہاتھ پکڑ کر ٹیبل پر لے آیا جہاں آج ساجدہ بیگم نے اُس کی پسند کی تمام چیزیں بنوائی تھیں۔



دودن بعد سارہ اور نور دونوں کو فریجہ بیگم کے کہنے پر مایوں بٹھا دیا گیا۔ نور نے یونیورسٹی سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی اور خدیجہ کو بھی اپنی شادی کے بجائے کہیں جانے کا بتا دیا کیوں کہ نور نہیں چاہتی تھی کہ وہ اُسے اپنی شادی پہنچانے اور اُس کے کپڑے، میک اپ اور باتوں سے فریجہ بیگم کے ساتھ ساتھ کسی کو بھی بات کرنے کا موقع ملے۔ حارت کے ساتھ ساتھ حاشر بھی صحیح سے ہی کاموں میں مصروف تھا کیوں کہ کل مہندی تھی اور سکندر صاحب نے گھر کے تمام کام اُن دونوں کے ذمے لگاتے خود کھانے وغیرہ کا انتظام سنپھال لیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا گھر مہمانوں سے بھر گیا تھا سکندر صاحب کے بھائیوں کے ساتھ ساتھ قربی رشتے دار مہندی سے ایک دن پہلے ہی آچکے تھے۔ گھر میں ہر طرف شور شراباً اور رونقیں لگی تھیں مگر نور کا دل اندر سے خوف اور آنے والے وقت کا سوچتے بیٹھا جا رہا تھا۔ اُس نے کتنی ہی بارہمت کی کہ وہ حارت کو سب بتا دے پر گھر میں ہونے والے ہنگامے اور سکندر صاحب کا سوچتے ہی اُس نے خود کو اللہ پاک کے رحم و کرم پر چھوڑتے خاموشی اختیار کی پر اب جو خبر سحر (اُس کے ماموں کی بیٹی) کے ذریعے اُس کے کانوں تک پہنچی اُس نے اُسے اندر تک خوف زدہ کر دیا۔

”پر کیوں آپی، نکاح آج کیوں ہونا ہے اور ابھی تو مہندی بھی نہیں ہوئی؟“ نور نے کا نپتی ہوئی آواز میں سحر سے پوچھا جو یہ خبر نور کو بڑی خوشی خوشی سنارہ ہی تھی۔

”یہ تو مجھے بھی نہیں پتا پرشاید مہندی کا فنکشن اکٹھا ہونے کی وجہ سے پھوپھانے یہ فیصلہ کیا ہے“ سحر نے اندازہ لگاتے ہوئے نور کو بتایا تو اُسے اپنی روح تک کا نپتی محسوس ہوئی۔

”لیکن ابوایسا کیسے کر سکتے ہیں؟“ مطلب کل مہندی تھی ناکل کر دیتے نور نے سحر کے حیرت سے دیکھنے پر بات بدلتی۔

”ہم تو اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے نکاح ہی ہونا ہے نا؟ آج ہو یا کل اور تم اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہو؟ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“ سحر نے اتنی سردی کے باوجود بھی اُس کے چہرے پر پسینے کی نہیں بوندیں آتی دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں مجھے کیوں اعتراض ہونا ہے بھلا؟“ نظریں چراتے اُس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا اور زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجائی تاکہ سحر کو شک نہ ہو۔

”ہاں ناولیسے بھی تمہاری اور جنید کی بات تو کافی وقت سے طے ہے۔ بس اب تم یہ جوڑا پہنوا اور میں تمہیں تیار کروں کیوں کہ ایک گھنٹے تک دولہا والے آجائیں گے،“ اس نے سفید خوبصورت سے جوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نور سے کہا جوابات میں سر ہلاتے جوڑے کے ساتھ ساتھ اپنا موبائل بھی سحر کی نظر سے بجا کر واش روم میں لے جا چکی تھی۔



گاؤں سے واپس آنے کے بعد وہ کچھ دن اپنے ایک نئے پراجیکٹ کے سلسلے میں کافی مصروف رہا اور کل بھی اُس کی ایک ضروری میٹنگ تھی جس کی وجہ سے اُسے اور عالیان کو کراچی جانا تھا۔ جہاں ان کا دو دن کا اسٹے تھا۔ اسی لحاظ سے وہ دونوں کل نکلنے کے لیے اپنی اپنی ضروری چیزوں کی پیکنگ کر رہے تھے۔ عالیان کے موبائل پر کال آنے لگی جسے دیکھتے ہی وہ زارون (جو اُسی کے کمرے میں موجود تھا) کو دو منٹ رکنے کا بولتے مسکراتے ہوئے کال ریسیو کرتے اپنے کمرے میں بنی بالکونی میں چلا گیا۔

”یہ تو گیا کام سے“، زارون نے اُس کی مسکراہٹ سے اندازہ لگایا تھا کہ کس کی کال ہے تب ہی اُس کی پشت کو دیکھتے اُس نے خود کلامی کی اور بیڈ پر پڑے کپڑوں اور چیزوں کو دیکھتے خود ہی اٹھا کر بیگ

میں رکھنے لگتا کہ عالیاں جیسے ہی فارغ ہو وہ لوگ کھانا کھا کر سو سکیں۔

☆☆☆

نور نے واش روم میں آتے ہی سب سے پہلے آر جے کو کال کی تاکہ اُسے سب بتا کر مدد کے لیے کہہ سکے پر پہلے تو آر جے نے کال لیٹ ریسیو کی اور دوسرا بھی اُس نے بات شروع ہی کی تھی کہ سحر نے باہر سے دروازہ کھلکھلاتے اُسے جلدی کرنے کا کہا تو گھبراہٹ کے مارے موبائل اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین بوس ہو گیا۔

”اللہ“، اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھتے موبائل کی ٹوٹی ہوئی اسکرین کو دیکھا (جس پر اُس نے حارث کے اتنی بار کہنے کے باوجود بھی پروٹیکٹر نہیں لگوا یا تھا)۔

”نور کیا ہوا اور یہ کیا گرا ہے تم ٹھیک ہونا؟“ سحر جو دروازے سے واپس ملنے ہی لگی تھی اندر سے آنے والی آواز پر چونک کر پوچھنے لگی۔

”جی آپی سب ٹھیک ہے وہ شیمپو کی بوتل گرگئی تھی“، خود کو سنھاتے اُس نے جواب دیا اور موبائل اٹھاتے آن کرنے کی کوشش کی پر آج قسمت اُس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ بار بار کوشش کرنے کے بعد بھی جب موبائل آن نہ ہوا تو اُس نے رونا شروع کر دیا اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اب کیا کرے اور اوپر سے سحر جو بار بار اُسے جلدی کرنے کا بول رہی تھی تب ہی اُس نے اُس شخص کو کبھی خوش نہ رہنے کی بد دعا دیتے کا نپتے ہاتھوں سے منہ ہاتھ دھوتے اپنی آنکھوں میں پانی کے چھینٹے مارے تاکہ اُس کی سرخی کم ہو سکے اور چینچ کرتے باہر آگئی۔ جہاں سحراب اُس کی جیولری اور چوڑیاں وغیرہ سیٹ کر رہی تھی۔

”اتنا ٹائم لگا دیا تم نے اور یہ کیا تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا؟ ٹھیک ہونا تم؟“

”جی آپی کچھ نہیں بس امی یاد آ رہی ہیں“، نور نے اپنے اندر کی بے بسی کو گھٹن میں بدلتا دیکھ کر کہا

اور سحر کے ساتھ لگتے رونے لگی۔

”نور پلیز صبر کرو اور یہ رو نے کا وقت نہیں ہے بلکہ خوشی کا ہے اس لیے اس وقت رو کے خود کو ہلکا ن کرنے سے بہتر ہے تم یہ سمجھو کہ پھوپھو تمہارے ساتھ ہیں اور وہ بھی تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہیں،“ سحر نے اُسے سمجھاتے ٹشوپ پر تھایا تو نور نے اپنی آنکھیں صاف کرتے اُس سے موبائل لینے کا سوچا پر پھر اپنے خیال کو رد کرتے خاموشی سے آنے والے وقت کے ٹھیکانے کی دعائیں کرنے لگی۔

☆☆☆

”کر آئے بات؟“ زارون جو اس کی پیکنگ کرنے کے بعد اپنے موبائل پر آنے والی کال ریسیو کرتے اُس کے کمرے سے باہر آگیا تھا اور اب ٹیبل پر برتن لگاتے اُسی کے انتظار میں بیٹھا تھا اُسے دیکھ کر اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھنے لگا جوابات میں سر ہلاتے چیز پیچھے کرتے بیٹھ چکا تھا۔  
”ہاں، بات کیا کرنی تھی ہمیشہ کی طرح آج پھر غائب ہو گئی ہیں میدم اور پچھلے آدھے گھنٹے سے بات کے بجائے اُس کی دوبارہ کال یامسیح کا انتظار کر رہا تھا کہ مجھے کچھ بتائے تو میں باہر آؤں پر لگتا ہے مجھے انتظار پہ لگا کر خود سوگئی،“ اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے اُس نے زارون کو بتایا تو وہ عالیان کے خراب موڈ کی پرواکیے بناتھے لگا کر ہنسنے لگا۔

”ہونہہ ہنس لو بچے ابھی تمہارے ہنسنے کے دن ہیں۔ بہت جلد تمہیں بھی رلانے والی آنے والی ہے،“ عالیان نے اُسے اپنی حالت سے لطف انداز ہوتا دیکھ کر کہا تو زارون نے سیر لیں ہونے کی کوشش کی مگر ناکام ہوتے ہوئے پھر سے مسکرانے لگا۔

”یہ تو وقت بتائے گا کہ کون کسے رلاتا ہے میں یا وہ،“ اپنے چہرے پر مسکراہٹ برقرار رکھتے اُس نے عالیان کو چیلنج کرنے والے انداز میں کہا تو اُس نے تیوری چڑھائی۔

”مطلوب تم ابھی بھی اُس معصوم کو رلانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ چھپے پلیٹ میں رکھتے اُس نے

سنجدگی سے پوچھا۔

”نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں پر وہ خود ہی رونا چاہے تو اس میں میرا کیا قصور؟“ اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے اُس نے جتنے پر سکون انداز میں کہا عالیان کا دل اپنے سامنے بیٹھے اُس شخص کو (جسے وہ اپنا دوست کہتا تھا) تھپڑ لگانے کا کیا۔

”ایک بات کا جواب دینا پسند کریں گے آپ مسٹر زارون علی؟“ ہاتھ باندھتے عالیان نے طنزیہ اُس کا نام اتنے احترام سے لیا۔

”بھی پوچھیں؟“ زارون نے ہاتھ روکتے اُسی کے انداز میں اجازت دی۔

”آپ کی نور کے ساتھ، میرا مطلب میری بہن کے ساتھ کوئی خاص دشمنی ہے یا آپ کو شوق ہے کسی کی بھی زندگی بر باد کرنے کا؟“ نور کے نام پر زارون کے گھورنے پر عالیان نے بہن کا لفظ استعمال کیا۔

”پہلی بات یہ کہ میں نے اُس کی زندگی بر بانہیں کی بلکہ اُس کے سوکالڈ کزن جنید سے بچایا ہے۔ جو نا صرف ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہے بلکہ اُس کے ساتھ ساتھ اُس کی امی حضور نور کے پیار میں نہیں بلکہ اُس کے ساتھ آنے والی دولت کے لیے یہ سب کر رہی ہیں۔ باقی رہی بات میرے طریقے کی توجہ غلط تھا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا پر اُس وقت میری سمجھ میں بس یہی بات آئی اور میں نے کر لی اور جو کام کر لیا اُس پر اب کیا پچھتنا نا،“ کندھے اچکاتے اُس نے عالیان کو تفصیل سے بتایا جس پر نا صرف اُسے حیرت ہوئی بلکہ نور کی کسی اور سے شادی کا سنتے کچھ غیر معمولی سا احساس ہوا جسے زارون کی نظر سے بچانے کے لیے اُس نے گلاس اٹھا کر لبوں سے لگاتے پانی کا گھونٹ بھرا۔

”کیا ہوا؟“ اُسے خاموش دیکھ کر زارون نے سوال کیا۔

”کچھ نہیں بس کھانا کھاؤ مجھے نیند آ رہی ہے،“ عالیان نے کچھ سوچتے ہوئے زارون سے کہا تو

اُس نے پروا کیے بغیر پھر سے کھانا شروع کیا۔

☆☆☆

”امی یہ سب کیا ہے آپ لوگوں نے کیوں ہامی بھری نکاح کی؟ اور یہ خالو کو کیا جلدی پڑ گئی جو آج ہی نکاح کرنے کا کہہ دیا؟“، جنید نے نکاح کی خبر ملتے ہی پریشانی سے کمرے میں ٹھلٹتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ تو اب مجھے بھی نہیں پتا پر کہہ رہے تھے کہ کل مہندی کا فنکشن ساتھ ہے تو میں اپنی بیٹی کو ایسے جنید کے ساتھ نہیں بٹھاؤں گا اس لیے آج نکاح کر دیتے ہیں تاکہ شرعی طور پر وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنے کا حق رکھ سکیں؟“، خالدہ بیگم جو سکندر صاحب کی بات پر نہ ان کو منع کر سکتیں تھیں اور نہ ہی جنید کی ضر کی وجہ سے اُسے کچھ بتا رہی تھیں بالآخر گھر سے نکلنے سے دس منٹ پہلے انہوں نے سلیم صاحب کے زور دینے پر جنید کو بتایا جواب تک یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ لوگ سارہ اور حارت کے نکاح میں جا رہے ہیں۔

”تو نہ بٹھائیں اپنی بیٹی کو میرے ساتھ اور میں یہ نکاح کسی صورت نہیں کروں گا“، جنید نے صوف پر بیٹھتے اپنا فیصلہ سنایا۔

”تو کیا کرو گے؟ ہماری عزت اچھا لوگے یا پھر اُس معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کرو گے جو پچھلے دس سال سے تمہارے نام پر بیٹھی ہے؟“، سلیم صاحب نے اُسے شرم دلانی چاہی جوتب سے خاموش تھے۔

”توابو میں نے نہیں کہا تھا کہ اُس لڑکی کو میرے نام کر دیں یہ سب آپ لوگوں کا فیصلہ تھا اور میں نے تب بھی آپ لوگوں کو منع کیا تھا کہ ایسا نہ کریں کیوں کہ حالات اور وقت بدلتے دریں ہیں لگتی؟“، جنید نے اپنادفاع کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

”اب جو ہونا تھا ہو گیا فیصلہ جس کا بھی تھا پر اب تمہیں ہماری عزت رکھنی ہوگی اُس کے بعد بے شک تم نور کو ہمارے پاس چھوڑ کے دوسری شادی کر لینا“، خالدہ بیگم نے اُس کی بات سنتے ہی دوڑوک بات کی تو جنید کے ساتھ ساتھ سلیم صاحب نے بھی اُن کی طرف افسوس سے دیکھا جن کا نور کے ساتھ

خونی رشتہ تھا پر دولت کے لائچ نے جیسے اُن کا خون ہی سفید کر دیا ہو۔

”اُس وقت بھی تو میں آپ لوگوں کے پاس اُسے چھوڑ کر اُس کی زندگی تباہ کروں گا نا تو اب کیا مسئلہ ہے؟ آپ ابھی خالو کو سب بتا دیں تاکہ وہ نور کی کسی اور جگہ شادی کر دیں،“ جنید نے خالدہ بیگم کے ساتھ ساتھ سلیم صاحب کو بھی سمجھانا چاہا۔

”ٹھیک ہے اگر تمہیں اپنی ہی مرضی کرنی ہے تو میں سکندر کو انکار کر دیتا ہوں،“ سلیم صاحب کو جنید کی ضد اور خالدہ بیگم کی باتیں سن کر یہی ٹھیک لگا۔

”خبردار اگر آپ نے یا جنید نے انکار کیا تو آپ دونوں میرا مراد ہو امنہ دیکھیں گے،“ خالدہ بیگم نے کہنے کے ساتھ ساتھ عملی مظاہرے کے لیے دراز میں رکھی نیند کی گولیوں کی شیشی اٹھانی اور ڈھلن کھولتے کھانے لگیں کہ جنید نے آگے بڑھتے جلدی سے شیشی اُن کے ہاتھ سے پکڑی۔

”امی کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ شیشی ایک طرف پھینکتے جنید زور سے چینا۔

”مرجانے دو مجھے اپنی بے عزتی اور ذلت سے تو یہی بہتر ہے کہ میں ابھی مر جاؤں،“ اُس سے بھی اوپنجی آواز میں چیختے خالدہ بیگم اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھتے روئے لگیں تو جنید نے بے بسی سے سلیم صاحب کی طرف دیکھا جواب خاموش کھڑے سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔

”ٹھیک ہے میں نکاح کے لیے تیار ہوں پر نکاح کے بعد میرا نور سے کوئی تعلق نہیں ہو گا،“ اس نے ہتھیار ڈالے اور اُن دونوں کی طرف ایک نظر دیکھتے کمرے سے باہر نکلا تو خالدہ بیگم نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے جو صرف ڈرامہ تھے۔

”مجھے لگتا ہے تمہیں جنید کی بات مان لینی چاہیے ایسے کسی کی پچی کی زندگی تباہ کر کے کیا ملے گا ہمیں،“ سلیم صاحب (جن کی کبھی بھی اس گھر میں نہیں چلی تھی) نے ایک بار پھر سے خالدہ بیگم کو سمجھانے کی اپنی سی کوشش کی۔

”ہاں آپ تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ میں ساری زندگی آسائشوں کو ترستے ہوئے گزار دوں، پہلے آپ کی ایک چھوٹی سے دکان تھی سوچا بیٹا بڑا ہو گا تو شاید زندگی میں سکون آجائے پر بیٹے نے بھی بڑے ہو کے کوئی خاص میری امید یہ پوری نہیں کیں اور اب آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں گھر آئی دولت ٹھکر ادوں وہ بھی اس نالائق کے پیچھے لگ کر؟ اور آپ نکاح ہو لینے دیں نور گھر آجائے گی تو اس کا دماغ خود ہی سیٹ ہو جائے گا،“ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی آنکھیں صاف کرتے انہوں نے سلیم صاحب کو طعنہ دینے کے ساتھ ساتھ مطمئن کیا تو نسرین (ملازمہ) کے کمرے میں آتے ہی انہوں نے مزید بحث کے بجائے دل سے نور کے حق میں دعا کی۔



سحر نے نور کا ہلاکا سامیک اپ کرنے کے بعد چیولری اور چوڑیاں پہنائی اور اب بالوں کو باندھتے کچھ لٹیں باہر نکالتے ڈارک ریڈ کلر کا دوپٹہ اُس کے سر پر ڈکا دیا۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو ماشاء اللہ،“ شیشے میں اُس کے عکس کو دیکھتے سحر نے اُس کے سو گوا رچھرے پر نظر ڈالتے (جو اسے مزید خوبصورت بنارہاتھا) نظر اُتاری تو نور نے نظر اٹھا کر اپنے آپ کو دیکھا۔

”اچھی لگ رہی ہونا؟“ سحر نے اُسے نظر اٹھاتے خود میں گم صمدمیکھ کر پوچھا۔

”جی،“ نظریں جھکاتے اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی خوبصورتی کی طرح اپنی قسمت کے اچھے ہونے کی آرزو کی جو اس کے پیدا ہونے سے لے کر اب تک خراب ہی تھی۔

”جنید بھائی اور ان کے گھروالے آگئے ہیں پھوپھا کہہ رہے ہیں جلدی سے نور آپی کو تیار کر کے باہر لے آئیں،“ شرہ (سحر کی چھوٹی بہن) نے کمرے میں آتے ہی سکندر صاحب کا پیغام دیا تو نور کو اپنا دل نکل کر حلق تک آتا محسوس ہوا۔

”ہاں بس آتے ہیں“، سحر نے جواب دے کر ایک نظر دوبارہ سے نور کی طرف دیکھا اور ہر چیز پرفیکٹ ہونے پر دوپٹہ اُس کے سر سے چہرے پر ڈالا اور اُسے اٹھنے کا کہا جو بس بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

”کیا ہوا تم ٹھیک ہونا؟“، سحر نے اُسے کھڑے ہونے کے ساتھ ہی لڑکھڑا تاد کیجھ کر سوال کیا۔

”جی بس سرچکر رہا ہے“، نور نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا میں پانی دوں؟“، سحر نے اُسے واپس بٹھا کر پوچھا۔

”جی دے دیں“، اثبات میں سر ہلاتے اُس نے لمبا سانس لیتے اپنی سانسوں کو بحال کرنے کی کوشش کی جو خوف کی وجہ سے بند ہونے کے قریب تھیں۔

”دیتی ہوں“، اس کے ٹھنڈے ہاتھوں کو محسوس کرتے وہ خود بھی پریشان ہو گئی تھی تب ہی جلدی سے پانی لینے چلی گئی۔

”پلیز اللہ پاک میری مدد کر دیں میں کیسے نکاح پہ نکاح کر سکتی ہوں؟ پلیز کچھ ایسا کر دیں کہ سب ٹھیک ہو جائے“، سحر کے جاتے ہی نور نے اپنے ہاتھ اٹھاتے دعا کی اور آنسوؤں کو باہر نکلنے سے روکا جو بند توڑنے کو بے تاب تھے۔

”یہ لو“، سحر نے آتے ہی گلاس اُس کی جانب بڑھایا تو نور نے کا نپتے ہوئے ہاتھوں سے گلاس پکڑتے پانی کے دو گھونٹ بھرے جو بامشکل اُس کے حلق سے نیچے اترے۔

”ٹھیک ہواب؟“، نور نے گلاس سحر کی طرف بڑھایا تو اُس نے فکرمندی سے پوچھا۔

”جی“، نور نے زبان کے بجائے سر ہلایا۔

”اچھا تو چلو پھوپھا بُلار ہے ہیں“، دوبارہ دوپٹہ اُس کے چہرے پر ڈالتے سحر نے کہا تو نور نے اُسے مزید کسی بات کا موقع دیے بغیر اٹھ کر آہستہ قدم اٹھاتے باہر کا رخ کیا جہاں قاری صاحب کے

ساتھ ساتھ باقی سب بھی موجود تھے۔

☆☆☆

”عالیان اٹھو ہمیں فوراً جانا ہے“، زارون جو کھانا کھا کر راجیل کی کال آنے پر آواز ٹھیک سے نہ آنے کے باعث ٹیبل سے اٹھ کر تھوڑا سا سیدھا پر ہوا تھا اُس نے واپس آتے ہی عالیان سے کہا جو بھی تک کھانا کھانے میں مصروف تھا۔

”پر کہاں؟“ عالیان نے چچھے منہ میں ہی رکھے پوچھا تو زارون نے جواب دینے کے بجائے اُسے کھینچ کر کھڑا کیا۔

”باتیں کر کے وقت ضائع مت کرو اور جلدی سے گاڑی نکالو میں دو منٹ میں آیا“، اُس نے چچھے اُس کے منہ سے نکلتے غصے سے ٹیبل پر پٹختا تو عالیان کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔

”اوکے میں گاڑی نکالتا ہوں۔ آ جاؤ تم“، مزید کوئی سوال کرنے کے بجائے اُس نے چابی لیتے باہر کا رخ کیا اور زارون موبائل پر کسی کو کال ملاتے ہوئے جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

”یہاں لاو میرے پاس بٹھاؤ میری بیٹی کو“، خالدہ بیگم نے سحر کے ساتھ ساتھ نور کو بھی لاونج میں آتا دیکھ کر جنید کے قریب سے اٹھ کر دوسری طرف صوف پر بیٹھتے ہوئے کہا تو سحر نے مسکراتے ہوئے اشبات میں سر ہلاتے نور کو ان کے ساتھ بٹھا دیا جہاں سارہ پہلے سے بیٹھی تھی۔

”قاری صاحب نکاح شروع کریں“، نور کے آتے ہی سکندر صاحب جو اُسی کے انتظار میں بیٹھے تھے انہوں نے قاری صاحب سے کہا جنہوں نے سکندر صاحب کے کہنے پر پہلے سارہ اور حارت کا نکاح پڑھانا شروع کیا۔

”اللہ، کیا کروں اب میں؟ پلیز مجھے یہ گناہ کرنے سے بچائے“، نور نے آنسو جواب آنکھوں سے

باہر آنے کو بے تاب تھے اُن کو روکنے کے لیے اپنی آنکھیں سختی سے بند کیں اور ایک بار پھر سے وہ منظر اُس کی نظروں کے سامنے گھونمنے لگا جب اُس نے اپنی زبان سے زاروں کے لیے اقرار کیا تھا۔

”یا اللہ مجھے موت دے دے، پر پلیز کوئی ذلت مزید میری قسمت میں مت لکھنا“، قاری صاحب کے بول اُسے بہت کچھ یاد دلانے لگے تو اُس نے آنکھوں کو مزید سختی سے بند کرتے دعا کی۔ نکاح مکمل ہوتے ہی سب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے حارت اور سارہ کے رشتے کی خیر و برکت کے لیے دعا کی۔

”بہت بہت مبارک ہو“، سب سے پہلے سکندر صاحب نے حارت کو گلے لگاتے مبارک باد دی تو حاشر کے ساتھ ساتھ باقی سب نے بھی اٹھ کر حارت کو مبارک باد دی اور جنید جوا بھی تک خاموش بیٹھا تھا اُس نے خالدہ بیگم کے گھورنے پر اٹھ کر حارت کے گلے لگتے اُسے مبارک باد دی۔

”منہ میٹھا کرواؤ بھی سب کا“، خالدہ بیگم نے سحر کو کہا تو وہ مسکراتے ہوئے اٹھی اور سب کا منہ میٹھا کروایا جس کے بعد سکندر صاحب نے قاری صاحب کو نور اور جنید کا نکاح شروع کرنے کا کہا تو وہ سر ہلاتے پہلے نور سے اُس کی مرضی پوچھنے لگے جو بالکل گم صمی میٹھی مسلسل اپنی موت کے دعا کر رہی تھی۔

”بیٹا کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟“، قاری صاحب نے دوسری بار پوچھا تو خالدہ بیگم کے ہلانے پر اُسے ہوش آیا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی سب لوگ باہر سے آنے والے شور پر اُس کے بجائے دوسری جانب متوجہ ہوئے جہاں سب سے پہلے ایک نوجوان لاونچ میں داخل ہوا۔

”کون ہیں آپ؟“، حاشر جو اُس کے قریب تھا اُس نے سب سے پہلے اٹھتے پوچھا تو زاروں نے جواب دینے کے بجائے ابر واچ کاتے اُسے ایک نظر دیکھ کر قدم آگے بڑھائے۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے یہاں؟“، اُس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اُس نے نور کے سامنے آتے سوال کیا جس کی سانس اُس شخص کی آواز اور چہرے پر اٹک سی گئی تھی۔

”تم ہوتے کون ہو یہ سب پوچھنے والے اور تم اندر کیسے آئے؟“ حارت نے اُسے نور کے سر پر کھڑا دیکھ کر کچھنا سمجھی سے اٹھ کر اُس کے قریب آ کر پوچھا تو باقی سب بھی اُس لڑکے کے پیچھے دس بارہ لوگوں کو لا اونچ میں داخل ہوتا دیکھ کر کوئی چورڈا کو سمجھ کر اٹھ کر کھڑے ہوئے۔

”میں کون ہوں یہ جاننا زیادہ ضروری نہیں،“ اُس نے کہتے ہوئے قدم حارت کی جانب بڑھائے اور اپنی بات کو جاری رکھا۔

”بلکہ یہ دیکھنا زیادہ ضروری ہے،“ اپنے ہاتھ میں پکڑا کاغذ کھول کر اُس کے سامنے کرتے وہ خاموش ہوا۔

”کیا ہے یہ سب؟“ نکاح نامے پر نور کے نام کے ساتھ ساتھ اُس کے دستخط دیکھ کر حارت نے جھپٹ کر کاغذ اُس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے سوال کیا۔

”ہمم لگتا ہے پڑھے لکھے نہیں ہوتا ہی نکاح نامے پر اپنی بہن کا نام دیکھ کر بھی سمجھ نہیں آئی کہ یہ کیا ہے؟“ کاغذ اُس کے ہاتھ سے لیتے اُس نے حارت کی آنکھوں میں دیکھتے بے خوف ہو کر بتایا تو اُس کے ساتھ ساتھ لا اونچ میں موجود سب لوگوں نے بے یقین سے سرخ دوپٹے میں گھونگھٹ نکالے بیٹھی نور کو دیکھا جو سب کے برعکس ابھی تک بیٹھی تھی۔

”کیا بکواس ہے یہ سب اور تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بہن کے بارے میں ایسی بات کرنے کی،“ حارت نے ہوش میں آتے ہی زارون کا گریبان پکڑا تو عالیان کے ساتھ ساتھ باقی چار لوگ بھی اُن دونوں کی جانب بڑھے پر اُس سے پہلے ہی زارون نے حارت کے ہاتھ اپنے گریبان سے جھٹکے۔

”اپنے ہاتھ کنٹرول میں رکھو رنہ ان کو توڑنے میں بس مجھے ایک سینکڑ لگے گا،“ انگلی اٹھاتے اُس نے سرخ آنکھوں سے حارت کو وارن کیا۔

”کیا سمجھتے ہو تم؟ ہم تمہاری دہشت سے ڈر جائیں گے اور اس جعلی نکاح نامے پر یقین کر لیں“

گے؟،“ہارت کا دل ابھی بھی اس بات کا یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

”ہاہاہا جعلی؟“ قہقهہ لگاتے اُس نے نکاح نامہ قاری صاحب کی طرف بڑھایا۔

”دیکھیں یہ جعلی ہے؟“ خود سے وضاحت دینے کے بجائے اُس نے قاری صاحب سے پوچھا جو پہلے ہی گھبرائے کھڑے تھے۔ انہوں نے خاموشی سے نکاح نامہ پکڑتے دیکھا تو سکندر صاحب نے ہاتھ انٹھاتے انہیں منع کیا اور نور کی طرف قدم بڑھائے جو بالکل گم صمیم بھی اپنا ہی تماشا بننے دیکھ رہی تھی۔  
”کیا یہ لڑکا سچ بول رہا ہے؟“ اُس کے سر پر کھڑے ہو کے سکندر صاحب نے آہستہ مگر سخت لمحے میں سوال کیا۔

”ابو میں کہہ رہا ہوں نا یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے۔ مجھے نور پر یقین ہے وہ ایسا نہیں کر سکتی،“  
ہارت نے آگے بڑھ کر اُس کی سائیڈ لی تو سکندر صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

”کوئی بھی اتنی بڑی بات یونہی ہی نہیں بول سکتا اور تم چپ رہو میں پوچھ رہا ہوں نا“، اُس کی بات سنتے ہی انہوں نے چپ رہنے کا کہا اور نور کا بازو پکڑتے اُسے اپنے سامنے کھڑا کیا جس کی وجہ سے اُس کا دوپٹہ سر کر سر سے کندھے پر آگیا۔

”کیا پوچھ رہا ہوں میں یہ لڑکا سچ کہہ رہا ہے یا نہیں؟“ اُس کے بازو کو دبوچتے انہوں نے گرجتے ہوئے پوچھا تو نور نے رونا شروع کر دیا اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ انکار کرے یا اقرار۔

”میں کچھ پوچھ رہا ہوں“، سکندر صاحب نے اُس کے رونے کی پرواکیے بنا ہی چلاتے ہوئے سوال کیا تو زارون جو خاموش کھڑا نور کے اقرار کا منتظر تھا آگے بڑھا۔

”میں آپ کو بتا چکا ہوں نا اور ثبوت بھی دکھا چکا ہوں تو آپ اس پہ کیوں چلا رہے ہیں؟“

”میں تم سے بات نہیں کر رہا اس لیے خاموش رہو“، اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سکندر صاحب نے وارن کیا اور نور سے پھر سے سوال کیا۔ جس کا جواب اُس نے زبان کی بجائے ہاں میں سر

ہلایا۔

”ابو۔۔۔ م۔۔۔ میں ن۔۔۔ے خو۔۔۔ د نہی۔۔۔ ل کی۔۔۔ ا۔۔۔ س نے۔۔۔ زب۔۔۔ ر۔۔۔ د۔۔۔ س۔۔۔ س۔۔۔“، ہمت کرتے اُس نے اقرار کے بجائے اپنی صفائی دینا چاہی مگر اُس سے پہلے ہی سکندر صاحب کا ہاتھ اٹھا اور اُس کے گال پر نشان چھوڑتے اُس کے ہونٹ کو زخمی کر گیا۔

”بے شرم بے حیا، پیدا ہوتے ہی تمہارا گلا دبادیتا تو اچھا تھا“، کہنے کے ساتھ انہوں نے دونوں ہاتھ اُس کے گلے پر رکھتے دبایا تو زارون نے زور سے انہیں پیچھے دھکا دیا۔

”میں بار بار آپ سے کہہ رہا ہوں کیا سمجھ نہیں آرہی آپ کو؟“ پسٹل نکالتے اُس نے غصے سے دھاڑتے ہوئے اُس کا رخ سکندر صاحب کی طرف کرتے سب کی بولتی بند کی۔

”اب کسی نے کوئی اور بکواس کی تو میں شوٹ کر دوں گا“، نور کا ہاتھ پکڑتے اُس نے جتنی سختی سے کہا نور نے اتنی ہی بے رخی سے اُس کا ہاتھ جھٹکا۔

”حارت بھائی پلیز میری بات سنئیں، اس نے میرے ساتھ زبردستی۔۔۔“ نور نے حارت کے سامنے ہاتھ جوڑتے تو اس نے سکندر صاحب سے بھی زوردار طہانچہ اُس کے گال پر مارا۔

”زبردستی؟؟ زبردستی کوئی نکاح کر لیتا ہے کیا اور زبردستی کی تھی تو مر جاتیں پر یہاں واپس نہ آتیں“، ذلت اور غصے سے پاگل ہوتے حارت چلا یا تو زارون کی برداشت جواب دے گئی اُس نے پسٹل حارت کی طرف کرتے فائر کیا جو عالیاں کے بروقت ہاتھ مارنے پر دیوار میں جاگا۔

”یار کیا کر رہے ہو؟“ عالیاں نے زارون کے ہاتھ سے پسٹل پکڑا تو وہ حارت کو مارنے کے لیے آگے بڑھا پر اُس سے پہلے ہی عالیاں نے اُسے سنبھالا۔

”اے کہو دفع ہو جائے، میری نظروں سے دور چلی جائے۔ اب میں اس کے غلیظ وجود کو مزید اس

گھر میں برداشت نہیں کر سکتا،“، سکندر صاحب نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو نور نے حارث سے نظر ہٹا کر بے لفینی سے ان کی طرف دیکھا جو اس کے اپنے تھے۔

”توبہ توبہ کیا زمانہ آگیا، پرشکر ہے میرا بیٹا نج گیا میں تو ایسے ہی اُس کی پسند کے بجائے اسے معصوم سمجھ کر بہو بنایا کر لے جا رہی تھی پر لاکھ لاکھ شکر ہے وقت پر حقیقت کھل گئی،“، خالدہ بیگم نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تو نور نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ایک نظر حارث کو دیکھا جو منہ موڑے کھڑا تھا۔ ”بھا۔۔۔ئی۔۔۔“ نور نے ہمت کر کے پھر سے کوشش کی پر اس سے پہلے ہی اُس کی آنکھوں کے آگے اندر ہیرا آیا اور وہیں حارث کے قدموں میں ہی زمین بوس ہو گئی۔

”نور۔۔۔“، زارون نے آگے بڑھتے اُسے اٹھایا اور ہوش میں لانے کی کوشش کی تو فریحہ بیگم زارون کا دھیان نور کی طرف دیکھ کر سکندر صاحب کے قریب آئیں۔

”بھائی صاحب اب جو ہونا تھا ہو گیا اور اس لڑکی نے پتا نہیں اور کیا کیا گل کھلانے ہوں گے اس لیے میں کہتی ہوں اس لڑکے کے ساتھ دفع کر دیں تاکہ مزید بدنامی نہ ہو،“، ان کے کان سے قریب ہوتے انہوں نے سرگوشی کی تاکہ زارون کو سنائی نہ دے۔

”میں اسے یہیں دفن کر دوں گا پر اس لڑکے ساتھ کبھی نہیں بھیجوں گا،“، سکندر صاحب کے بجائے حاشر جو کمرے سے سکندر صاحب کا پستل لے کر آیا تھا اس نے اُسے زارون کی طرف کرتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی فائر کیا جو گارڈز کے پکڑنے کے باوجود زارون کے بازو میں لگا۔

”میں تم سب کا خون پی جاؤں گا،“، حاشر نے اُن سب کے ہاتھوں میں محلتے ہوئے شور چایا تو زارون نے اپنے بازو سے بہتے خون کی پرواکیے بنانو رکونزی سے اٹھایا۔ عالیان نے آگے بڑھتے مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے پر زارون کے گھورنے پر سائیڈ پر ہوا تو اس نے باہر جانے کے بجائے قدم حاشر کی جانب بڑھائے جواب اُسے گالیاں دے رہا تھا۔

”ہم، اتنے ہی الفاظ منہ سے نکالو جن کا حساب بعد میں دے سکو اور تم جانتے نہیں کہ زارون علی کیا چیز ہے وہ اس سب کا بدلہ تم لوگوں سے لے کر رہے گا اور ہی بات نور کو یہاں سے نہ جانے دینے کی تو تم کیا تمہارا باپ بھی مجھے اسے لے جانے سے نہیں روک سکتا“، زارون نے اپنا غرور اور سختی اپنے الفاظ میں سموتے حاشر کو دھمکی دی اور تکلیف کے باوجود بھی وہ نور کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھا پر پھر سے رک کر پلٹا۔

”ویسے مجھے کافی افسوس ہوا، تم لوگوں کو نور کی بات سن لینی چاہیے تھی کیوں کہ وہ تم سب کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ میں نے نکاح اُس کی مرضی کے بغیر گن پوائنٹ پر کیا تھا اور اس میں نور کا کوئی قصور نہیں تھا اور نہ ہی وہ مجھے جانتی تھی یہ تو میری ضد تھی جو میں نے ہر حال میں پوری کی۔ میں اُس کا اپنا نہیں تھا پر تم لوگ تو اس کے اپنے تھے نا؟ تو کیوں نہیں سُنی اس کی بات؟ کیا اپنی تربیت پر اتنی ہی بے اعتباری تھی یا غیرت نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی؟“، زارون نے سچ بتاتے نور کے کردار کو سب کی نظر وہ میں پاک کرنے کی کوشش کی اور مزید کوئی بات کیے بغیر سب کو ساکت چھوڑ کر اسے لیے باہر نکل گیا تو عالیان نے گارڈز کو اشارہ کرتے سب کو سنبھالنے کا کہتے خود بھی اُس کے پیچھے ہی باہر کی جانب قدم بڑھائے۔



زارون نور کو لے کر پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا تو عالیان نے آگے بیٹھتے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور گیٹ سے باہر نکالتے ہسپتال کی طرف بڑھائی۔

”تم ٹھیک ہونا؟“ گاڑی کی اسپیڈ بڑھاتے اُس نے زارون سے پوچھا جو سر پیچھے سیٹ کی بیک سے لگا چکا تھا۔

”ٹھیک ہوں بس جلدی کرو نور کی طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی“، اُس کی سانس اکھڑتی دیکھ کر زارون نے فکرمندی سے کہا تو عالیان نے اسپیڈ مزید بڑھائی اور گاڑی سنبھالتے ساتھ احمد (جو ڈاکٹر

ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا دوست بھی تھا) کو کال کر کے ساری بات بتاتے تمام انتظام کرنے کا کہہ دیا۔

اگلے دس منٹ میں وہ ہسپتال پہنچے تو احمد نے تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے ان کے آتے ہی اُس نے نور کو ڈاکٹر عائشہ کے سپرد کرتے خود زارون کی جانب بڑھا جواب مسلسل خون بہنے کی وجہ سے بے ہوش ہو چکا تھا۔



گولی نکالنے کے دو گھنٹے بعد زارون کو ہوش آیا تو اُس نے پہلا سوال نور کے متعلق کیا۔

”وہ ٹھیک ہے۔ نرس بریک ڈاؤن ہوا ہے جس کی وجہ سے ابھی تک ہوش نہیں آیا، ڈاکٹر کو شش کر رہے ہیں، ان شاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائے گی“، عالیان جو پچھلے دو گھنٹے سے گھن چکر بنا کبھی نور کو دیکھتا کبھی زارون کو، اب زارون کے ہوش میں آتے ہی اُس نے شکر ادا کیا کہ دونوں میں سے ایک تو ٹھیک ہے۔

”مجھے نور کے پاس جانا ہے“، زارون نے ہاتھ میں لگی ڈرپ کھینچ کر اُتاری اور اٹھ کر باہر کی طرف بڑھا تو عالیان نے اپنا سر پکڑا۔

”زارون رک جاؤ کیا ہو گیا ہے یار، ڈاکٹر نے تمہیں ریسٹ کرنے کا کہا ہے“۔

”بھاڑ میں گیا ریسٹ مجھے نور کے پاس جانا ہے بس“، زارون نے چکر آنے کے باوجود دوسرا جانب بڑھتے ہوئے کہا تو عالیان نے اُس کے پیچھے آتے کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں نور کو رکھا گیا تھا۔

”نور۔۔۔“ کمرے میں داخل ہوتے اُس نے بیڈ کے قریب جاتے اُسے پکارا جو ابھی تک ہوش خرد سے بیگانہ تھی۔

”سر پلیز آپ پیشند کو ڈسٹرپ مت کریں۔ وہ پہلے ہی کافی اسٹریس میں ہیں“، عالیان کے

ساتھ نرس نے اندر آتے زارون کو منع کیا۔

”ڈاکٹر کہاں ہیں؟“ زارون نے جواب دینے کے بجائے پوچھا تو اُس نے ساتھ والے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو زارون عالیان کو وہاں رکنے کا کہتے خود ڈاکٹر کے کمرے کی جانب بڑھاتا کہ نور کی کنڈیشن کے متعلق پوچھ سکے۔



زارون کے نور کو لے جانے کے کچھ دیر بعد اُس کے تمام گارڈز بھی چلے گئے تو فریجہ بیگم نے تمام لڑکیوں کو وہاں سے جانے کا کہا اور ساتھ قاری صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتے انہیں فارغ کیا اور اب لاڈنخ میں بس سب بڑے ہی بیٹھے تھے جو سب ہی اپنی اپنی جگہ خاموش تھے تب ہی سب سے پہلے خالدہ بیگم نے جنید کے مسکرا نے پر اُسے گھورا جو اس سب ڈرامے پر اور اپنی جان بخشی پر کافی خوش لگ رہا تھا ورنہ تو جیسے خالدہ بیگم نے اُسے فستمیں دیں تھی وہ آج نور سے نکاح کر، ہی لیتا۔

”بھائی صاحب ویسے نور نے اچھا نہیں کیا اگر کوئی اور پسند تھا تو بتا دیتی میں خالدہ تھی ظاہری بات ہے اُس کی پسند کو ترجیح دیتی نہ کہ اپنے بیٹے کو، خالدہ بیگم نے اپھے بننے کی بھرپور کوشش کی۔

”میں معافی چاہتا ہوں آپ لوگوں سے اور ایک گزارش ہے کہ جتنے بھی لوگ یہاں موجود ہیں پلیز یہ بات یہاں سے باہر نہ نکلے،“ سکندر صاحب نے ہاتھ جوڑے سب سے درخواست کی تو سلیم صاحب (جونور کی جنید اور خالدہ بیگم سے جان بخشی پر جہاں خوش تھے وہاں زارون کے اس طرح نور کو لے جانے اور نکاح کا بتا کر سب کی نظر وہ میں گرانے پر تھوڑے پریشان بھی) نے آگے بڑھ کر اُن کے ہاتھ پکڑے۔

”ایسا مت کہو سکندر، نور اگر تمہاری بیٹی ہے تو ہماری بھی ہے اور تم نے سنا نہیں اُس لڑکے نے کیا کہا تھا کہ اُس نے اپنی ضد کے لیے زبردستی نور سے یہ سب کروایا،“ اُن کے قریب بیٹھتے انہوں نے یاد

دہانی کروائی تو سکندر صاحب نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا جہاں کافی دیر سے وہ درد محسوس کر رہے تھے۔ ”بکواس کر رہا تھا وہ لڑکا سب کچھ کرنے کے بعد جاتے جاتے نور کو ہماری نظر وہ میں نیک سیرت بنانا چاہتا تھا حالانکہ میں نے خود نور کو لکھنی ہی بار برات دیر دیری تک کسی کو میسح کرتے اور بات کرتے دیکھا تھا جس کے بارے میں کتنی بار میں نے حارث کو بھی بتایا پر اس کی انکھوں پر تو ہم پر اعتبار کی پڑی بندھی تھی اور بھائی صاحب میں بتا رہی ہوں یہ چکر اب سے نہیں بلکہ بہت دیر سے چل رہا تھا اور زبردستی کر رہا تھا تو مر جاتی، نکاح کے لیے ہاں کیوں کی اور اگر منہ کالا کروا ہی آئی تھی تو گھر میں تو کسی کو بتا دیتی تاکہ ہم پہلے ہی اُسے اُس لڑکے ساتھ دفع کر دیتے یوں ہمارا سارے خاندان کے سامنے تماشا تونہ بنتا، فریجہ بیگم نے سلیم صاحب کی بات سنتے ہی سکندر صاحب کے نزم پڑنے کے ڈر سے جلدی جلدی سب کے سامنے نور کا راز فاش کرتے مزید جلتی پر تیل چھپڑ کا۔

”اللہ توبہ کیا زمانہ آگیا اور فریجہ اگر تمہیں ایسی کسی بات کا پتا تھا تو تمہیں سکندر بھائی کو بتانا چاہیے تھا،“ خالدہ بیگم نے کانوں کو ہاتھ لگاتے مشورہ دیا۔

”میں بتانا چاہتی تھی پروہ منہوس تو پیدا ہوتے ہی بھائی کے دل سے اُتر گئی تھی میں نے سوچا چلو حارث خود ہی دیکھ لے گا اسی لیے بھائی کو نہیں بتایا،“ اپنے آپ کو ساری بات سے بری کرتے انہوں نے سارا الزام حارث کے سر تھوپا جوا بھی تک بے یقینی کی سی کیفیت میں تھا۔ زارون کی بات بار بار اُس کے دماغ میں آرہی تھی کہ اُس نے زبردستی نور سے سب کروا یا پر اُس وقت فریجہ بیگم کی پچھلے کچھ ہفتوں سے بتائی گئی نور کے متعلق فضول باتیں اور ایک دم سے نکاح کا سُن کر اُسے غصہ آگیا پر اب وہ غصہ دکھ اور پچھتاوے میں بدل چکا تھا تب ہی اُس نے کسی کی بھی بات کا جواب دیے بغیر اپنے کمرے کا رخ کیا۔

”آپ کو حارث کے بجائے مجھے بتانا چاہیے تھا تاکہ میں اُسی وقت اُس کا گلا دبادیتا،“ حاشر جو

ہمیشہ سے ہی جلد باز اور غصے کا تیز تھا اُس نے فریجہ بیگم کی بات پر مزید بھڑکتے ہوئے کہا تو سلیم صاحب نے سکندر صاحب کی طبیعت کے پیش نظر اسے منع کیا جواب اپنے دل پر ہاتھ رکھے آنکھیں بند کر چکے تھے۔

”سکندر، سکندر ہوش میں آؤ،“ سلیم صاحب اُن کو بے جان ہوتا دیکھ کر چلا گئے تو حاشر نے بھی جلدی سے انہیں دیکھا اور ان کے ٹھنڈے پڑتے جسم پر پریشان ہوتے اُس نے جلدی سے جنید کی مدد سے انہیں اٹھاتے ہوئے گاڑی میں ڈالا تاکہ ہسپتال لے جاسکیں۔



زارون ابھی ڈاکٹر سے نور کی کنڈیشن کے بارے میں پوچھ رہا تھا جب عالیان نے کمرے میں آ کر نور کے ہوش میں آنے کا بتاتے ڈاکٹر کو آنے کا کہا تو زارون بھی شکر ادا کرتے ڈاکٹر کے ساتھ ہی اٹھ کر کمرے کی جانب بڑھا۔ جہاں نور اب ہوش میں آنے کے باوجود بھی گم صمی لیٹی چھت کو گھورتے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اُسے یہاں کون لا یا اور اُس کے بے ہوش ہونے کے بعد کیا ہوا؟

”کیسا محسوس کر رہی ہیں اب آپ؟“ ڈاکٹر نے اُس کے قریب آتے ہوئے پوچھا تو نور نے جواب دینے کے بجائے چھت سے نظریں ہٹا کر ڈاکٹر کو دیکھا پر زبان سے کچھ نہیں بولی تو زارون نے آگے بڑھنا چاہا پر عالیان نے ہاتھ پکڑتے نفی میں سر ہلایا۔

”کیسا محسوس کر رہی ہیں اب آپ؟ کہیں درد یا کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتائیں،“ ڈاکٹر نے نرمی سے ہلکی سے مسکراہٹ چہرے پر سجائتے ہوئے سوال کیا تو نور نے سامنے کھڑے عالیان اور زارون کو دیکھتے نفی میں سر ہلایا کیوں کہ وہ سمجھ چکی تھی کہ یہاں اسے اس کے بھائی یا ابو نہیں بلکہ یہ شخص لا یا ہے جس نے کچھ ہی پل میں اُس کی زندگی بر باد کر دی تھی۔

”کہیں درد نہیں،“ ضبط کے باوجود بھی جواب دیتے آنسو اُس کی بند آنکھوں سے نکلتے گالوں پر

بہنے لگے تو ڈاکٹر جو پہلے ہی اُس کی حالت اور گالوں پر انگلیوں کے نشان اور ہونٹ پر زخم دیکھ کر معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی اب نور کو روتاب دیکھ کر اُس کا ضبط جواب دے گیا۔

”یہ سب آپ نے کیا ہے اس کے ساتھ؟“ اب کی بار اُس نے نور کے بجائے زارون اور عالیان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”آپ اپنے کام سے کام رکھیں،“ زارون جو پہلے ہی نور کی حالت سے پریشان تھا ڈاکٹر کے سوال پر بھڑکا۔

”اپنے کام سے کام ہی رکھ رہی ہوں تب ہی پوچھ رہی ہوں کہ یہ سب آپ نے کیا ہے اس کے ساتھ؟“ عائشہ کو نور کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ اُس کے ساتھ کچھ غلط ہوا ہے پر کیا؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی اور نہ ہی ڈاکٹر احمد کی وجہ سے کچھ پوچھ رہی تھی پر اب نور کے لہجے کی لڑکھڑاہٹ اور آنکھوں میں بے بسی دیکھ کر اُس سے رکا نہیں گیا۔

”لگتا ہے اس کا دماغ سیٹ نہیں جو مجھ سے سوال پوچھنے کی جرأت کر رہی ہے،“ زارون نے غصے سے کہا تو عالیان نے اُسے روکا۔

”سن بھالو خود کو پا گل ہو گئے ہو کیا؟“ آنکھیں نکالتے اُس نے اُسے مزید کچھ کہنے سے روکا اور خود ڈاکٹر عائشہ کو نور کی طرف سے مطمئن کرنے لگا جو زارون کی بد تمیزی پر اب نس کو اشارہ کرتے کمرے سے باہر نکل چکی تھیں۔ عالیان نے بھی ایک نظر زارون کو دیکھتے اُن کے پیچھے ہی باہر کا رخ کیا تاکہ بات سن بھال سکے تو زارون نے کمرا خالی دیکھ کر نور کی طرف قدم بڑھائے جو ابھی بھی آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں۔

”میں نے کہا تھا کہ تم روئے ہوئے خوبصورت لگتی ہو پر یہ نہیں کہا تھا کہ بس ہر وقت روئی ہی رہنا،“ اُس کے قریب آتے نیچے جھک کر اُس نے کہا اور ساتھ ہی اُس کے گالوں پر سے آنسو صاف

کرتے اُس کے چہرے پر جھکا تو نور (جو گھر میں زارون کے آنے پر اُس کی آواز اور آنکھوں سے پہچان چکی تھی باقی شک اُس کا زارون کے نکاح نامہ دکھانے نے نکال دیا) نے ہاتھ میں لگی ڈرپ کی پرواکے بناء آنکھیں کھولتے پورے زور سے اُس کے سینے پر ہاتھ رکھتے پچھے کیا۔

”خبردار میرے قریب آئے تو، میں تمہاری جان لے لوں گی“، غصے، نفرت اور اپنی بے بسی پر چیختے ہوئے اُس نے زارون کو وارن کیا۔

”اوے کے نہیں آتا قریب بس اپنا خون مت جلاوے“، اُس کی طبیعت کا سوچتے زارون نے کوئی بحث و مباحثہ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسے تسلی دیتے پچھے ہٹا پر اُس کے ہاتھ سے نکلنے خون پر اُس کا ہاتھ پکڑتے دیکھنے لگا۔

”میں نے کہا ناجھ سے دور رہو سمجھ نہیں آتی“، اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے کھینختے اُس نے پھر سے اپنی بات دوہرائی اور ہاتھ میں لگی سوئی کوبے دردی سے نکال کر باہر پھینکا تو زارون نے اپنے غصے کو ضبط کرتے پاس پڑی روئی اٹھا کر اُس کے ہاتھ پر نکلنے خون پر رکھی۔

”بہت بد تمیزی کر لی تم نے، اب اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو اچھا نہیں ہو گا اور جو تم کہو گی میں وہی کروں گا بس دوبارہ خود کو کبھی بھی میرے لیے تکلیف مت دینا“، آج پہلی بار زارون کی آنکھوں میں غصے کی جگہ بے بسی اور التجاہی جسے نور نے نظر انداز کرتے اُس کا ہاتھ جھٹک کر روئی کو غصے سے دور پھینکا جس پر زارون نے بس ایک نظر اسے دیکھا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔



آپ کے پیشمند کو ہارت ایک آیا ہے پر اتنا خطرناک نہیں تھا اس لیے کچھ دیر میں ہوش آجائے گا، ڈاکٹر نے سکندر صاحب کو چیک کرنے کے بعد باہر آتے حاشر کو اپنے قریب آتا دیکھ کر بتایا۔

”ابو ٹھیک ہیں نا؟“، ڈاکٹر کے بتانے کے باوجود اُس نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

”جی جی میں نے بتایا کہ اب وہ ٹھیک ہیں پر آگے آپ کو احتیاط کرنی ہو گی کہ وہ کوئی پریشانی یا سڑ لیں نہ لیں ورنہ آگے کوئی بڑا مسئلہ ہو سکتا ہے“، حاشر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ڈاکٹر نے اُسے مطمئن کرتے آنے والے وقت کے لیے کچھ ہدایات دیں اور وہاں سے چلا گیا۔

”کیا ہوا ابو کو؟“، حارث جو کمرے میں جاتے ہی دروازہ بند کر کے بیٹھ گیا تھا اب بار بار سارہ کے آواز میں دینے اور سکندر صاحب کی طبیعت کا سن کر اُس نے دروازہ کھولا تھا۔

سارہ نے اُسے سکندر صاحب کی طبیعت کی خرابی اور انہیں ہسپتال لے جانے کے بارے میں بتایا تو حارث جلدی سے گاڑی لے کر جنید سے ہسپتال کا نام پوچھتے (جو حاشر کے ساتھ گیا تھا) یہاں آیا تھا اور اب کار یڈور میں داخل ہوتے ہی اُس نے حاشر کو ڈاکٹر سے بات کرتے دیکھ لیا تھا اب، ہی اُس کی طرف آتے اُس نے سوال کیا۔

”ہاں ٹھیک ہیں اب، اٹلیک آیا ہے پر اب خطرے سے باہر ہیں“، حارث کو بدھواس سادیکھ کر اُس نے تسلی دی اور وہاں موجود چیر کی طرف اشارہ کرتے اُسے لے کر وہاں بیٹھا اور باقی تمام حالات کے متعلق بتانے لگا۔



عالیان کے سمجھانے اور احمد کے بات کرنے پر عائشہ کچھ مطمئن ہوئی تو اُس نے نور کو کچھ ضروری میڈیسین کے ساتھ ریسٹ کرنے کی ہدایت دیتے ڈسپارچ کر دیا پر احمد نے زارون کو بلڈ زیادہ بہنے اور کمزوری کی وجہ سے ابھی ڈسپارچ کرنے سے منع کر دیا پر وہ ضد کر کے اُس سے کچھ پین کلر لکھوانے کے بعد نور کو لے کر اپارٹمنٹ میں آگیا۔ جہاں عالیان نے انہیں چھوڑنے کے بعد اپنے کمرے سے کچھ ضروری سامان اٹھایا اور زارون کو دوسرا اپارٹمنٹ میں جانے کا بتاتے اُس کے منع کرنے کے باوجود بھی وہاں رکنے سے انکار کیا اور صحیح ملنے کا کہہ کر نور کا خیال رکھنے اور اُسے نرمی سے سمجھانے کی تاکید کرتا

وہاں سے چلا گیا۔

”بیٹھ جاؤ یا ساری رات کھڑے رہنے کا ہی ارادہ ہے؟“ کمرے میں آتے اُس نے نور کو ابھی تک کھڑا دیکھ کر کہا تو اُس نے زارون کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور ایک بار پھر سے اپنے کپڑوں کو دیکھا جن پر لگے خون کے داغ اُسے مسلسل پریشان کرتے اُن کے متعلق کئی سوال پیدا کر رہے تھے۔ جسے وہ زارون سے پوچھنا چاہتی تھی پر اُس کے بازو پر بندھی پٹی پر نظر پڑتے کچھ سوچتے ہوئے صوف پر جا بیٹھی۔

”میں تمہارے لیے کھانا لے کر آتا ہوں جب تک تم یہ کپڑے چینچ کرلو، اپنا ایک ٹراوَز را اور ٹی شرٹ الماری سے نکال کر بیٹڈ پر رکھتے زارون نے اُس سے کہا جس کا دھیان ابھی بھی اُس کے بازو پر بندھی پٹی پر تھا۔

”یہ خون کہاں سے لگا میرے کپڑوں پہ؟ اور میرے بے ہوش ہونے کے بعد کیا ہوا تھا؟“ نور (جسے زارون کو گولی لگنے کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں پتا تھا اور نہ ہی یہ کہ اُس کے بے ہوش ہونے کے بعد وہاں کیا ہوا اور وہ زارون کے ساتھ کیسے آئی) نے سامنے پڑے ٹراوَز شرٹ کو ایک نظر دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے زارون سے پوچھا جو کمرے سے باہر جانے لگا تھا پر اُس کی آواز پر رک گیا۔

”میرے بازو سے لگا ہے وہ بھی تمہارے بھائی کی مہربانی سے“، لاپرواں سے بتاتے وہ واپس آ کر اُس کے قریب بیٹھا تو نور نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”تمہارے چھوٹے بھائی نے غصے میں آ کر گولی چلائی جو خوش قسمتی یا بد قسمتی سے میرے بازو میں لگی اور میں وہاں لڑنے نہیں گیا تھا بس سب کو نکاح کا بتانے گیا تھا تاکہ وہ تمہارا کسی اور سے نکاح نہ کریں پر لگتا ہے تمہارے گھروالوں کو لڑنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے“، اس کی نظروں میں سوال دیکھ کر اُس نے خود ہی بتایا تو نور نے بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو میرے بھائی ایسے نہیں ہیں۔ جنگلی تو تم خود ہو جو سب کو اپنا غلام سمجھ کر ان پر اپنا حکم چلاتے ہو اور اگر کوئی انکار کر دے تو وحشی بن کر ان پر ظلم و ستم کر کے اپنی بات زبردستی منوالیتے ہو۔ مجھے پتا ہے تم مجھے میرے گھر سے بھی زبردستی ہی لائے ہو گے اور بہت اچھا ہوتا اگر وہ گولی تمہارے اس دماغ میں لگ جاتی جس میں بس اپنی انا کا غرور بھرا ہے، نور نے جتنی نفرت سے کہا زارون نے اُس کی بات سنتے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔

”بہت اچھی سوچ ہے تمہاری اور تمہارے لیے تو میں یہاں کیا، کہیں بھی گولی کھا سکتا ہوں،“، زارون نے اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے جتنے سکون سے کہا نور کا دل کیا کہ اُس کا منہ توڑ دے جو اُس کی زندگی تباہ کرنے کے بعد بھی اتنا پر سکون تھا۔

”تم مجھے میرے گھر سے زبردستی لائے ہونا؟“، اس کی باتوں کودفع کرتے نور نے اپنے مطلب کی بات پوچھی کیوں کہ اُس سے ابھی بھی یقین تھا کہ زارون اُس سے زبردستی لایا ہوگا اور اُس کے گھروالوں نے ضرور روکا ہوگا۔

”نہیں، تمہارے ابو نے خود کہا تھا اور میں تمہیں اب وہاں اُن بے حس لوگوں کے نیچ چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا،“، زارون نے صاف الفاظ میں اُس کے بے ہوش ہونے کے بعد ہونے والی تمام باتیں بتائیں تو نور کی آخری امید بھی ٹوٹ گئی اُس نے تمام بات سننے کے بعد کچھ کہے بغیر اپنے آنسو چھپانے کے لیے رخ پھیرا تو زارون کو اُس نازک سی لڑکی کی تکلیف پر دکھا جس میں کچھ ہاتھ اُس کا اپنا بھی تھا۔

”میں کھانا لے کر آتا ہوں تب تک یہ کپڑے بدل لو،“، اسے روتا دیکھ کر زارون نے منع کرنے کے بجائے اُسے اکیلا چھوڑا تاکہ اپنے اندر کا غبار نکال سکے اور خود اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا تو اُس کے جاتے ہی نور نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اُس سے کسی کے رویہ سے اتنا دکھ نہیں ہوا تھا جتنا حارت کے تھپڑا اور اُس کی بے رخی پر ہوا۔

”بھائی آپ پلیز میری بات سن لیتے پھر بے شک مجھے گھر سے نکال دیتے۔ میں کبھی بھی آپ سے شکوہ نہ کرتی۔ ابو اور حاشر بھائی پر تو پہلے بھی مجھے کبھی بھی مان نہیں تھا اور نہ کوئی امید پر آپ تو میرے اپنے تھے نا؟ کیوں آپ نے اپنی بہن کو صفائی دینے کا موقع نہیں دیا؟ کیوں آپ نے اپنی گڑیا کو بے گناہ ہوتے ہوئے بھی سزا سنادی؟ کیا آپ کو گلتا تھا کہ میں ایسا کر سکتی ہوں؟“ نور نے حارث کو سوچتے شکوہ کیا اور ساتھ ہی کئی آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکے جسے اپنے ہاتھ کی پشت سے بے دردی سے رکھتے اُس نے خود کو مزید روئے سے روکا۔

”میں تمہاری زندگی جہنم بنادوں گی مسٹرز ارون علی جیسے تم نے مجھے بر باد کیا، ذلیل کیا مجھے اپنے ہی باپ اور بھائیوں کی نظروں میں،“ باہر اونچن کچن میں زارون کو ایک ہاتھ سے کھانا گرم کرتا دیکھ کر نور نے خود کلامی کی اور کمرے میں پڑی تمام چیزوں کو ایک نظر دیکھ کر اُس نے اپنے دماغ میں چلتے ارادے کی تکمیل کے لیے زارون پر نظر رکھتے (جس کی پشت اب اُس کی طرف تھی) انٹھ کر آہستگی سے کمرے کا دروازہ لاک کیا۔

زارون نے اوون میں چاول گرم کرنے کے لیے رکھے اور پلیٹین نکال کر تمام چیزیں ٹرے میں رکھ کر جیسے ہی مڑا تو سامنے اپنے کمرے کا دروازہ بند دیکھ کر اُس کے چہرے کارنگ فق ہوا۔

”نور؟“ ٹرے والیس کا ونڈ پر رکھتے وہ جلدی سے کمرے کی جانب بڑھا پر یہ سوچ کے کہ شاید کپڑے تبدیل کر رہی ہو اُس نے خود کو دروازے پر دستک دینے سے روکا پر کچھ سیکنڈز انتظار کرنے اور اندر کی خاموشی پر اسے کچھ غیر معمولی سا احساس ہوا جس کے تحت اُس نے ناب پر ہاتھ رکھتے گھما یا تو وہ اندر سے لاک تھا۔

”نور کیا کر رہی ہو؟ دروازہ کھولو،“ دروازے پر ہاتھ مارتے اُس نے آواز لگائی پر دوسرا طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اُس نے مزید انتظار کرنے کے بجائے جلدی سے کمرے کی چاپی ڈھونڈی جو

بدقتی سے اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔

”نور میں کہہ رہا ہوں دروازہ کھولو ورنہ اچھا نہیں ہوگا“، زارون نے آواز لگاتے مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے دروازے کو دھکا مارا تاکہ وہ ڈر کر دروازہ کھول دے پر ابھی بھی اُس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اُس کو بے چینی ہوتی اور اندر کسی چیز کے گرنے کی آواز پر اُس نے اپنے زخم کی پروا کیے بغیر دروازے کو مزید دھکے مارے اور اندر داخل ہوتے ہی سامنے کا منظر دیکھ کر اُس کے حواس جواب دے گئے۔

”نور...“ اُس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس سے سنبھالا جو خود کو سکھے سے لٹکا چکی تھی۔

”یہ کیا کیا تم نے؟“ اس کو یوں سکھے سے لٹک دیکھ کر زارون کو اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہوتی پھر بھی خود کو سنبھالتے ہوئے اُس نے ہاتھ اوپر کر کے اس کو نیچے اتار کر دوپٹہ اُس کے گلے سے نکلا اور اُسے بیڈ پر لٹاتے خود جلدی سے پانی لینے چلا گیا۔

”پانی پیو“، اُس کے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر سر کو تھوڑا اوپر کرتے زارون نے گلاس اُس کے لبوں سے لگایا تو نور نے با مشکل دو گھونٹ گلے سے اُتارے اور اپنے اکھڑتے سانس کو بحال کرنے کے لیے زور زور سے سانس لینے لگی۔ زارون نے اُسے واپس لٹاتے اپنی سانس دینے کے لیے اپنے ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھے تو نور چاہتے ہوئے بھی اُسے خود سے الگ نہیں کر پائی۔

”اب ٹھیک ہو؟“ کچھ سیکنڈز بعد چہرہ اوپر کرتے زارون نے اُس کی سرخ آنکھوں میں دیکھا جن میں گلاد بننے کی وجہ سے خون اُتر آیا تھا۔

”ہم“، نور جس کی سانس اب کچھ بہتر ہو چکی تھی پر گلے میں دوپٹہ پھرنے سے ہونے والے زخم اور سانس کی نالیوں میں آنے والی تیگی سے ہونے والی تکلیف کو برداشت کرتے اُس نے زارون کی کالی آنکھوں کو آج پہلی بار نم دیکھا۔

”ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے لہجے اور الفاظ میں لڑکھڑاہٹ آچکی تھی۔

”نہیں، ٹھیک ہوں میں اب“، اُس سے نظریں ملائے بغیر جواب دیتے نور نے ایک بار سنگھے کی طرف دیکھا جہاں اُس کا دوپٹہ ابھی تک لٹک رہا تھا۔

”دوبارہ خود کو تکلیف مت دینا اور اگر پھر بھی دل کرے تو مجھے دے دینا کیوں کہ تمہارا مجرم میں ہوں؟“، اُس کے اوپر جھکے ہی ایک آنسوآہستگی سے اُس کی آنکھ سے نکلا تو نور نے اپنی تکلیف کو بھولتے حیرت سے اُس شخص کو دیکھا جو اُس کی تکلیف پر رور رہا تھا۔

”میں ڈاکٹر کو بُلا تا ہوں“، نور کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اُس نے نظریں پھیریں اور کہتے ہوئے اپنا موبائل اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

”تم جتنے مرضی اچھے بن جاؤ پر میں تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کروں گی مسٹرز ارون علی اور ہمیشہ خود کو ایسے ہی تکلیف دوں گی کیوں کہ میں جانتی ہوں تمہیں سب سے زیادہ درد مجھے تکلیف میں دیکھ کر ہوتا ہے، اپنے گلے پر آئے زخم پر ہاتھ پھیرتے نور نے اپنے دل میں آنے والے نرم جذبات کو کھلتے خود کلامی کی۔



حاشا اور حارت کچھ گھنٹوں بعد سکندر صاحب کو گھر لے آئے تھے جواب سکون آور دوائیوں کے زیر اثر سوچکے تھے۔

”کیا کہا ڈاکٹر نے کیا ہوا تھا بھائی صاحب کو؟“ فریجہ بیگم نے اُن کے کمرے سے باہر آتے حارت سے پوچھا جو کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تھا۔

”ہارت اٹیک آیا تھا“، مختصر سا جواب دیتے وہ پھر سے مرڑا۔

”ہارت اٹیک؟ اللہ اگر میرے بھائی کو کچھ ہو جاتا تو میں نور کا گلادبادیتی جس کی وجہ سے آج

“—

”پھو پھو پلیز آپ پہلے ہی سب کے سامنے نور کے بارے میں بہت کچھ بول چکی ہیں، لیکن اب میں مزید اپنی بہن کے خلاف ایک لفظ بھی برداشت نہیں کروں گا“، حارت نے انہیں مزید کچھ بولنے کے لیے منہ کھوتا دیکھ کر سختی سے ٹوکا تو فریحہ بیگم نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

”مطلوب تم ابھی بھی اُس بدکردار کی طرف داری کر رہے ہو؟ جس کی وجہ سے ہماری پورے خاندان میں بدنامی ہوئی“، حارت کا نور کے لیے بونا فریحہ بیگم کو ہضم نہ ہوا۔

”میری بہن بدکردار نہیں ہے اس لیے دوبارہ یہ لفظ منہ سے نکالنے سے پہلے ہزار بار سوچ لیجیے گا کہ آپ کی بیٹی کا نام اب میرے نام کے ساتھ جڑچکا ہے، جو آپ کی ایک غلطی کی وجہ سے میں اپنے نام سے الگ بھی کر سکتا ہوں“، انگلی انٹھا کر انہیں دھمکی دیتے وہ فریحہ بیگم کو ہر کا بکا کھڑا چھوڑ کر لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

احمد، زارون کے فون کرنے کے دس منٹ بعد ہی اُس کے اپارٹمنٹ پہنچ چکا تھا اور اب نور کو چیک کر کے اُس نے کچھ دو ایساں لکھ کر دیں۔

”یہ ٹیوب بھی میں نے لکھ دی ہے گلے کے زخم پہ لگاؤ گے تو جلد بہتر ہو جائے گا“، زارون کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر احمد نے نور کی حالت دیکھنے کے بعد بھی اُسے کوئی بات کہنا مناسب نہیں سمجھی۔

”ٹھیک ہے میں منگوالوں گا اور بیٹھو تم میں چائے بنائے کر لاتا ہوں“، باہر لاوٹھ میں آتے اُس نے احمد سے کہا جس کا دھیان اب اُس کے بازو پر لگے خون پر تھا۔

”یہ کیا کیا تم نے؟ مجھے لگ رہا ہے اسٹپچر سے خون نکل رہا ہے“، اُس کی بات کا جواب دینے کے  
بجائے احمد نے اُس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

”خیر ہے میری، کچھ نہیں ہوتا تم بتاؤ چائے پیو گے یا جوس؟“ اُس کا ہاتھ ہٹاتے زارون نے  
لاپرواں سے کہا تو احمد نے تیوری چڑھاتے اُس کا ہاتھ پکڑتے صوفے پر بھایا۔

”خود ڈھیک ہو گے تو اُس سے سن بھالو گے نا اور اب سکون سے بیٹھ رہو مجھے دیکھنے دو کیا ہوا ہے“، احمد  
نے پی کھولتے سختی سے کہا تو زارون جوانپانابازو پیچھے کرنے لگا تھا کر گیا۔

”دیکھانا اسٹپچر سے خون نکل رہا ہے میں نہ دیکھتا تو زخم خراب ہو جانا تھا“، ڈبے میں سے روئی  
نکال کر خون صاف کرتے اُس نے نرمی سے زارون کو سمجھانا شروع کیا جو سر جھکائے بیٹھا کوئی جواب  
دینے کے بجائے بس اُس کی نصیحتیں سُن رہا تھا۔

احمد کے جانے کے بعد زارون کمرے میں آیا تو نورا بھی بھی ویسے ہی بیٹھی تھی۔

”کھانا کھالو“، ٹرے اُس کے قریب رکھتے زارون نے کہا تو اُس نے نظر انھا کر پہلے زارون اور  
پھر ٹرے میں رکھے کھانے کو دیکھا۔

”مجھے نہیں کھانا اس سے اچھا ہے تم مجھے زہر لا دو“، ٹرے کو زور سے ہاتھ مارتے وہ چلانی تو  
زارون نے اُس کی حرکت پر غصے کو کنٹرول کرتے ایک نظر فرش پر پڑے کھانے اور برتنوں کو دیکھا۔

”لادوں گاز ہر بھی، فکر نہ کرو اور دوبارہ میرے سامنے ایسی حرکت مت کرنا ورنہ میں سب لحاظ  
بھول کر تمہیں تمہاری اوقات یاد دلانے میں دری نہیں کروں گا“، اُس کے جبڑوں کو سختی سے اپنے ہاتھ میں  
دبوچتے زارون نے دھمکی دی تو نور نے رونے کے بجائے بے خوف ہو کر اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”میں ڈرتی نہیں نہ تم سے نہ ہی تمہاری ان دھمکیوں سے“، اُس کا ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹاتے  
نور نے غصے سے کہا تو زارون نے اُس کی بہادری پر قہقہہ لگایا۔

”اچھی بات ہے زارون علی کی بیوی ہو کر تم پر ڈرنا اور نازیب نہیں دیتا اور نہ ہی بزدل ہونا اس لیے دوبارہ خود کو سکھے سے لٹکانے کے بجائے مجھ سے مقابلہ کرنا اور میری ان دھمکیوں کو اتنا ہلاکامت لو میں اگر تم سے نکاح کر کے یہاں لاسکتا ہوں نا تو میرے لیے کچھ کرنا بھی زیادہ مشکل نہیں، ذمہ معنی الفاظ میں اپنی بات سمجھاتے وہ اُسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ہی نرمی سے اُس کے ہونٹوں کو چھوتے اُٹھ کر چینچ کرنے چلا گیا تو نور نے ہوش میں آتے جلدی سے بیڈ سے اُٹھ کر صوفے کا رخ کیا کیوں کہ اس بد تیز انسان سے کسی بھی چیز کی توقع کی جا سکتی تھی۔



اگلے دن حارت نے سب رشتہ داروں کو سکندر صاحب کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے شادی کینسل ہونے کا بتایا۔

”کتنے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں انسان کو ایک سچ چھپانے کے لیے، خالدہ بیگم جو صبح ہی سکندر صاحب کا پوچھنے آئی تھیں انہوں نے حارت کو پچھلے ایک گھنٹے سے فون پر لگے دیکھ کر افسوس سے کہا۔ ”بس کیا کریں اپنی عزت بچانے کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے پرجس کے ہاتھوں یہ سب ہوا ہو اُسے پرواہی نہیں ہوتی، فریجہ بیگم جو سکندر صاحب کے لیے سوپ بنایا کر لائی تھیں انہوں نے حارت کو وہاں نہ پا کر جلتی پر تیل کا کام کیا۔

”ہاں بس کیا کریں، ہم بھی کل سے رشتہ داروں کو جواب دے دے کر تھک چکے ہیں پر لوگ ہیں کہ بار بار پوچھ کر دماغ خراب کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ لڑکے نے انکار کیا ہے ورنہ لڑکی تو اتنی اچھی تھی، پر میں نے تو چپ کا تالا لگالیا ہے منہ پہ کہ کیا بتاؤں کہ لڑکی کتنی اچھی تھی، سر جھٹکتے خالدہ بیگم نے طنزیہ انداز میں بات کی تو سکندر صاحب نے سر جھکا لیا۔

”حالہ پلیز ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ اُن کے سامنے ایسی باتیں کرنے سے گریز

کریں، حاشر جو بھی ابھی کمرے میں آیا تھا اُس نے خالدہ بیگم کی آخری بات سنتے ہی منع کیا۔

”ہاں بیٹا میں کہاں ایسی باتیں کرنا چاہتی ہوں بھلا وہ تو بس نور کی حرکت پر دل ہی اتنا دکھا ہے کہ خود بخود منہ سے نکل جاتی ہیں،“ حاشر کی بات سنتے ہی انہوں نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔

”پھر بھی کوشش کریں کہ ابو کے سامنے اس بارے میں کوئی بات نہ کریں۔“

”کیوں نہ کریں؟ جب اپنے خون نے عزت کی پروانہیں کی تو یہ سب بھی کیوں کریں اور ان کا بولنے کا حق ہے بولنے دو،“ خالدہ بیگم کے بجائے سکندر صاحب جو کب سے خالدہ بیگم کے طنز سن رہے تھے انہوں نے فریجہ بیگم کا ہاتھ روکتے (جو انہیں سوب پلا رہی تھیں) کہا۔

”نہیں، بھائی صاحب کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ ہم بھلا کیوں باتیں کریں گے اللہ معاف کرے ہم بھی بیٹی والے ہیں،“ سکندر صاحب کی بات سنتے ہی خالدہ بیگم نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”کیوں کہ آپ کا حق ہے۔ ہماری وجہ سے آپ کی بدنامی ہوئی ہے،“ سکندر صاحب نے وضاحت دی۔

”یہ بات تو ٹھیک ہے آپ کی پرہم سے زیادہ جنید نے صدمہ لیا ہے وہ تو کل سے خاموش ہے نہ کچھ کھا رہا ہے نہ کسی سے بات کر رہا ہے بلس ایک ہی بات دو ہرائے جا رہا ہے کہ مجھ میں کیا کمی تھی جو نور نے ایسا کیا؟ میرا بیٹا تو قصور وار نہ ہو کر بھی سب کو یہی کہہ رہا ہے کہ میں نے خود شادی سے انکار کیا ہے۔ سارا الزام اپنے آپ پہ لے لیا میرے لعل نے،“ خالدہ بیگم نے جنید کی جھوٹی تعریفوں کے پل باندھتے آنکھوں میں مصنوعی آنسوؤں کو اپنے دو پڑھ سے رگڑا۔

”کسی کو اپنے آپ پہ کوئی الزام لینے کی ضرورت نہیں اور خالدہ آپ نے کون سی شادی کینسل کی ہے مجھے ذرا بتانا پسند کریں گی؟“ حارث جو کمرے میں آتے اُن کی بات سن چکا تھا اُس نے ما تھے پر بل ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

”مطلوب؟“ خالدہ بیگم نے کچھنا سمجھی سے حارث کی جانب دیکھا۔

”مطلوب یہ کہ آپ نے تو راتوں رات جنید کے لیے لڑکی تلاش کر بھی لی ہے اور کل اُس کی شادی ہے،“ حارث جسے عمران (ماموں کے بیٹے) سے یہ بات پتا چلی اُس نے دوڑوک خالدہ بیگم سے پوچھا تو سکندر صاحب کے ساتھ ساتھ فریحہ بیگم اور حاشر نے بھی حیرت سے خالدہ بیگم کو دیکھا جو حارث کی بات سنتے ہی کچھ گڑ بڑا گئی تھیں۔

”میں تو جواب دے رہی تھی پر سلیم نے مجھے منع کر دیا اُن کے دوست کی بیٹی ہے ملائکہ،“ خالدہ بیگم نے بات کا آغاز کیا کیوں کہ اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”وہ لوگ کافی دیر سے رشتہ دیکھ رہے تھے پر کوئی پسند نہیں آرہا تھا اور کل یہاں سے جا کر سلیم نے اُن سے بات کی تو انہوں نے خود اپنی بیٹی کی بات کر دی تو سلیم انکا رہا نہیں کر پائے اور دوسرا جنید کو اس طرح دیکھ کر مجھے خود پریشانی ہو رہی تھی تب ہی میں نے بھی یہی بہتر سمجھا۔ ویسے بھی آج نہیں تو کل ہم نے جنید کی شادی کرنی ہی تھی،“ خالدہ بیگم نے طریقے کے ساتھ تمام بات سلیم صاحب پر ڈال دی۔

”ہم بہت اچھا فیصلہ کیا آپ نے،“ حارث کو بولنے سے روکتے سکندر صاحب نے خالدہ بیگم سے کہا جواب اپنی صفائی میں کچھ بولنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھیں۔

☆☆☆

دوپھر بارہ بجے کے قریب زارون کی آنکھ موبائل کی بیپ سے کھلی۔

”اُف اتنا طامُم ہو گیا،“ موبائل پر عالیان کی اتنی ساری کالزدیکھ کر اس نے خود کلامی کی اور انٹھ کر بیٹھا تاکہ عالیان کو کال کر سکے پرسا منے صوفے پر نظر پڑتے ہی اُس کا ہاتھ ایک دم زکا۔

”نور؟“ کمبل سائیڈ پر کرتے وہ موبائل ہاتھ میں پکڑے ہی کمرے سے باہر آیا جہاں لاوَنچ میں ہی وہ اُسے صوفے پر لیٹی نظر آگئی۔

”ایک تو یہ لڑکی کسی دن میرا ہارٹ فیل کروادے گی“، اُس کے قریب جاتے اُسے سکون سے سویا دیکھ کر زارون نے سوچا اور اندر سے کمبل لا کر اُس کے اوپر دیا۔

”دیکھنے میں جتنی معصوم لگتی ہوا تھی ہو نہیں“، اس کے چہرے سے بال ہٹاتے زارون نے آہستگی سے اُس کی پیشانی کو ہونٹوں سے چھووا (جو بخار سے تپ رہی تھی) تو نور نے آنکھیں کھول دیں اور اُسے اپنے اس قدر قریب دیکھ کر ناگواری سے اپنا چہرہ سائیڈ پہ کیا۔

”اندر جا کر بیڈ پہ لیٹ جاؤ میں کچھ کھانے کے لیے باتا ہوں کھا کر میڈیں لے لینا“، اُس کی ناگواری کو محسوس کرتے ہی وہ پیچھے ہوتے ہوئے بولا۔

”مجھے تمہاری کسی بھی ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں اپنا خیال خود رکھ سکتی ہوں“، زارون کی بات سنتے ہی وہ کمبل ایک سائیڈ پر کرتے تیز بخار کی وجہ سے با مشکل اٹھ کر بیٹھی۔

”ہاں جانتا ہوں کہ تم کل سے بہت بہادر ہو گئی ہو پر اتنی ہی بہادری دکھاؤ جتنا میں برداشت کر سکوں“، اس کے اکٹرے ہوئے روئے پر زارون نے بھی اُسی کے انداز میں جواب دیا۔

”مجھے دھرم کا نہ کی ضرورت نہیں، یہ مت سمجھنا کہ میں رات کو تم سے ڈر کر صوفے پر سوئی تھی“، نور نے اُس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے آنکھوں میں بے خوف لیے کہا تو زارون کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”اچھا مطلب تم ڈری نہیں تھی؟“ زارون نے آنکھوں میں تجسس لیے پوچھا تو نور نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں کسی سے نہیں ڈرتی تم سے تو بالکل بھی نہیں اس لیے کسی بھول میں مت رہنا“، آنکھوں میں خمارت لیے اُس نے حتی الامکان اپنے الفاظ کوختی سے ادا کیا۔

”ہم او کے تم بھی کسی بھول میں مت رہنا“، اُس کی دھمکی پر زارون نے دیر کیے بنا اُسے اٹھایا

اور اس کے چیخنے کی پرواکیے بغیر اسے اسٹور میں بند کرتے باہر سوچ بورڈ پہ ہاتھ مار کر لائٹ آف کر دی۔

”اب دیکھتا ہوں کیسے نہیں ڈرتی تم“، اپنا موبائل ہاتھ میں لیے آرام سے صوف پر بیٹھتے اس نے عالیان کا نمبر ڈائل کیا اور نور کے دروازہ کھلکھلانے کی پرواکیے بناء بات کرنے لگا۔ ”دروازہ کھولو بد تیز انسان ورنہ اچھا نہیں ہوگا“، نور نے دروازے پر ہاتھ مارتے آواز لگائی تو عالیان نے شور کی آواز میں سنتے ہی زارون سے پوچھا۔

”یہ پچھے شور کیسا ہے؟“

”کون سا شور؟ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا“، مسکراتے ہوئے اس نے ایک نظر اسٹور کے بند دروازے کو دیکھا جہاں نور مسلسل ہاتھ مارتے اسے دروازہ کھولنے کا کہہ رہی تھی۔

”زیادہ بننے کی ضرورت نہیں مجھے کب سے آواز میں آرہی ہیں جیسے کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہو“، عالیان نے اندازہ لگاتے زارون سے تصدیق چاہی تو وہ ٹالتے ہوئے اس سے کراچی جانے کا پوچھنے لگا۔

”ہاں بس کچھ دیر میں نکلوں گا تم بتاؤ تم ساتھ جا رہے ہو یا نہیں؟“

”نہیں تم سب سنبھال لینا میرا جانا مشکل ہے۔ کیوں؟ یہ تم جانتے ہو“، زارون نے اس کے سوال سے پہلے ہی جواب دے دیا۔

”ہاں جانتا ہوں بس یار پلیز مزید کوئی اللہ سیدھا کام مت کرنا اور کوشش کرنا کہ بھا بھی کونزمی سے سمجھاؤ“، عالیان نے اس کی بات سنتے ہی نصیحت کی۔

”ہم ٹھیک ہے، زیادہ بھا بھی کا چمچہ بننے کی ضرورت نہیں اور پرینٹیشن کا بتاؤ کیسی تیاری ہے؟“، زارون کو اس کا بار بار نور کے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگا تب ہی اس نے ٹوکتے عالیان کا دھیان اصل بات کی طرف دلا یا جس کے لیے اس نے کال کی تھی۔

”کیا کر رہے ہو تم پلیز کھولو، نور کا مسلسل چینخ سے گلابیٹھ چکا تھاتب ہی اُس نے گھٹی ہوئی آواز میں اُسے پکارا جو بے فکری سے بیٹھا عالیان کو تمام ضروری پوائنٹس سمجھا رہا تھا۔

”یا اللہ پلیز میری مدد کر، میں دوبارہ اس جنگلی کے منہ نہیں لگوں گی، نور نے دوسری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر تھک ہار کے دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھتے اسٹور میں چھائے اندھیرے سے خوف کھاتے جھر جھری لی اور اپنے دل کو تسلی دیتے زارون کو کو سنے لگی جس نے کل سے اُس کی زندگی عذاب بنارکھی تھی۔

”hart بھائی پلیز آ جائیں مجھے ڈرگ رہا ہے، اپنے پاؤں سمیٹ کر بیٹھتے اُس نے سرگھٹنوں پر کھتے hart کو پکارا اور کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپاتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہتب ہی اُسے اپنے پاؤں پر کسی چیز کے رینگنے کا احساس ہوا جس پر چیختے ہوئے وہ کھڑی ہوئی اور زمین پر پاؤں مارتے اُس چیز کو ہٹانے کی کوشش کرنے لگی جو مسلسل اُس کے پاؤں پر رینگتے اور پر کی جانب آ رہی تھی۔

”زارون پلیز دروازہ کھولو میں آئندہ تمہاری ہر بات مانوں گی، نور نے خوف کے مارے چلاتے ہوئے دروازے پر تیز تیز ہاتھ مارا تو زارون نے اُسے مزید سبق سکھانے کا ارادہ ترک کرتے عالیان کو پھر بات کرنے کا کہتے فون بند کیا اور انٹھ کر دروازہ کھولا۔

”پلیز مجھے بچالو یہ مجھے کاٹ لے گا، دروازہ کھلتے ہی وہ کچھ بھی سوچ سمجھے بغیر زارون کا بازو پکڑتے اپنے پاؤں کی طرف اشارہ کرنے لگی تو اُس نے ناجھی سے اُس کے پاؤں کی طرف دیکھا جہاں ایک کارروچ موجود تھا۔

”یہ انسا کا کروچ تم جیسی چڑیل کو کاٹے گا؟، زارون نے اُسے پکڑ کر نور کی آنکھوں کے سامنے کرتے پوچھا تو وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

”پلیز اسے مجھ سے دور رکھو“، نور نے چلاتے ہوئے زارون سے کہا جو بار بار کا کروچ کو اُس کی طرف اچھاں رہا تھا۔

”تم تو کسی چیز سے نہیں ڈرتی نا تو اب اس نئے سے معموم کا کروچ سے کیوں ڈر رہی ہو؟“، قدم اُس کی جانب بڑھاتے زارون نے یاد دہانی کروائی تو نور نے پیچھے ہوتے نفی میں سر ہلایا۔

”پلیز ایسا مت کرو“، دیوار کے ساتھ لگتے پیچھے فرار کی کوئی جگہ نہ پا کر اُس نے زارون کے آگے ہاتھ جوڑے جو کا کروچ ہاتھ میں پکڑے اب بالکل اُس کے قریب آچکا تھا۔

”ہم اُو کے لیکن میری ایک شرط ہے“، ایک ہاتھ دیوار پر رکھ کر اُس کی طرف جھکتے زارون نے کا کروچ اُس کے بازو کے قریب کیا تو نور نے خوف سے پوری آنکھیں کھولتے نفی میں سر ہلایا۔

”مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے لیکن پلیز اسے دور کرو“، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے اُس کی نظریں ابھی بھی کا کروچ پر تھیں۔

”اوے کے تو پھر وعدہ کرو کہ دوبارہ کبھی بھی تم خود کو میرے لیے یا کسی اور کے لیے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گی اور نہ ہی میری کسی بات سے انکار کرو گی؟“ کا کروچ بالکل اُس کے چہرے کے پاس کرتے اُس نے اپنی شرط بتائی تو نور نے جلدی سے اُس کے کندھے میں سرچھپا تے ہاں میں سر ہلایا۔

”ہاں ہاں میں مانوں گی“، خوف کے مارے وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی تب ہی زارون نے اپنا مقصد پورا ہوتے ہی کا کروچ کو نیچے رکھتے پاؤں سے مسلا۔

”گلڈ گرل بس اب اس بات پر قائم رہنا ورنہ میں اگلی بار تمہیں اسٹور میں بند کرنے کے ساتھ ساتھ بہت سارے کا کروچ اور چھپکلیاں تمہارے اوپر چھوڑ دوں گا“، زارون نے ایک آنکھ دباتے اُسے دھمکایا تو نور کا دل کیا کہ وہ اُس شخص کا منہ توڑ دے پر ابھی بھی کا کروچ کو اُس کے پاؤں میں پڑا دیکھ کر اُس نے خاموشی سے سر ہلایا۔

”گلڈ اب اندر جاؤ فریش ہو کر کپڑے چنچ کرو جب تک میں ناشتہ بناتا ہوں“، اُسے حکم دیتے وہ پچن کی جانب بڑھا تو نور نے اُس کی پشت کو خونخوار نظروں سے گھورا جو اُسے زچ کرتے اپنی تمام باتیں منواچ کا تھا۔

”جانور، جنگلی، جلاڈ کہیں کا“، دل میں اُسے بُرا بھلا کہتے وہ پیر پٹختے ہوئے کمرے کی جانب بڑھی۔



”بھائی صاحب دیکھا آپ نے کیسے خالدہ نے ایک ہی رات میں رنگ بدلا ہے“، خالدہ بیگم کے جاتے ہی فریجہ بیگم نے سکندر صاحب سے کہا جو کسی سوچ میں گم تھے۔

”ہم اس میں رنگ بدلنے کی کیا بات ہے اُن کو جو ٹھیک لگا انہوں نے کیا اور آپ کیوں اتنی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتی ہیں حالانکہ میں نے آپ کو بتایا بھی ہے کہ ابو کے سامنے ایسی کوئی بھی بات نہیں کرنی“، سکندر صاحب کے بجائے حارث نے سخت الفاظ میں فریجہ بیگم کو تنبیہ کی تو اُن کی زبان کو بریک لگی۔

”یتم کس لمحے میں اپنی پھوپھو سے بات کر رہے ہو؟“ سکندر صاحب نے حارث کی بات سننے ہی ٹوکا۔

”میں کسی لمحے میں بات نہیں کر رہا بس ان کو اپنا ہجہ ٹھیک کرنے کی ہدایت دے رہا ہوں تاکہ اس گھر میں مزید کوئی بد مزگی نہ ہو“، آہستہ مگر وارنگ دینے والے انداز میں کہتے اُس نے مزید وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا۔

”دیکھ لیا آپ نے کیسے دماغ خراب ہوا ہے اس کا، کل سے ہی مجھے ایسے کاٹ کھانے کو دو ڈرہا ہے جیسے نور کو یہ سب کرنے کے لیے میں نے اکسایا ہو یا کل رات جو بھی ہوا اس کی ذمے دار میں ہوں

کیا اس لیے میں نے اپنی ساری زندگی ان کے لیے وقف کر دی کہ یہ لوگ اس عمر میں مجھے بتائی سنائیں؟ بھائی صاحب آپ بس مجھے کسی اولاد ہاؤس بیچ ج دیں تا کہ یہ ذلت مجھے روز روز برادرست نہ کرنی پڑے، فریجہ بیگم نے حارت کے جاتے ہی رونا شروع کر دیا۔

”تم کیوں رورہی ہوا اور کیوں جاؤ گی تم اولاد ہاؤس؟ جب تک میں زندہ ہوں تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں اور ویسے بھی میں یہ گھر تمہارے نام کر دوں گا تا کہ میرے مرنے کے بعد کوئی تمہیں یہاں سے نہ نکال سکے“، سکندر صاحب نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو فریجہ بیگم نے رونا دھونا بھولتے ان کی طرف دیکھا۔

”اللہ آپ کو لمبی عمر دے میری زندگی بھی آپ کو لوگ جائے اور بھائی صاحب مجھے اس گھر کی ضرورت نہیں ہے بس آپ کی ہے“، فریجہ بیگم کے ان کی بات سنتے ہی ہاتھ پکڑتے آنکھوں میں نمی لاتے کہا تو سکندر صاحب نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”یہ سب میں اپنی خوشی سے کر رہا ہوں تا کہ تم اور سارہ محفوظ رہو ورنہ ان لڑکوں کا کیا ہے، کبھی بھی آنکھیں پھیر جائیں“، سکندر صاحب نے نرمی سے سمجھایا تو فریجہ بیگم کچھ پس وپیش کے بعد مان گئیں۔

”ٹھیک ہے بھائی صاحب جیسے آپ کی مرضی میں نے پہلے کبھی آپ کی کسی بات سے انکار کیا ہے جواب کروں گی“، پلو سے آنسو صاف کرتے وہ اپنے مقصد میں کسی محنت کے بغیر ہی کامیاب ہونے پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگیں۔



فریش ہو کر چینچ کرنے کے بعد وہ باہر آئی تو زاروں ٹیبل پر ناشستہ لگا چکا تھا۔

”اچھی لگ رہی ہو“، اُسے اپنے ٹراوہر شرط میں چھپا دیکھ کر زاروں نے مسکراہٹ چھپاتے تعریف کی تو نور نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے اُسے گھورا۔

”میں یہ بے ہودہ کپڑے دوبارہ نہیں پہنوں گی“، چیئر پر بیٹھتے ہی اُس نے کہا تو زارون بھی اُس کے ساتھ والی چیئر پر بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہے ناشتا ختم کرو پھر مارکیٹ چلتے ہیں جو جو چاہیے ہو لے لینا“، بریڈ پر جیم لگاتے وہ دوستانہ انداز میں بات کرتے کچھ دیر پہلے ہونے والی تمام باتوں کو فراموش کر چکا تھا۔

”مجھے نہیں جانا تمہارے ساتھ اور یہ کپڑے پہن کے تو کبھی بھی نہیں“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے انکار کیا تو زارون نے ایک نظر اُس کے چہرے کو دیکھا جس پر کسی قسم کی ناراضی کا اب کوئی تاثر نہیں تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں خود آج جا کر ایک دوسوٹ لا دوں گا پھر تم کل میرے ساتھ چل کر اپنی مرضی سے سب لے لینا“، اُسے ان کپڑوں کی وجہ سے باہر جانے کے لیے رضامند ہوتا نہ دیکھ کر زارون کو دل میں خوشی ہوئی پر چہرے سے کچھ بھی ظاہر کیے بغیر اُس نے بریڈ اُس کی پلیٹ میں رکھتے خود جوں کا گلاں اٹھایا اور پینے لگا تو نور نے اُس کے جانے کا سنتے ہی کچھ دیر پہلے والی حرکت کا بدله لینے اور زارون کو سبق سکھانے کے لیے اپنے دماغ میں آنے والے وقت کے لیے لائچہ عمل ترتیب دینا شروع کیا۔



”سارہ کہاں ہوتم؟“، فریحہ بیگم نے اُس کے کمرے میں آتے ہی آواز لگائی۔ وہ جو ڈریسنگ روم میں موجود اپنے کپڑے سیٹ کرنے میں مصروف تھی باہر آئی۔

”کیا ہوا ماموں ٹھیک ہیں؟“، فریحہ بیگم کے اس طرح آوازیں دینے پر اُس نے پریشانی سے سوال کیا۔

”ہاں، ٹھیک ہیں اور تم یہاں بیٹھو میرے پاس تھیں کچھ بتانا ہے“، خوشی سے چہکتی ہوئی آواز میں

کہتے انہوں نے اپنے ساتھ سارہ کو بھی بیڈ پر بٹھایا۔

”کیا ہوا سب خیریت ہے نا اور یہ آپ اتنی خوش کیوں ہیں؟“ فریجہ بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر سارہ نے نسبتی سے سوال کیا۔

”بات ہی خوشی کی ہے اور کل سے مجھے حارت کی باتوں پر غصہ آ رہا تھا پر آج تو میرا دل تھا کہ وہ دو چار باتیں اور مجھے سناتا تا کہ بھائی اس گھر کے ساتھ اپنے کار و بار کا کچھ حصہ بھی میرے نام کر دیتے۔“

”مطلوب ماموں نے یہ گھر آپ کے نام کر دیا؟“ فریجہ بیگم کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سارہ نے پوچھا۔

”کیا نہیں پر جلد کر دیں گے، آنکھوں میں تکبر لیے انہوں نے سارہ کو بتایا تو اُس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

”پچ کہہ رہی ہیں آپ اور آپ نے خود ماموں سے بات کی تھی کیا؟“ اُس نے بے تابی سے پوچھا۔

”نہیں، بھلا تمہیں میں پاگل لگتی ہوں جو اپنے منہ سے یہ بات کر کے بھائی صاحب کی نظروں میں بُری بُنتی،“

”تو پھر؟“ سارہ نے اُن کی پہلیوں میں کی جانے والی باتوں سے تنگ آتے تیوری چڑھائی۔

”بھائی صاحب نے خود کہا ہے کہ وہ یہ گھر میرے نام کر دیں گے اور وہ بھی بہت جلد،“ فریجہ بیگم نے اُسے بتانے کے ساتھ تمام تفصیلات سے آگاہ کیا تو سارہ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اب اُس کی اور فریجہ بیگم کی حیثیت اس گھر میں اور مضبوط ہو گئی۔



نور نے ناشتہ ختم کیا تو زاروں نے اُسے دوائی دی جو اُس نے خرے کیے بغیر کھالی اور اب وہ

خاموشی سے بیٹھی زارون کو گھر کی صفائی کرتے دیکھ رہی تھی جو بڑی تیزی کے ساتھ ہاتھ چلاتے کمرے کی صفائی کرنے کے بعد اب لا و نج میں ویکیوم کلینر پھیر رہا تھا۔

”ایسا لگ رہا ہے جیسے پچھلے جنم میں کسی ہوٹل کا سوپر رہا ہو، اسے مہارت سے ہر کام کرتا دیکھ کر نور نے سوچا۔

”دیکھتی ہی رہو گی یا انٹھ کر میری کچھ مدد بھی کرو گی؟“، مسلسل اُس کی نظریں خود پر محسوس کرتے زارون نے ہاتھ روکتے سوال کیا۔

”ہونہہ میں تمہاری نوکر نہیں جو تمہارے گھر کی صفائی کروں اور ویسے یہ کام تم پر زیادہ اچھا لگ رہا ہے اس لیے تم ہی کرو، طنز یہ اندازا پناتے اُس نے کہا اور انٹھ کر کمرے میں چل گئی۔

”توبہ ہے کتنی زبان چلتی ہے اس کی“، زارون نے اُس کے جاتے ہی سر جھٹکا اور جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگا تاکہ کام ختم کر کے مارکیٹ جاسکے۔ پندرہ بیس منٹ میں سارا کام ختم کرنے کے بعد وہ کمرے میں آیا تو نور آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھی۔

”سو گئی ہو؟“، زارون نے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے اسے مخاطب کیا تو نور نے بازو ہٹا کے اُسے دیکھا۔

”نہیں، اور تم نے یہ کون سی دوائی مجھے دی ہے؟“، نور جو دوائی کھانے کے بعد مسلسل غنوڈگی سی محسوس کر رہی تھی اُس نے اپنے بھاری ہوتے سر کو تھوڑا اوپر انٹھاتے اُسے مشکوک انداز میں دیکھا۔

”مطلوب کون سی دوائی دی ہے؟“، کپڑے صوف پر رکھتے وہ اُس کے قریب آتے ناجھی سے بولا۔

”مطلوب تم اچھے سے سمجھتے ہو اور تم نے مجھے نیند کی گولی دی ہے نا دوائیوں کے ساتھ؟“، نور نے بالمشکل اپنی آنکھوں کو کھولتے اُسے گھورا جواتے بڑے الزام پر حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا جیسے اس میں

اُس کا کوئی قصور نہ ہو۔

”یہ تم اب مجھ پہ الزام لگا رہی ہو، میں نے تمہیں کوئی ایسی گولی نہیں دی وہ سب ڈاکٹر نے لکھی تھیں کل رات تمہارے سامنے“، زارون نے اُسے یاد دہانی کروائی تو نور نے نفی میں سر ہلا�ا۔

”وہ ڈاکٹر نے لکھی تھی پر جو تم نے مجھے ایک اضافی گولی کھلانی یہ کہہ کہ وہ بخار کی ہے وہ کیا تھا؟“ سوال کرتے ساتھ اُس نے اپنے آپ کو بھی ملامت کی کہ اُس نے زارون کی بات کا یقین کیوں کیا۔

”یار میں نے....“

”خبردار مجھے یاروار کہنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے“، اُس کی بات سننے سے پہلے ہی نور نے ٹوکا تو زارون نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھے ایک خاموش نظر اُس کے چہرے پہ ڈالی جس پر حقارت کے ساتھ ساتھ نفرت اور ناپسندیدگی بالکل واضح تھی۔

”میں نے تمہیں کوئی غلط دوائی نہیں دی اور جودی تھیں وہ ڈاکٹر نے ہی لکھی تھیں اس لیے دوبارہ مجھ سے ایسے بات مت کرنا ورنہ اچھا نہیں ہو گا“، سخت الفاظ میں اُسے تنبیہ کرتے وہ مزید اُس کی کوئی بات سنے بغیر اپنے کپڑے اٹھائے واش روم میں گھس گیا۔

”جلاد کہیں کا پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے، کھڑوس بد تمیز انسان“، نور نے اُس کے زور سے دروازہ بند کرنے پر کوسا اور تمام باتوں کو دفع کرتے اپنے گھومنتے ہوئے سر کی وجہ سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔



”میں تم لوگوں سے کہہ رہی تھی نا کچھ دن صبر کر لو پھر شادی رکھ لیں گے پر نہیں میری بات تو کسی کو یہاں سمجھ ہی نہیں آتی“، خالدہ بیگم سکندر صاحب کی طرف سے آتے ہی سلیم صاحب پر براہم ہونے لگیں

جو کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔

”میں آپ سے کچھ دیر میں بات کرتا ہوں“، خالدہ بیگم کا پارہ ہائی دیکھ کر سلیم صاحب نے دوسری طرف کہتے فون بند کیا۔

”اب کیا ہو گیا اور یہ شادی تمہاری مرضی سے ہی رکھی تھی ناہم نے؟“ ان کے قریب بیٹھتے سلیم صاحب نے یاد ہانی کروائی تو خالدہ بیگم نے انہیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”ہونا کیا تھا؟ حارت کو خاندان میں سے کسی نے بتا دیا کہ ہم نے شادی کینسل نہیں کی بلکہ راتوں رات لڑکی تلاش کر کے کل ہی اُس سے جنید کی شادی کر رہے ہیں، بس نہ پوچھیں مجھ سے توبات سننچالنی مشکل ہو گئی پر پھر بھی میں نے سکندر بھائی کو مطمئن کر دیا“، خالدہ بیگم نے انہیں تمام تفصیل بتائی۔

”تو اس میں چھپا نے والی تو کوئی بات ہی نہیں تھی اور تمہیں چاہیے تھا کہ تم خود سکندر بھائی کو سب بتا دیتیں“، سلیم صاحب نے نرمی سے کہا۔

”ہاں تاکہ وہ مجھ سے بدگمان ہو کر ملنا جانا چھوڑ دیتے، سلیم صاحب کچھ ہوش کے ناخن لیں اور خدارا اب کسی کے سامنے یہ مت کہہ دیجیے گا کہ جنید کی اپنی پسند کی شادی ہے“، ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے خالدہ بیگم نے نصیحت کی۔

”اچھا ٹھیک ہے کہہ دوں گا کہ اُس کی ماں کی پسند کی ہے“، سلیم صاحب نے ان کی بات پر مسکراتے ہوئے کہا تو خالدہ بیگم نے انہیں گھورا۔

”ماں کی پسند؟ میری اس شادی میں کوئی مرضی شامل نہیں یہ تو آپ کا اور آپ کے بیٹے کا دباؤ تھا کہ میں نے ہامی بھردی ورنہ میں اُس لڑکی کو بہو کے روپ میں کبھی بھی قبول نہ کرتی جو منہ اٹھا کر خالی ہاتھ ہی سرال آجائے“، ماتھے پہ بل ڈالتے انہوں نے جواب دیا تو سلیم صاحب کو ان کی سوچ پر افسوس ہوا۔

”تم نے اپنی بیٹی کو جہیز میں کون سے محل دے دیے تھے جو دوسروں سے اس چیز کی توقع کر رہی ہو اور بہو کے جہیز یا دولت پر نظر رکھنے یا اُسے حاصل کرنے کے بجائے یہ دعا کرو کہ اللہ پاک تمہارے بیٹے کو اتنی ترقی دے کہ تمہیں زندگی کی سب آسائشیں دے سکے، سلیم صاحب نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”پہلی بات یہ کہ وہ صرف میری نہیں بلکہ تمہاری بھی بیٹی ہے مجھ سے زیادہ فرض تمہارا تھا کہ تم اُسے ضرورت کی ہر چیز دیتے پر اُس کی دفعہ بھی تمہاری یہ غربت اور بے چارگی نے مجھے کچھ کرنے نہیں دیا اور بھلا ہو عمر کا جس نے خود ہی کچھ بھی لینے سے منع کر دیا اور تمہاری موجیں ہو گئیں پر میں بتا رہی ہوں اس بار میں تمہاری کوئی مرضی چلنے نہیں دوں گی۔ شادی کا فیصلہ تو تم لوگوں نے اپنی مرضی سے کر لیا پر اب میں اپنے تمام مطالبات منوا کر رہی کل بارات لے کر جاؤں گی، خالدہ بیگم نے بڑے تحمل سے اپنا فیصلہ سنایا۔

”کون سے مطالبات کی بات کر رہی ہو؟ وہی جو تم سکندر بھائی سے آج تک کرتی آئی ہو اور پہلے بھی تم اپنی مرضی کر کے نور کی زندگی بر باد کر چکی ہواب میں کسی صورت بھی تمہاری کوئی مرضی نہیں چلنے دوں گا، سلیم صاحب نے اس بارا پنے لبھ میں سختی سموتے ہوئے خالدہ بیگم کو تنبیہ کی۔

”میں نے زندگی بر باد کی ہے اُس کی یا اُس نے خود اپنا منہ کا لا کروایا؟ اور میں تو اُس کے بھلے کے لیے سب کر رہی تھی کہ میری ایک ہی بھانجی ہے چلو میرے گھر آجائے گی تو خوش رہے گی پر نہ جی نہ آج کل تو بھلانی کا زمانہ ہی نہیں اور مجھے پتا ہوتا نا کی اُس منحوس، بد کردار کے چال چلن ایسے ہیں تو میں کبھی بھی سکندر بھائی سے اُس کا ہاتھ نہ مانگتی، اُن کی بات پر آگ بگولہ ہوتے خالدہ بیگم نے کوئی بھی لحاظ کیے بغیر سلیم صاحب کو کھری کھری سنا کیں تو انہوں نے ایک دکھ بھری نظر خالدہ بیگم پر ڈالی جو نور کی خالہ ہونے کے باوجود بھی اتنی سنگدلی سے اُس کے لیے ایسے الفاظ استعمال کر رہی تھیں۔

”پر پھر بھی خدا کا شکر ہے وقت پراؤس کی اصلاحیت سامنے آگئی اور میرے بیٹے کی جان پھٹھی، ویسے بھی بعد میں بھی ہمارے ہی پلے پڑنا تھا اُس نے اللہ کا لاکھ شکر ہے اُس نے پہلے ہی جان چھڑوا دی اور مجھے وہ تمام چیزیں بھی مل گئیں جس کی مجھے خواہش تھی، خالدہ بیگم نے سلیم صاحب کو خاموش بیٹھا دیکھ کر للچاتے ہوئے کہا۔

”مطلوب کون سی چیزیں؟“ سلیم صاحب نے اس بار کچھنا سمجھی سے سوال کیا۔

”نور کے جہیز کی چیزیں جو کل بھی تھیں سکندر بھائی نے۔ میں تو بھی صاف صاف بول آئی ہوں کہ میں اُس میں سے ایک چیز بھی واپس نہیں کروں گی۔“

”اوہ تو تم صحیح اس مقصد کے لیے وہاں گئی تھیں،“ سلیم صاحب کو اب ان کے جانے کی وجہ سے مجھ آئی۔

”تو اور کیا میں نے کہہ دیا کہ وہ سب چیزیں اب آپ ملائکہ کو اپنی بیٹی سمجھ کر دے دیں،“ خالدہ بیگم نے چہرے پر کوئی بھی شرمندگی کے آثار لائے بغیر سلیم صاحب کو اپنا کارنامہ بتایا جسے سنتے ہی ان کا سرجھک گیا۔

”بہت افسوس کی بات ہے بہت زیادہ۔ خالدہ بیگم ڈروال اللہ کے عذاب سے اور یہ جو تم دوسروں کی بیٹیوں کے ساتھ کر رہی ہو ناخدا نہ کرے کل کو تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے،“ انہیں احساس دلانے کے لیے وہ غصے سے بولتے مزید کچھ سننے یا کہے بغیر کمرے سے چلے گئے۔

”یہ آدمی کبھی بھی مجھے سکون نہیں لینے دے گا نہ خود کبھی مجھے زندگی کی کوئی آسائش دی اور نہ ہی کبھی کسی دوسرے سے لینے دے گا،“ ان کی بات کا کوئی بھی اثر لیے بغیر وہ تنفر سے سر جھٹکتے اٹھ کر شام کے لیے اپنے کپڑے نکالنے لگیں۔

زارون واش روم سے باہر آیا تو کمرے میں بالکل خاموشی تھی، اُس نے تو لیے سے اپنے بال رگڑتے ایک نظر نور کو دیکھا جو سوچکی تھی۔

”شکر ہے سوگئی“، تو لیہ صوفے پر رکھتے اُس نے خود کلامی کی اور سردی کی وجہ سے کمفرٹر کھول کر اُس کے اوپر دیا۔

”سوری میری جان، میں نے جھوٹ بولا پر میں نے نیند کی گولی اس لیے تمہیں دی کہ تم میرے جانے کے بعد خود کوئی نقصان نہ پہنچاؤ اور سکون سے کچھ دیرا پنی نیند پوری کر سکو“، اُس کے چہرے سے بال ہٹاتے وہ اُس کے خوابیدہ چہرے کو دیکھنے لگا جہاں اب دنیا کی کوئی فکر موجود نہیں تھی۔

”بہت تنگ کیا ہے کل سے تم نے مجھے، دل تو ہے کہ سارے بد لے لوں پر ابھی نہیں وقت آنے پلوں گا“، مسکراتے ہوئے اُس نے نرمی سے اُس کی پیشانی کو چھوا اور کمفرٹر ٹھیک کرتے اٹھ کر بالوں میں برش کرنے لگا تاکہ تیار ہو کر مارکیٹ جاسکے۔

کچھ ہی دیر میں وہ مارکیٹ کے لیے نکل چکا تھا پر وہاں جا کر اتنے سارے مختلف سائز کے کپڑے دیکھ کر اُس کا سر چکرا گیا۔

”کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں“، پیشانی پر بل ڈالتے اُس نے لیڈریز کپڑوں سے بھری اُس بوتیک کو دیکھا جہاں ہر قسم کے کپڑے موجود تھے۔

”لیں سر، آپ کو کوئی مدد چاہیے؟“ وہاں بوتیک میں موجود ایک لڑکی نے اُسے پریشان کھڑا دیکھ کر پوچھا۔

”جی وہ مجھے کچھ سempل لیڈریز سوت چاہیے“، زارون نے وہاں کام سے بھرے سوٹوں کو گھبراہٹ سے دیکھ کر اُسے اپنا مسئلہ بتایا۔

”ٹھیک ہے آپ اس طرف آجائیں“، اُس نے بوتیک کی دوسری جانب اشارہ کیا اور خود بھی

ساتھ چلنے لگی۔

”کس سائز کے ڈریس چاہیے آپ کو؟“ اُس نے وہاں رکتے سوال کیا تو زارون نے پیشانی پر انگلی پھیرتے اُسے جواب دینے کے بجائے خود ہی ایک دوسوٹ اندازہ لگایا کہ وہ نور کو فٹ ہوں گے یا نہیں۔

”یہ ٹھیک ہے اس سائز کے دے دیں،“ ایک شرت انداز کی جانب کرتے زارون نے کہا تو اُس لڑکی نے خود ہی کچھ ڈیزائن اور ٹکڑے نکال کر زارون کو دکھائے جس میں سے اُس نے پانچ سوٹ پسند کیے اور انھیں پیک کروانے کا کہا تو اُس لڑکی نے اثبات میں سر ہلا کیا اور وہ کپڑے کا ونڈر پر پہنچا دیے۔

”تحمینک یوسر،“ زارون نے بل پے کیا تو وہاں موجود لڑکی نے اُس کا شکریہ ادا کرتے شاپر اُس کے حوالے کیے۔

”تو بہ یہ دن بھی دیکھنا تھا مجھے اپنی زندگی میں،“ ہاتھ میں شاپر کپڑے وہ اب دوسری شاپ کی جانب بڑھا جہاں مزید نور کے لیے کچھ ضرورت کی چیزیں خریدتے وہ اچھا خاصاً بوکھلا چکا تھا۔ شاپنگ مکمل کرنے کے بعد اُس نے کھانا پیک کروا کر اور گھر کے لیے نکلا تو شام ہو چکی تھی۔

”اُفف! بہت ٹائم ہو گیا ہے،“ موسم کے خراب تیور دیکھ کر اُسے نور کا خیال آیا تو اُس نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی تاکہ جلد گھر پہنچ سکے پر تیز بارش اور ٹریفک جام کی وجہ سے اُسے گھر پہنچتے پہنچتے آٹھ نج چکے تھے۔

”اس لفت کو بھی آج ہی موت پڑنی تھی،“ شاپر زسنچا لتے اُس نے بامشکل لفت کا بُن دبایا تو گارڈ نے اُسے لفت خراب ہونے کا بتایا۔

”اس کو اس بار صحیح طرح ٹھیک کروالینا ورنہ تم لوگوں کی خیر نہیں،“ اُسے دھمکی دیتے زارون نے سیڑھیوں کا رخ کیا اور تیزی سے تیسرا منزل کی جانب بڑھا۔ اپارٹمنٹ کے سامنے آتے ہی اُس نے

شاپر زنجیر کھے اور چابی نکال کر دروازہ کھولا تو اندر کا منظر دیکھتے ہی اُس کا دماغ گھوم گیا۔

”یہ کیا کیا تم نے؟“ لاونج میں موجود کسی بھی چیز کو اپنی جگہ نہ پا کر، زارون نے دروازہ بند کرتے ایک نظر لاونج کی حالت کو اور پھر بے فکری سے صوف پر بیٹھی نور کو دیکھا جو اُس کے آنے یا بولنے کا کوئی بھی نوٹس لیے بغیر چائے کے ساتھ بسکٹ کھانے میں مصروف تھی۔

”میں تم سے بات کر رہا ہوں“، زین پر پڑے کاچ کے ٹکڑوں سے بچتے اُس نے شاپر صوف پر رکھے اور غصے سے چائے کا کپ پکڑ کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کیا۔

”کیا پوچھ رہے ہو؟“ اُس کا ہاتھ اپنے بازوؤں سے ہٹاتے نور نے معصوم بنتے سوال کیا تو زارون نے خونخوار نظر وں سے اُسے گھورا اور کچھ کہنے کے بجائے کمرے کی جانب بڑھا جس کی حالت بھی لاونج سے مختلف نہ تھی۔

”اٹھو، مجھے آدھے گھنٹے میں اپارٹمنٹ بالکل صاف چاہیے، نہیں تو میں تمہاری طبیعت صاف کرنے میں دری نہیں لگاؤں گا“، ویکیووم کلیز اور جھاڑو اُس کے پاس پھینکتے زارون نے غصے سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ دھمکی دی تو نور نے کوئی پرواکیے بنانے کا رخ کیا۔

”میں کہہ رہا ہوں مجھے آدھے گھنٹے کے اندر یہ سب صاف چاہیے تمہیں اثر نہیں ہوا“، اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے کرتے زارون نے اپنے غصے کو ضبط کرتے اپنے لفظوں پر زور دیا۔

”میں تمہاری نوکر نہیں ہوں اور کس نے کہا تھا مجھے یہاں بند کر کے جاؤ“، نور نے اپنا ہاتھ چھڑواتے اُس سے بھی زیادہ غصے سے کہا تو زارون کی برداشت جواب دے گئی۔

”تم اس طرح نہیں سدھرو گی“، اُس کی اکڑ اور ہٹ دھرمی دیکھتے زارون نے نفی میں سر ہلا کیا اور ہاتھ پکڑتے اپنے ساتھ گھسیتے ہوئے ٹیرس میں کھڑا کر دیا جہاں اس وقت بادل پوری شدت سے برس

رہے تھے۔

”جب تک میں سب صاف نہیں کر لیتا تم یہیں رہو گی“، اندر سے رسی لا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کے چینخ کی وجہ سے منہ پڑیپ لگاتے زارون نے اُسے وارن کیا جو باہر گر جتے ہوئے بادلوں کی وجہ سے بار بار نفی میں سر ہلار ہی تھی۔

اپنے غصے کی وجہ سے زارون اُسے بارش میں چھوڑ تو آیا پر پچھلے دس منٹ سے خود بھی بے سکونی سے لا اُنج میں ٹھیل رہا تھا۔ ”پتا نہیں کیوں غصہ دلاتی ہے مجھے“، بادلوں کے گر جنے کی آواز پر اس نے خود کلامی کرتے ہوئے جلدی سے ٹیرس کا رخ کیا۔

”ٹھیک ہوتا؟“، ٹیپ اُس کے منہ سے اُتارتے زارون نے بارش میں آتی تیزی کو دیکھتے ہوئے جلدی سے اُس کے ہاتھ کھولے جو بادلوں کے گر جنے کے شور اور بارش سے گھبرا کر بالکل چپ اور سہمی سی بیٹھی تھی۔

”اندر چلو، پاؤں کھولتے اُس نے نور سے کہا جوابھی بھی خود میں سمعٹی بیٹھی تھی۔

”اندر چلو، بارش تیز ہو رہی ہے“، اُسے ٹس سے مس نہ ہوتا دیکھ کر زارون نے ہاتھ پکڑتے کہا تو نور نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور نفرت سے اُس کا ہاتھ جھٹکتے اٹھی۔

”کیا سمجھتے ہو تم خود کو؟“، ایک زور دار تھپٹا اس کے گال پر جڑتے نور نے چلاتے ہوئے کہا تو زارون نے ضبط سے اپنی مٹھیاں بند کیں۔

”کیا لگتا ہے تمہیں میں کوئی تمہاری زر خرید غلام ہوں جسے تم اس طرح سزا میں دو گے تو وہ برداشت کرتی رہے گی“، روئے ہوئے اُس نے بادلوں کی گرج سے بھی زیادہ زور سے چینختے زارون کے کندھے پر ہاتھ رکھے اُسے پچھے کرنے کی کوشش کی جو چٹان کی مانند آنکھوں میں بے انتہا سختی لیے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے جانے دو، اُس کی آنکھوں میں خون اُترتا دیکھ کر نور نے اپنی حرکت پر خود کو ملامت کرتے مزاحمت کی تو زارون نے دونوں ہاتھ گرل پر رکھتے اُسے اپنے حصار میں قید کیا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ پہ ہاتھ انٹھانے کی،“ غصے کے مارے اپنے جبڑوں کو بھینچتے ہوئے زارون نے اُس کے اوپر جھکتے اُسے نیچے کی جانب جھکنے پر مجبور کیا۔

”سوری۔ وہ۔ غلطی سے،“ نور نے گرل سے نیچے دیکھتے زارون کو اپنے اوپر مزید جھکتا دیکھ کر فرار کا کوئی راستہ نہ پا کر وضاحت دی۔

”غلطی؟ یہ غلطی نہیں بلکہ اپنے لیے مصیبت کا ایک اور گڑھا کھو دیا ہے تم نے اور تم کیا سمجھتی ہو؟ وہ تمہارے اپنے تھے جن کے لیے کل سے تم نے مجھے ایک سینئڈ بھی سکون نہیں لینے دیا، وہ اب تک تمہارے لیے رو رہے ہوں گے؟ پریشان ہوں گے؟ تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے کسی کو بھی وہاں نہ پہلے تمہاری فکر تھی نہ اب ہے اور فکر ہوتی تو وہ تمہاری بات سنتے مجھ پہ نہیں تم پہ یقین کرتے،“ زارون نے اُسے پوری طرح سے ٹیرس پر جھکائے اپنی بات کو جاری رکھا تو نور نے گرنے کے ڈر سے آنکھیں بند کرتے اُس کی شرط کو مٹھی میں دبو چا۔

”میرے اپنے میرے ہی ہیں اور وہ یقین کیسے کر لیتے تمہارے سامنے تمہاری بیٹی سے کوئی نکاح کی بات کرے تو کیا تم بیٹی کو وضاحت کا موقع دو گے؟“ نور نے اُس کی شرط پر گرفت مضبوط کرتے بند آنکھوں سے ڈر سے کاپتے ہوئے سوال کیا تو زارون نے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھتے اوپر کیا جو بالکل گرل میں پیوسٹ ہو چکی تھی۔

”میں کبھی ایسا موقع آنے ہی نہیں دوں گا کہ میری بیٹی کو مجھے صفائی دینی پڑے اور تم اب سے اپنی حد میں رہنا ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ مجھے تم سے محبت ہے،“ الفاظ کے ساتھ ساتھ اُس نے انگلی اٹھاتے اُسے وارن کیا اور لمبے ڈگ بھرتا کمرے میں چلا گیا۔

”کاش ایسا ہو، تا کہ تمہیں پتا چلے کہ تکلیف کیا ہوتی ہے“، بارش میں کھڑے اُس نے آج بلا خوف و خطر دل سے دعا کی اور چند سینڈ وہاں مزید رکنے کے بعد کمرے میں آگئی جہاں اب زارون موجود نہیں تھا۔

بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھا وہ کب سے آنکھیں موondے اپنے غصے کو مکر نے کی کوشش کر رہا تھا۔ نور کی حرکت نے آج اُسے ماہی کے ساتھ ساتھ دکھا اور تکلیف بھی دی تھی وہ چاہ کے بھی یہ بات دماغ سے نکال نہیں پا رہا تھا کہ زندگی میں پہلی بار کسی نے اُس پر ہاتھ انٹھایا ہے۔ وہ بھی اُس نے جس سے زندگی میں اُس نے ہر انسان سے زیادہ محبت کی تھی۔

”مجھے سردی لگ رہی ہے“، ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد بھی جب وہ کمرے میں نہ آیا تو نور نے ہمت کر کے اپنے بھیگے کپڑوں کی وجہ سے مسلسل آتی چھینکوں سے پریشان ہوتے ہوئے لاونچ میں اُس کے قریب آ کے کہا۔

”شاپرزاں میں کپڑے ہیں چینچ کر لو اور کھانا کچن میں رکھا ہے کھا لینا“، اُس کی آواز پر آنکھیں کھولتے زارون نے سامنے صوفے پر پڑے شاپرزاں کی طرف اشارہ کیا۔

”تم نہیں کھاؤ گے؟“، نور نے اُس کی آنکھوں میں سرخی دیکھتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی سوال کیا۔

”مجھے بھوک نہیں“، جواب دے کر وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر ہی اُٹھا اور کمرے میں جا کر اپنے کپڑے نکال کر نور کو کچھ بولنے کا موقع دیے بغیر ہی عالیاں کے کمرے میں آگیا۔

زارون ابھی کپڑے تبدیل کر کے واش روم سے باہر آیا تھا کہ ڈور بیل کی آواز پر اُس نے کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔

”کون؟“، نور کو لاونچ میں نہ پا کر اُس نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

”شہزاد“، زارون کی آواز سنتے ہی دوسری طرف سے جواب آیا تو اُس نے دروازہ کھولنے کے بجائے نور کے کمرے کا رخ کیا جہاں نورشاپر میں سے اپنے لیے کوئی مناسب ساسوٹ پہننے کے لیے نکال چکی تھی۔

”میرا دوست آیا ہے، باہر مت آنا اور کوئی بھی الٹی سیدھی حرکت کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا“، آگے بڑھ کر ٹیرس کا دروازہ لاک کرتے اُس نے چابی نکالی اور نور کو وارن کرتے کمرے سے باہر آیا۔ ”ہونہہ دوست آیا ہے تو میں کون سا باہر آنے لگی تھی اور تم سے بُرا کوئی ہے بھی نہیں“، اُس کے جاتے ہی نور نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور کپڑے انٹھا کرواش روم میں چل گئی۔

زارون نے دروازہ کھولا تو سامنے شہزاد ہاتھ میں اُس کی پرنسر کو لیے کھڑا تھا جو بچھلے چند مہینوں سے اُس کی مصروفیت کی وجہ سے بیمار ہو گئی تھی۔ تب ہی اُس نے اُسے شہزاد کے حوالے کر دیا تھا تاکہ وہ اپنے جانوروں کے ساتھ اُس کا بھی خیال رکھ سکے۔

”اوومائی پرنسر“، شہزاد کے سلام کا جواب دیتے ہی اُس نے سفید بڑے بالوں والی اُس روئی کی مانند نرم بلی کو گود میں لیا جو زارون سے ناراضی کے اظہار کے طور پر اُس کی گود سے نکل کر صوفے پہ جا بیٹھی۔

”اتنی دیر کیوں لگائی“، شہزاد نے ایک نظر لاوَنخ میں بکھری چیزوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”لاک تھا دروازہ اور چابی نہیں مل رہی تھی، اس لیے دیر ہو گئی“، صوفے کی جانب بڑھتے اُس نے پرنسر کو دوبارہ اپنی گود میں بٹھایا۔

”کیسی ہوتم؟ اور سو سو روی میری جان میں بہت مصروف تھا تب ہی تمہیں لینے نہیں آسکا“، شہزاد کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے وہ اُس کی نیلی آنکھوں میں اپنے لیے خفگی دیکھ کر وضاحت دیتے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا تو وہ فٹ سے اُس کی گود سے نکل کر شہزاد کے پاس چل گئی۔

”لگتا ہے زیادہ ہی مود خراب ہے“، زارون نے اُس کی حرکت پر مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں کافی دن میرے پاس رہی ہے ناشاید اس لیے اور یہ، یہاں کوئی لڑائی ہوئی ہے کیا؟“ فرش پر پڑے کاچ کو دیکھتے شہزاد نے سوال کیا تو زارون نے نفی میں سر ہلا�ا۔

”نہیں، بس مجھے غصہ تھا اس لیے چیزوں پر نکال دیا“، زارون نے لاپرواٹی سے جھوٹ بولा۔

”شرم کرو یا اور کیوں کرتے ہو اتنا غصہ؟“، شہزاد نے اُس کی بات سنتے ہی اسے ٹوکا۔

”کرتا نہیں ہوں، بس خود بخود ہی آ جاتا ہے اور تم بتاؤ پرنسر نے زیادہ تنگ تو نہیں کیا؟“، زارون نے اُس کا دھیان بٹانے کے لیے پوچھا۔

”نہیں تنگ کیا کرنا تھا اس کی تو سینڈی کے ساتھ اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی پر مجھے کچھ وقت کے لیے لندن جانا ہے اس لیے سوچا پرنسر کو خود ہی جا کر اُس کے گھر چھوڑ آؤں“۔

”لندن؟ خیریت سے جارہے ہو؟“، ایک نظر اُس کے قریب بیٹھی پرنسر پر ڈالتے اُس نے کمرے کے بندروازے کو دیکھا اور کچن میں آگیا۔

”ہاں، بس کچھ بزنس کا کام ہے اور ایک نیو پراجیکٹ کے سلسلے میں وہاں ایک جگہ بھی دیکھنی ہے،“ شہزاد بتاتے ہوئے پرنسر کو وہیں بٹھا کر خود بھی اٹھ کر کچن میں آگیا۔

”اچھا واپسی کب تک ہے؟“، زارون نے اُس کے لیے چائے بناتے ہوئے سوال کیا۔

”شايد ایک دو مہینے لگ جائیں اور یہ عالیاں نظر نہیں آ رہا ہے؟“، شہزاد نے جواب دیتے ایک نظر اُس کے کمرے کے بندروازے پر ڈالی۔

”کراچی گیا ہے میٹنگ تھی“، زارون نے جلدی جلدی ہاتھ چلاتے ہوئے اُسے جواب دیا۔

”یہ آواز کیسی ہے؟ کیا تمہارے علاوہ اور بھی کوئی ہے گھر میں؟“، اُس کی بات سننے بغیر شہزاد نے کمرے سے آتی آواز پر سوال کیا۔

”کون سی آواز؟ مجھے تو کوئی آواز نہیں آرہی،“ کندھے اچھاتے اُس نے علمی طاہر کی تو شہزادے بھی اپنا وہم سمجھتے ہوئے سر جھٹکا اور اُس سے اپنے لندن میں شروع ہونے والے پراجیکٹ کے بارے میں بات کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد شہزادہ واپس گیا تو زارون نے کھانا گرم کر کے ٹیبل پر لگایا اور آکر کمرے کے دروازے پر دستک دے کر ناب گھمایا۔

”کھانا کھالو،“ دروازہ ہکھولتے اُس نے نور سے کہا جو سترک مکمل تانے لیٹھی تھی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے،“ مکمل کے اندر سے اُس نے آواز لگائی تو زارون نے آگے بڑھ کر مکمل اُس کے چہرے سے ہٹایا۔

”بھوک نہیں بھی ہے تو بھی اٹھ کر کھاؤ کیوں کہ پھر دوائی کھانی ہے،“ اُس کی سرخ ناک اور گالوں کو دیکھ کر زارون نے نظر چراہی۔

”میرے سر میں بہت درد ہے مجھے نہیں کھانا کچھ بھی،“ مکمل پھر سے چہرے پلے کر اُس نے دوسری طرف کروٹ لی تو زارون نے مزید کچھ کہنے کے بجائے باہر کارخ کیا اور تھوڑی دیر بعد گرم دودھ کے ساتھ بسکٹ اور کیک پلیٹ میں لے کر کر اندر آیا۔

”اٹھو دودھ پیو،“ ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اس نے نور کو اٹھانا چاہا۔ اُسے خود بھی اپنے بازو میں اب شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔

”مجھے نہیں پینا،“ چھینکتے ہوئے اُس نے اٹھ کر سائیڈ ٹیبل سے ڈبے میں سے ٹشوں کا لکراپنی ناک صاف کی تو زارون نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہ پ اُس کے سامنے کیا۔

”مجھے نہیں پینا،“ نور نے اپنی بہتی ہوئی ناک کو ایک بار پھر سے ٹشو سے صاف کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”تم چاہتی ہو کہ میں خود تمہیں اپنے ہاتھوں سے پلاوں تو ٹھیک ہے“، اُسے کسی صورت بھی بات مانتانہ دیکھ کر زارون نے اُس کے قریب ہوتے ہوئے کہا تو نور نے جلدی سے کپ اُس کے ہاتھ سے پکڑا۔

”تمہارے ہاتھ سے تو میں کبھی زہر بھی نہ کھاؤں تم دودھ کی بات کرتے ہو“، تھپٹر مارنے کے بعد نور کا غصے کسی حد تک کم ہو چکا تھا پر لبھ کی کڑواہٹ ابھی بھی ولیسی ہی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ زارون کا جواب سنے بغیر ہی اُس نے کمرے میں داخل ہوتی بلی کو دیکھ کر کپ واپس رکھا۔ بلی کو بیڈ پر چڑھتا دیکھ کر جلدی سے مکمل سائیڈ پر کرتے ہوئے نیچے چھلانگ لگائی۔

”بلی ہے نظر نہیں آتا“، اُسے اس طرح اچھلتا دیکھ کروہ سمجھ چکا تھا کہ وہ بیلوں سے بھی ڈرتی ہے۔

”بلی ہے تو باہر نکالو یہ یہاں کیا کر رہی ہے“، دیوار کے ساتھ کھڑے زارون سے بات کرتے ہوئے بھی اُس کی ایک نظر پر نسز پتھی جو اب آرام سے بیڈ پر بیٹھ چکی تھی۔

”میری بلی ہے یہ، پرنز نام ہے اس کا اور میں اس سے بہت پیار کرتا ہوں اس لیے دوبارہ اس کو یہاں سے نکالنے کی بات مت کرنا“، اُسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھاتے زارون نے کہا تو نور نے پوری آنکھیں کھول کر اُس کی بات پر غور کیا۔

”مطلوب یہ یہاں رہے گی؟“ ہکلاتے ہوئے اُس نے اپنی بات مکمل کی۔

”ہاں، یہ چھلے دوسال سے میرے ساتھ ہے اور یہ یہاں ہی رہے گی“، زارون نے پرنز کو گود میں اٹھا کر نور کی طرف آتے ہوئے بتایا جسے سنتے ہی اس کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔

”دور رہو مجھ سے اور اس کو بھی دور رکھو“، اُسے اپنے قریب آتا دیکھ کر نور نے ایک کوفت بھری نظر پر نسز کی نیلی آنکھوں پر ڈالی اور جلدی سے زارون کی دوسری طرف سے نکل کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”تم اسے دوسرے کمرے میں لے جاؤ مجھے ڈر لگتا ہے بیلوں سے“۔

”تو؟ یہ میرا مسئلہ نہیں اور یہ جتنا میرا کمرا ہے اُتنا ہی پنسنر کا بھی ہے یہ میرے ساتھ ہی سوئے گی، تھپٹر کا بدلہ لینے کے لیے زارون نے کہنے کے ساتھ ہی اُسے پنج چھوڑا تو نور نے چخ مارتے ہوئے اپنے پاؤں اوپر کیے۔

”دودھ پی لوور نہ ساری رات میں اسے تمہارے ساتھ سلاوں گا“، اُسے ڈر اساد لیکھ کر زارون نے مزید ڈرایا تو نور نے سوچا اُس پاگل آدمی سے کسی بھی چیز کی توقع کی جاسکتی ہے اس لیے اس نے جلدی سے دودھ کا کپ ختم کیا۔

”گل گرل اب یہ دوائی لو اور سو جاؤ“، دراز سے دوائی نکال کر دیتے ہوئے اُس نے کہا تو نور نے نخرا کیے بغیر چپ چاپ دوائی کھا لی۔

”سو جاؤ میں لا ونخ میں جا رہا ہوں اور پنسنر بھی میرے ساتھ ہی وہیں سوئے گی“، اُسے لیٹتا دیکھ کر زارون نے کمبل ٹھیک کر کے اُس کے اوپر دیا اور اُس کے چہرے کے قریب ہوتے ٹھہر گیا۔

”گل ڈنائٹ بے بی ڈال“، اُس کے گال پرنی سے بو سہ دیتے اُس نے کہا تو نور نے پنسنر کے ڈر سے اُس کے لمس پہ بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔

”سو جاؤ سکون سے“، پردے ٹھیک کر کے وہ پنسنر کو اٹھائے لا ونخ میں چلا گیا تو نور نے سکھ کا سانس لیا۔

”پتا نہیں کیسا انسان ہے؟ انسانوں سے جانوروں والا سلوک کرتا ہے اور جانوروں سے اتنی محبت؟ افففف“، لا ونخ سے مسلسل پنسنر سے باتوں کی آتی ہوئی آواز پرنور نے سوچا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔



اگلے تین دن نور نے بخار کی وجہ سے بیڈ پہ ہی گزارے اور زارون نے اُس کی نفرت، حقارت اور

تمام باتوں کو درگز رکرتے ہوئے ایک سینکنڈ بھی اُسے اکیلانہیں چھوڑا۔ بار بار اُس کا سر دبانا، پٹیاں کرنا ساری رات جاگ کر اُس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا حتیٰ کہ ان دنوں میں نہ تو اُس نے اپنے کھانے کی پروائی، نہ سونے کی اور نہ ہی درد کی جوزخم خراب ہونے کی وجہ سے اُسے مسلسل محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اُسے فکر تھی تو نور کی جس کی طبیعت اب کافی حد تک بہتر ہو چکی تھی۔ تب ہی اُس نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک ضروری میٹنگ کی وجہ سے آفس جانے کا ارادہ کر کے کپڑے وغیرہ چنچ کیے۔

”کہیں جا رہے ہو؟“ نور نے اُسے شیشے کے سامنے کھڑے کہیں جانے کے لیے تیار ہوتا دیکھ کر سوال کیا۔

”ہاں ایک ضروری میٹنگ ہے عالیان بھی نہیں ہے اس لیے میرا جانا ضروری ہے“، ٹائی اٹھا کر لگاتے اُس نے تفصیل سے جواب دیا۔

”کب تک آؤ گے؟“ اُس کا جواب سنتے ہی نور نے ایک اور سوال کیا جس پر زاروں کے ٹائی باندھتے ہاتھ رکے تھے۔

”تم کہتی ہو تو جاتا ہی نہیں“، اُس کے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے زاروں نے جذب کی سی کیفیت میں کہا تو نور نے اُس کی بات پر تیوری چڑھائی۔

”زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں اور مجھے تمہارے جانے یا آنے کی کوئی فکر نہیں ہے۔ میری طرف سے ساری زندگی ہی باہر ہو، میں تو بس اس نیلی آنکھوں والی چڑیل کی وجہ سے پوچھ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں سارا وقت مجھے ہی گھورتی رہتی ہے“، فوراً ہی اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے اُس نے سامنے صوف پر بیٹھی پرنسز کی طرف اشارہ کیا جو ان دونوں کو ہی دیکھ رہی تھی۔

”ہمم او کے۔ مجھے لگا شاید میرے لیے پوچھ رہی ہو“، سر جھکلتے ہوئے وہ اٹھ کر واپس شیشے کے سامنے جا کر اپنی ٹائی باندھنے لگا۔

”غلط فہمی ہے تمہاری، تم تو بے شک کبھی بھی گھرنہ آؤ میں تب بھی تمہارا نہ پوچھوں“، نفرت سے کہہ کر اُس نے ایک نظر اُس کے شیشے میں نظر آنے والے عکس کو دیکھا۔

”اوے کے یہ خواہش بھی جلد ہی پوری کر دوں گا تمہاری اور میں نے ناشتہ بنادیا ہے۔ لا دوں یا خود ہی کر لوگی؟“، اُس کی بات سے زارون کے اندر کچھ بکھرا تھا پر چہرے پر کسی قسم کا کوئی بھی تاثر لائے بغیر اُس نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں خود کرلوں گی، ہاتھ پاؤں سلامت ہیں میرے اور یہ چڑیل میرے پاس ہی رہے گی کیا؟“، اُسے جوتے پہنٹے دیکھ کر نور کو پھر سے فکر ہوئی۔

”ہاں گھر میں ہی رہے گی۔ اب میں اسے آفس تو لے جانے سے رہا۔“

”لے جاؤ آفس پر میں اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی، یہ میرے ساتھ رہی تو اسے دیکھ دیکھ کر تمہارے آنے سے پہلے ہی میں نے پوری ہو جانا ہے“، دوپٹہ لیتے وہ اٹھ کر زارون کے سامنے آ کر بولی۔

”نہیں ہوتی پوری اور یہ تمہارے پاس ہوگی تو مجھے بھی تسلی رہے گی“، ایک نظر اُس کے چہرے کو دیکھتے جو بخار کی وجہ سے بالکل اُتر سا گیا تھا اُس نے اپنالیپ ٹاپ اٹھایا۔

”یہ کوئی انسان نہیں ہے جو میرے پاس ہوگی تو تمہیں تسلی رہے گی اور میں تمہیں بتا رہی ہوں اس کا کوئی انتظام کر کے جاؤ میں اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی“، اُسے مصروف دیکھ کر نور نے کہا تو زارون نے لمبی سانس بھر کر لیپ ٹاپ بیگ میں رکھا اور اُس کی جانب پلٹا۔

”بعض دفعہ جس انسان کی انسانوں سے نہیں بنتی نا اُس کی ان بے زبان جانوروں سے بن جاتی ہے اور تم اسے پیار کر کے دیکھو یہ مجھ سے بھی زیادہ تمہارا خیال کرے گی“، اُس کے گال کو نرمی سے چھوٹے زارون نے سمجھا نے والے انداز میں اپنی بات مکمل کی اور اپنا موبائل، والٹ اور چاپی

انٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔

”مطلوب؟ میں تمہیں جانور لگتی ہوں؟“ جلدی سے اُس کے پیچھے آتے ہوئے نور نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے اسے روکا تو زارون نے پہلے اپنے ہاتھ کو اور پھر اسے دیکھا جو چہرے پر غصہ لیے اُس کے جواب کی منتظر تھی۔

”میں نے پرنز کو جانور کہا اور تمہیں بس اتنا کہ اُس سے دوستی کرو، اپنا خیال رکھنا اور ٹائم سے ناشستہ کر کے دوائی کھالینا، باقی میں دروازہ باہر سے لاک کر کے جاؤں گا پریشان مت ہونا بس کچھ دیر میں واپس آجائوں گا،“ اُس کے قریب آتے ہوئے اُس نے نرمی سے اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا تو نور نے اُس کے لبھ میں ہلکی سی نمی محسوس کرتے کوئی مزاجمت کرنے کے بجائے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔

”گلدگرل،“ اُس کی تابعداری پر مسکراتے ہوئے زارون نے باہر کا رخ کیا تو نور نے اپنی رکی ہوئی سانس بحال کی۔

”پتا نہیں کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ،“ سوچتے ہوئے اُس نے ایک نظر گھر کی حالت کو دیکھا جو تین دن صفائی نہ کرنے کی وجہ سے کافی گندرا سالگ رہا تھا۔

زارون کے جاتے ہی نور کو بھوک محسوس ہوئی تب ہی اُس نے پرنز کو اندر صوفے پر سویاد لیکھ کر تسلی سے کچن کا رخ کیا تاکہ کچھ کھا سکے پر وہاں برتنوں کا ڈھیر دیکھ کر اُس کا سر گھوما۔

”اُف کتنے برتن جمع کیے ہوئے ہیں،“ ایک نظر سنک کو دیکھنے کے بعد اُس نے کچھ سوچتے ہوئے نل کھولا اور ناشستہ کرنے کے بجائے برتن دھونے لگی (کیوں کہ اُسے خود بھی کچن کی حالت دیکھ کر کو فت محسوس ہو رہی تھی) اور ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اُسے اپنے پاؤں پر کسی نرم سی چیز کا وزن محسوس ہوا جس پر وہ ہاتھ میں پکڑی پلیٹ سنک میں پھینکتے ہوئے بدک کر پیچھے ہٹی۔

”اُفف ڈر ادیا مجھے“، پنسز کو اپنے پاؤں کے قریب بیٹھا دیکھ کر اُس نے اپنا سانس بحال کرتے شکر ادا کیا کہ کارروچ نہیں تھا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ اُسے بار بار بولتا دیکھ کر نور نے ڈرنے کے باوجود بھی اُس کے چہرے پر معصومیت دیکھ کر پوچھا تو وہ مزید اُس کے قریب آتے ہوئے اپنا مسئلہ بتانے کی کوشش کرنے لگی جو نور کو بالکل بھی سمجھنہیں آرہا تھا۔

”بھوک لگی ہے؟“ اُس کی حرکات سے اندازہ لگاتے نور نے پوچھا تو وہ بولتے ہوئے ایک کیبن کی جانب بڑھی اور پنج سے اُسے کھولنے کی کوشش کرنے لگی تو نور نہ چاہتے ہوئے بھی اُس بے زبان کو بے چین دیکھ کر اپنا ڈر ایک سائیڈ پر رکھتے اُس کے قریب آئی، کیبن کھولا جس میں پنسز کے کھانے پینے کی چیزیں موجود تھیں۔

”یہ کھاتی ہوتی؟“ ایک پیکٹ اٹھا کر اُس کے سامنے کرتے نور نے پوچھا تو پنسز نے اپنی دم ہلانے کے ساتھ خوشی سے بھاگتے ہوئے لاونچ کارخ کیا اور ایک سینکنڈ میں اپنا کھانے والا باوں منہ میں اٹھائے واپس نور کے پاس کچن میں چلی آئی جسے اب اُس سے بالکل بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

”توبہ کتنی تیز ہے؟“، پیکٹ میں سے کچھ خوراک اُس کے باوں میں ڈال کر اُس کے کاموں پر حیران ہوتے ہوئے (جس نے اُسے ساری بات اتنی آسانی سے سمجھادی تھی) نور نے خود کلامی کی اور اُسے کھانے میں مصروف دیکھ کر ہاتھ دھوتے پھر سے سنک کی جانب آئی تاکہ برتن دھو سکے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

برتنوں سے فارغ ہو کر اُس نے کچن صاف کیا اور پھر کمرے اور لاونچ کی صفائی کر کے پہلے نہا کے کپڑے تبدیل کیے اور اب ناشستہ گرم کر کے ٹیبل پہلے آئی جہاں پہلے سے ہی پنسز موجود تھی جسے دیکھتے ہی نور کا دل بھرا آیا اور پچھلے دنوں کی کچھ یادیں خود بخود اُس کے دل و دماغ کا احاطہ کرنے لگیں۔

جب ایک بار حاشر بڑے شوق سے بلی لے کر آیا تھا پر حارت نے نور کو روتا دیکھ کر نا صرف اُسے ڈانٹا بلکہ حاشر کی ضد کے باوجود وہ بلی اُسی وقت واپس کر دی۔

”حارت بھائی“، اُس کا نام پکارتے ہی نور نے رونا شروع کر دیا تو پرنسز فلکر مندی سے اُس کے قریب چلی آئی اور ٹیبل پر اُس کے سامنے بیٹھ کر آنکھوں میں ادا سی لیے اُسے دیکھنے لگی جو اپنے دکھ میں یہ تک بھول چکی تھی کہ پرنسز اُس کے اتنے قریب بیٹھی ہے۔

”تمہیں پتا ہے حارت بھائی بہت اچھے ہیں انہوں نے کبھی بھی مجھے نہیں ڈانٹا پر اس انسان کی وجہ سے انہوں نے مجھے تھپٹ مارا، میری بات تک نہیں سنی اور ابو؟ وہ تو پہلے ہی مجھ سے نفرت کرتے تھے اور اب تو وہ ساری زندگی میری شکل نہیں دیکھیں گے“، روتے ہوئے اُس نے بغیر ڈرے اُسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھایا جو پوری طرح اُس کی بات سمجھتے اب خود بھی آہستگی سے بولنے میں اُس کا ساتھ دے رہی تھی۔

”اس شخص نے مجھے میرے اپنوں سے دور کیا ہے وہ جیسے بھی تھے بے شک مجھ سے نفرت ہی کرتے تھے پر تھے تو میرے اپنے اور وہ گھر میرا تھا جہاں میری امی کی یادیں تھیں ان کی خوشبو تھی“، اب کی بار اُس نے پھوٹ پھوٹ کر روتے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپایا تو پرنسز نے اُس کی گود سے نکل کر ٹیبل پر پڑے ٹشو کا ڈبہ اٹھایا اور واپس اُس کے پاس آئی جو ابھی بھی رورہی تھی۔

کچھ دیر بعد پرنسز کی آواز نہ آنے پر اُس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تو وہ سامنے ہی ٹیبل پر ٹشو کا ڈبہ منہ میں لیے بیٹھی معصومیت سے اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”تم بہت اچھی ہو پرنسز“، اس کی حرکت پر نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اُس نے ٹشو نکال کر اپنا چہرہ صاف کیا تو پرنسز نے اپنی تعریف پر شرما تے اپنا ہاتھ اٹھا کر چہرے پر پھیرا تو نور نے اُس کی حرکتوں پر رونا دھونا بھولتے ڈبہ واپس ٹیبل پر رکھا اور اُس سے با تین کرنے لگی جو کبھی آنکھیں بند کرتی تو کبھی اپنی

مخصوص زبان میں بول کر اس کی باتوں کا جواب دیتی۔

☆☆☆

سکندر صاحب کی طبیعت اب کافی بہتر تھی تب ہی وہ آج کافی دنوں بعد ایک کام کے سلسلے میں باہر گئے اور اب گھر واپس آتے ہی انہوں نے سب لوگوں کو اپنے کمرے میں آنے کا کہا۔

”بھائی صاحب خیریت ہے؟“ فریحہ بیگم نے کمرے میں آتے ہی حارث اور حاشر کے ساتھ سارہ کو بھی خاموش بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں خیریت ہی ہے ادھر آدمیرے پاس بیٹھو یہاں،“ ان کے آتے ہی انہوں نے اپنے ساتھ پڑی فائل کو اٹھا کر فریحہ بیگم کے لیے جگہ بنائی تو وہ آگے بڑھ کر ان کے ساتھ بیٹھ گئیں۔

”میں نے آپ چاروں کو ایک اہم بات کرنے کے لیے یہاں بُلا�ا ہے،“ فریحہ بیگم کے بیٹھتے ہی سکندر صاحب نے اپنی بات کا آغاز کیا تو سارہ کے ساتھ ساتھ حارث اور حاشر نے بھی سوالیہ نظر وں سے ان کی جانب دیکھا۔

”میری زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں اس لیے میں چاہتا ہوں جو کچھ بھی میرے پاس ہے میں اُسے اپنی زندگی میں ہی تم سب میں برابر تقسیم کر دوں تاکہ میرے بعد ان سب کے لیے تم سب کے درمیان کوئی اختلاف نہ ہو،“ اپنی بات مکمل کر کے انہوں نے ایک نظر سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔

”اللہ نہ کرے بھائی صاحب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی دے اور آپ کا سایہ ہم سب کے سروں پر سدا سلامت رہے،“ دل میں خوشی سے لڈو پھوٹنے کے باوجود بھی فریحہ بیگم نے چہرے پر تکلیف کے آثار لاتے ہوئے کہا۔

”ہاں زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے پر جو ذلت میری اولاد سے مجھے مل چکی ہے اُس کے بعد مجھے نہیں لگتا میں زیادہ دیر لوگوں کی حقارت بھری نظر وں کا سامنا کر پاؤں گا اس لیے میں چاہتا ہوں

کہ یہ سب جو میرے پاس ہے میں اپنے بیٹوں کے نام کر دوں تاکہ ان کو بھی اپنی ذمے داری کا احساس ہو، حارت اور حاشر کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا تو فریجہ بیگم نے ایک پریشان نظر سکندر صاحب کے چہرے پر ڈالی کہ شاید وہ ان سے کیا ہوا وعدہ بھول چکے ہیں۔

”جی جی بھائی صاحب سب کچھ حارت اور حاشر کا ہی ہے اور مجھے پتا ہے یہ اپنی ذمے داری بہت اچھے سے نبھائیں گے، ان دونوں کے کچھ بولنے سے پہلے ہی فریجہ بیگم نے مٹھاں بھرے لبھے میں کھا۔

”ہاں، بس میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ہی یہ دونوں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں، تھکنے ہوئے انداز میں کہہ کر انہوں نے سامنے رکھی فائل اٹھا کر کھولی۔

”پر ابو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سب آپ کے نام ہوتے ہوئے بھی ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں، حاشر نے مداخلت کی اور حارت نے فریجہ بیگم کی طرف دیکھا جن کی نظریں سکندر صاحب کے ہاتھ میں موجود پیپر زپڑھیں۔

”ضرورت ہے اور اب میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنی طاقت نہیں کہ اتنے بڑے کاروبار کو دیکھ سکوں اس لیے سب تم دونوں کے نام کر دوں گا تاکہ اس سب کو اب تم لوگ سن بھال لو، کاغذات کو ایک نظر دیکھتے ہوئے انہوں نے حاشر کو جواب دیا اور ان میں سے سب کاغذات کو الگ کرنے لگے۔

”میں نے سارا کاروبار تم دونوں بھائیوں میں آدھا آدھا تقسیم کر کے اُس کے پیپر زبنا لیے ہیں اور یہ گھر میں نے فریجہ کے نام کر دیا ہے۔ باقی میری ملتان والی پر اپرٹی میں نے سارہ کے نام کر دی ہے، انہوں نے گھر کے کاغذات فریجہ بیگم کی طرف بڑھاتے ہوئے حارت کے ساتھ ساتھ حاشر کو بھی شاک کیا۔

”لیکن ابو آپ کو سارہ کے بجائے وہ پر اپرٹی نور کے نام کرنی چاہیے تھی کیوں کہ جو کچھ مجھے مل گیا

تھا وہ ہمارے لیے کافی تھا،“، حارت نے اُن کی بات سن کر پہلا اعتراض اٹھایا تو فریجہ بیگم نے سارہ کی طرف دیکھا جو خود بھی حارت کی بات سُن کے جیران ہوئی تھی۔

”اُس لڑکی کا نہ تو میرے گھر میں کوئی حصہ ہے اور نہ ہی کار و بار میں اور جو بھی اُس کی طرف داری کرے گا میرا اُس کے ساتھ بھی کوئی رشتہ نہیں رہے گا اس لیے دوبارہ اُس کی حمایت کرنے سے پہلے ہزار بار سوچ لینا،“، صاف لفظوں میں حارت کو تنبیہ کر کے انہوں نے مزید کوئی بات سننے یا کہے بغیر ان سب کو جانے کا کہا تو حارت نے نور کی حق تلفی پر خاموش رہنے کے بجائے احتجاج کیا۔

”ابو پلیز آپ بے شک نور سے کوئی رشتہ نہ رکھیں پر اُس کا حق ضرور دیں کیوں کہ اس بات کے جواب دہ آخرت میں آپ ہوں گے اور اگر آپ اُس کا حق نہیں دیں گے تو میں سارا حصہ نور کے نام کر دوں گا۔ جونہ تو آپ چاہیں گے اور نہ ہی سارہ اور پھوپھو،“، ایک نظر ان دونوں کے خوشی سے چمکتے چہروں پر ڈالی اور اپنا فیصلہ سُنا کر سکندر رصاہب کے ساتھ ساتھ فریجہ بیگم اور سارہ کو بھی ساکت چھوڑ کر لمبے ڈگ بھرتے کمرے سے نکل گیا۔



زارون میٹنگ کے بعد مارکیٹ چلا گیا تو اُسے وہاں کافی ٹائم لگ گیا اور اب تقریباً تین گھنٹے بعد وہ گھر واپس آیا تو نور اور پرسنر کو ایک ساتھ بیٹد پے سویاد لیکھ کر اُس سے جھٹکا گا۔

”لگتا ہے کافی دوستی ہو گئی ہے،“، خود کلامی کرتے ہوئے اُس نے ایک نظر نور کے پر سکون چہرے پر ڈالی اور پانی پینے کچن میں آگیا جہاں ہر چیز اپنی جگہ پر رکھی ہونے کے ساتھ ساتھ برتنوں کا ڈھیر بھی سنک میں نہ پا کر زارون کو مزید حیرت ہوئی۔

”لگتا ہے میڈم کا دماغ کچھ ٹھنڈا ہو گیا ہے جو مجھ پر اتنی مہربانیاں ہو رہی ہیں،“، گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے اُس نے خود کلامی کی اور باہر چیز پر بیٹھ کر پینے لگا۔

”تم کب آئے؟“ کچن سے آتی شور کی آواز پر نور کی آنکھ کھلی تو اس نے باہر آ کر زارون کو چیز پر بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔

”ابھی آیا ہوں، تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ اور یہ کام کرنے کی کیا ضرورت تھی میں خود ہی آ کے کر لیتا،“ جواب دیتے ہوئے زارون نے اُس کے کھلے بالوں کو دیکھا جو کمرتک آرہے تھے۔

”کوئی احسان نہیں کیا بس جو تم میرے لیے کرتے ہو یہ ان سب کا بدلہ ہے،“ نور نے تلنگی سے کہہ کر اُس کی ساری خوشی کو خاک میں ملا یا۔

”ہم او کے، میں تمہارے لیے موبائل لایا تھا،“ اُس کے رویے اور بات کو نظر انداز کرتے ہوئے زارون نے گلاس ٹیبل پر رکھ کر اپنے بیگ سے موبائل نکال کر اُس کے سامنے رکھا۔

”اس کی کیا ضرورت تھی،“ نور نے ایک نظر موبائل کو دیکھ کر دوسری نظر زارون پر ڈالی جواب چینچ کرنے کے لیے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

”ضرورت تھی کیوں کہ میں اب ہر وقت تمہارے ساتھ یہاں گھر پہنچنے سکتا۔ سو کام ہوتے ہیں مجھے اور تم اب کل سے یونیورسٹی جاؤ گی تو مجھ سے رابطے کے لیے تمہیں اس کی ضرورت ہو گی،“

”مطلوب تم مجھے یونیورسٹی جانے دو گے؟“ اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نور نے حیرت سے کھڑے ہوتے ہوئے تصدیق چاہی۔

”ہاں تو میں کون سا تمہیں یہاں باندھ کر رکھوں گا، تم جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو پر میرے ساتھ اور دوسری بات مجھے تمہارے پڑھنے سے کوئی مسئلہ نہیں۔ اپنی ڈگری مکمل کروتا کہ بچوں کے سامنے شرمندگی نہ ہو،“ اپنی بات کے اختتام پر زارون نے آنکھوں میں شرارت لیے بڑی سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کی۔

”کون سے بچے؟“ ناجھی سے اُس کی جانب دیکھتے ہوئے نور نے سوال کیا تو زارون نے

جواب دینے کے بجائے پہلے اپنے اور اُس کے نیچے حائل چند قدم کا فاصلہ سمیٹا۔

”ہمارے بچے، تمہارے اور میرے“، اُس کے کندھے سے بال ہٹا کر اُس کے کان کے قریب جھکتے سرگوشی کی تو نور نے اُس کی بات سنتے ہی غصے سے لال ہوتے ہوئے اُس کے سینے پہ ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکا دیا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور دوبارہ مجھ سے ایسی کوئی بے ہودہ بات کی تو منہ توڑ دوں گی تمہارا“، اپنے سوال پوچھنے پر خود کو ملامت کرتے ہوئے اُس نے زارون کو خبردار کیا جو اُس کے بدلتے رنگوں کو دیکھ کر محفوظ ہو رہا تھا۔



بارات ہال میں پہنچی تو سلیم صاحب نے نکاح خواں کو نکاح شروع کرنے کا کہا۔

”اتنی جلدی بھی کیا ہے کچھ دیر ک جائیں“، خالدہ بیگم نے ایک نظر تمام مہماں کو اور پھر جنید کے ساتھ بیٹھی ملائکہ کو دیکھ کر سلیم صاحب سے کہا جوان کے انتظار کروانے کی وجہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ”قاری صاحب آپ شروع کریں“، ان کی کسی بھی بات کو اہمیت دیے بغیر سلیم صاحب نے قاری صاحب سے کہا جو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنا رجسٹر کھول چکے تھے۔

”میں نے کہانا یہ نکاح ابھی شروع نہیں ہو گا“، سلیم صاحب پر اپنی بات کا کوئی اثر ہوتا نہ دیکھ کر خالدہ بیگم نے سب کے سامنے کھڑے ہو کے غصے سے چلاتے ہوئے کہا تو قاری صاحب کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی حیرت اور ناممکنی سے ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”خالدہ کیا بد تمیزی ہے یہ؟ خاموشی سے بیٹھ جاؤ“، سلیم صاحب نے لبھ کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں بھی سختی سموتے ہوئے انہیں تماشا کرنے سے روکا۔

”کیوں رہوں میں خاموش؟ پہلے بھی آپ دونوں نے اپنی مرضی سے اس شادی کا فیصلہ کیا اور

میری ایک نہ سُنی اور اب بھی آپ مجھے خاموش کروار ہے ہیں؟ جب کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ جب تک یہ لوگ میری ساری باتیں مان نہیں لیتے یہ نکاح نہیں ہوگا، خالدہ بیگم سلیم صاحب کا ہاتھ جھٹک کر غصے سے چینیں تو ملائکہ نے ایک نظر جنید کی جانب دیکھا جو خود بھی خالدہ بیگم کے ایک دم سے بد لئے والے روئے پر حیران تھا۔

”بہن آپ مہربانی کر کے بیٹھیں اور بتائیں آپ کی جو بھی ڈیماںڈ ہوئی ہم لوگ پوری کرنے کے لیے تیار ہیں،“ محمود صاحب (ملائکہ کے والد) نے سب مہمانوں کے سامنے اپنا تماشا بنتا دیکھ کر بات سننچا لئے کی کوشش کی۔

”ہماری کوئی ڈیماںڈ نہیں ہے آپ بیٹھیں اور قاری صاحب آپ شروع کریں،“ خالدہ بیگم کے بجائے سلیم صاحب نے محمود صاحب کو مطمئن کرتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ٹھیک ہے پھر میں بھی دیکھتی ہوں یہ نکاح کیسے ہوتا ہے جنید اٹھو گھر چلو،“ سلیم صاحب کی ہٹ دھرمی دیکھ کر انہوں نے کہنے کے ساتھ ہی جنید کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ کھینچا۔

”امی پلیز میں ملائکہ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا اور اگر آپ کو اتنا ہی مسئلہ ہے نا تو آپ یہاں سے جا سکتی ہیں،“ ان کا ہاتھ جھٹک کر انہیں اس قدر رفتار اور تکبر سے بات کرتا دیکھ کر جنید نے واپس ملائکہ کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا تو خالدہ بیگم نے ایک افسوس بھری نظر جنید پر ڈالی۔

”ہونہہ، شادی سے پہلے ہی بیوی کے غلام بن گئے اور میں دیکھتی ہوں اب کہ تم میری مرضی کے بغیر اس کم ذات لڑکی کو میرے گھر میں کیسے لے کر آتے ہو،“ جنید کی حرکت پر غصے سے پاگل ہوتے ہوئے انہوں نے اوپنجی آواز میں کسی کی پرواکیے بغیر کہا اور دعا (خالدہ کی بیٹی) کے روکنے اور سمجھانے کے باوجود بھی وہاں سے نکل گئیں۔

”قاری صاحب آپ شروع کریں،“ خالدہ بیگم کے روئے پر شرمندگی سے سب سے معدتر

کرتے ہوئے انہوں نے کہا تو محمود صاحب جو پہلے ہی پانچ بیٹیوں کے ساتھ غربت کے بوجھ تلے دبے تھے انہوں نے بیٹی کی زندگی بر باد ہونے کے ڈر سے کسی قسم کی کوئی مزاحمت کیے بغیر ملائکہ کہ سر پر ہاتھ رکھا جو ماں باپ کی مجبوری کی وجہ سے خالدہ بیگم کی اتنی کڑوی باتوں کے بعد صرف جنید کے ساتھ دینے پر اقرار میں سر ہلاچکی تھی۔

☆☆☆

”بے ہودہ انسان پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے،“ زارون کو لا و نج میں چھوڑ کروہ کمرے میں آچکی تھی اور اب پچھلے ایک گھنٹے سے ادھر ادھر ٹھلتے ہوئے اُسے بُرا بھلا کہہ رہی تھی جو اس کا پارہ ہائی دیکھ کر کسی بد مرگی سے بچنے کے لیے اپنے کپڑے لے کر عالیان کے کمرے میں جا چکا تھا۔

”دل کر رہا ہے منہ توڑ دوں اس کا،“ تھک ہار کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اُس نے ایک بار پھر سے زارون کی بات یاد آنے پر اُسے کوسا اور سائیڈ ٹیبل پر پڑے موبائل پر نظر پڑتے ہی اُسے اٹھا کر دیکھنے لگی جس میں سم کے ساتھ ساتھ نیٹ بھی چل رہا تھا۔ تب ہی نور نے کچھ سوچتے ہوئے ایک نظر لا و نج میں دیکھا اور پھر پاسورڈ سیٹ کر کے ایف بی آن کی کیوں کہ آج صحیح سے ہی اُسے زین کی فکر ہو رہی تھی جس کو وہ ان سارے معاملات میں بالکل ہی بھول چکی تھی۔

”آر جے؟“ میسینجر میں جاتے ہی وہاں اتنے دنوں میں اُس کا ایک بھی مسیح نہ دیکھ کر پہلے تو نور کو حیرانی ہوئی اور پھر اُسے اتنے دنوں سے آن لائن نہ دیکھ کر نور کے حواس صحیح معنوں میں اُڑتے تب ہی اُس نے جلدی سے مسیح ٹائپ کر کے اُسے سینڈ کیا جس کا جواب پندرہ منٹ گزرنے کے بعد بھی نہیں آیا۔

”آر جے کہاں ہیں آپ؟“ اس نے ایک اور مسیح تیزی سے ٹائپ کر کے اسے سینڈ کیا پر ابھی بھی دوسری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اُسے مزید پریشانی ہوئی۔

”اللہ! آر جے ٹھیک ہو،“ دل سے دعا کرتے ہوئے اُس نے کچھ اور میسینجر ٹائپ کر کے اُسے سینڈ

کیے مگر دو گھنٹے مسلسل انتظار کے بعد بھی دوسری طرف سے مسلسل خاموشی پر نور کے دل میں ایک خوف سا بیٹھ گیا کہ ”کہیں زارون نے آر جے کو کچھ کرنہ دیا ہو؟“ کیوں کہ اُس رات جب وہ زین سے بات کر رہی تھی تو زارون اُس کے کمرے میں آ کر اُسے ڈھمکی دے کر گیا تھا جس پر نور نے اب غور کیا۔

”اللہ پاک پلیز اب میری وجہ سے کسی کوتکلیف مت دیجیے گا بس ایک بار آر جے مجھے اپنی خیریت کا بتا دیں میں دوبارہ کبھی ان سے بات نہیں کروں گی“، آنکھوں میں نبی لیے اُس نے دعا کی اور پھر سے میسح ٹائپ کرتے ہوئے اُسے سینڈ کیا۔

”کھانا نہیں کھانا آج؟“ وہ اپنے موبائل میں مگن تھی جب زارون نے کمرے میں آتے ہوئے پوچھا۔

”ن۔۔۔ نہی۔۔۔ ن،“ اس کی آواز پر ایک دم سے موبائل اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کمبل پر گر گیا۔

”کیا ہوا؟ ڈر کیوں رہی ہو؟“ اُس کی ہڑ بڑا ہٹ پر زارون نے جا چلتی ہوئی نظرؤں سے اُسے دیکھا جس کی آنکھیں روئے کی وجہ سے سرخ ہو چکی تھیں۔

”ک۔۔۔ ک۔۔۔ کچھ نہیں اور مجھے بھوک نہیں ہے“، جلدی سے اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے رگڑ کر صاف کرتے ہوئے اُس نے جواب دیا تو زارون نے واپس جانے کے بجائے قدم اُس کی طرف بڑھائے جس کی نظر اب اپنے موبائل پر تھی۔

”کیا ہوا ہے؟ رو کیوں رہی ہو؟“ اُس کے قریب بیٹھ کر زارون نے نرمی سے پوچھا تو نور نے اُس کا اپنے چہرے کی طرف بڑھتا ہاتھ جھٹکا۔

”میں روؤں یا ہنسوں یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے اس لیے دوبارہ کسی بھی بہانے سے مجھے چھوئے کیا میرے پاس آنے کی کوشش مت کرنا“، نظرؤں میں غصے اور لبھ میں سختی لیے اُس نے زارون کو ایک بار

پھر سے بھڑکایا۔

”مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تمہیں چھونے کا اور میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ تم“، اُس کی بات پزاروں نے اپنی سبکی چھپانے کے لیے غصے سے کہا اور انٹھ کر کمرے سے چلا گیا تو نور نے ایف بی لاگ آؤٹ کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا کہ زاروں کی نظر موبائل پر نہیں پڑی۔

☆☆☆

”یہ دونوں تو آج گھر آجائیں ایسی طبیعت صاف کروں گی ان باپ بیٹی کی کہ ساری زندگی یاد رکھیں گے“، اپنی بے عزتی پر تملاتے ہوئے انہوں نے پس انٹھا کر زور سے بیڈ پر پھینکا۔

”میں دیکھتی ہوں کیسے وہ لڑکی میرے گھر میں قدم رکھتی ہے اور سلیم؟ بہت پر نکل آئے ہیں نا اُس کے پر وہ یہ نہیں جانتا کہ خالدہ بیگم ایسے پر کاٹنا اچھے سے جانتی ہے“، جوتے اُتار کر ایک طرف فرش پر پھینکتے ہوئے انہوں نے سوچا اور انٹھ کر جنید کے کمرے کی جانب بڑھیں جسے اُس نے کچھ گھنٹوں پہلے بہت پیار سے ملائکہ کے لیے سجا�ا تھا۔

”جس چیز میں میری مرضی شامل نہ ہو میں وہ ہر چیز بر باد کر دوں گی، بے شک وہ کسی کا کمرا ہو یا زندگی“، دروازہ کھول کر آگے بڑھتے ہوئے انہوں نے بیڈ پر لگی سرخ پھولوں کی لڑیوں کو ہاتھ میں پکڑ کر زور سے کھینچا تو وہ ایک سینکڑ میں زمین بوس ہو گئیں۔ پھر بھی اُن کا غصہ کم نہیں ہوا تب ہی انہوں نے کمرے میں پڑی سجاوٹ کی چیزوں کو باری باری انٹھا کر فرش پر پھینکا اور کچھ ہی سینکڑ میں کمرے کا نقشہ بگاڑ کے اُن کے دل کو تھوڑا سکون ملا۔

”ملائکہ بی بی تم ایک بار میری دسترس میں تو آ جاؤ، دیکھنا میں تمہارا کیا حال کرتی ہوں“، تصور میں ملائکہ کے چہرے کو لاتے ہوئے خالدہ بیگم نے ٹیبل پر رکھے آخری بوکے کو ہاتھ مارتے خود کلامی کی اور اپنی تیز ہوتی سانس کو بحال کرتے وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئیں۔



زارون کے جاتے ہی نور نے جلدی سے موبائل اٹھا کے دیکھا جہاں ابھی بھی زین کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔

”پتا نہیں کہاں ہیں“، خود کلامی کرتے اُس نے ایف بی کو لاگ آؤٹ کیا اور اٹھ کر باہر آگئی تاکہ زارون کوشک نہ ہو۔

”کیا بنار ہے ہو؟“، کچن میں اُسے مصروف دیکھ کر نور نے اپنے قدم اُس کی جانب بڑھائے۔  
”زہربنار ہا ہوں، کھاؤ گی؟“، زارون جو پہلے ہی اپنے بازو میں ہونے والے درد سے بے زار تھا اور اب کچھ منٹ پہلے نور کے رویے اور بھوک کی وجہ سے مزید اکتا ہٹ سے بولا۔

”نہیں یہ تم ہی کھاؤ میں اپنے لیے خود ہی بنالوں گی“، اُس نے باول میں موجود انڈوں کو دیکھتے اپنی ناک پکڑی۔

”تو میرے لیے بھی بنادو پلیز۔ میرے بازو میں درد ہے اور بھوک بھی بہت لگی ہے“، زارون نے اُس کی بات سنتے ہی اپنے لبجھ میں نرمی لاتے اپنا مسئلہ بتایا۔

”میں نو کرنہیں تمہاری جو تمہارے لیے بھی بنادوں“، اُس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھنے کے باوجود بھی نور نے نرمی کی کوئی بھی گنجائش رکھے بغیر ترکخ کر جواب دیا اور فرج سے آٹا نکال کر شیلف پر رکھا (جو اُس نے دوپھر میں گوندھا تھا) تو زارون نے کوئی بھی جواب دینے کے بجائے خاموشی سے ایک ہاتھ سے انڈوں کو فرائی پین میں انڈیلا (جو پہلے سے ہی وہ آئل گرم کرنے کے لیے چولہے پر رکھ چکا تھا) اور ایک ہاتھ سے چچ سے اُسے ہلاتے اُس کی نظریں نور پر تھیں جو روئی بیل کرتے پر ڈال چکی تھی۔

”اچھی بنی ہے“، انڈوں کو پلیٹ میں نکالتے زارون نے تعریف کی تو نور نے منہ بسو رتے آئے

کو واپس فرتبح میں رکھا۔

”میں ہر چیز ہی اچھی بناتی ہوں اس لیے اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ مجھے مکھن لگا کرم اپنے لیے بھی روٹی بنوالو گے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے“، مہارت سے روٹی کو آگ پر سینکتے ہوئے اُس نے زارون کے ارمانوں پر پانی پھیرا جو یہ سمجھ رہا تھا کہ اُسے خاموش دیکھ کر نور کے دل میں رحم آجائے گا۔

”میں نے بس تعریف کی ہے اس کے علاوہ مجھے گھر کی بنی روٹی ویسے بھی پسند نہیں“، فرتبح سے بریڈ نکال کر ٹوستر میں گرم کرنے کے لیے رکھتے زارون نے کندھے اچکاتے جواب دیا اور پرسز کے لیے دودھ نکال کر اُس کے باول میں ڈالا جوا بھی ابھی انٹھ کر کچن میں آئی تھی۔

”تو تمہیں بناؤ کر کون دے گا؟ تمہاری ماں؟ جس کا ابھی تک مجھے کیا شاید دنیا میں کسی کو بھی علم نہ ہو“، سالمن نکال کر گرم کرتے ہوئے نور کو احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ کتنی غلط بات کر چکی ہے۔

”کیا بکواس کی ہے تم نے؟“ اُس کی بات سنتے ہی زارون نے اُس کا بازو کھنچتے اپنی طرف کیا جو اودن میں سالمن رکھ رہی تھی۔

”کیا؟“ اُس کے غصے کی پرواکیے بنا نور نے ناجھی سے اُسے دیکھا۔

”کیا کہا ہے ابھی تم نے میری ماں کے بارے میں؟“، اس کے جڑوں کو اپنے ہاتھ میں دبوچے اُس نے آنکھوں میں سختی لیے سوال کیا تو نور نے اُس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی۔

”میں نے کچھ نہیں کہا اور میں پہلے بھی تم سے کہہ چکی ہوں کہ مجھ سے دور رہو“، اپنی غلطی ماننے کے بجائے اُس نے ہٹ دھرمی دکھاتے جواب دیا تو زارون نے غصے نکالنے کے لیے پاس پڑا گلاس انٹھا کر زور سے زمین پر مارا تو نور نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھتے خود کو چینے سے روکا۔

”کیا سمجھتی ہو تم خود کو؟ کہ میں تمہیں کچھ کہتا نہیں تمہاری ہر بات پر خاموش ہو جاتا ہوں تو تم جو چاہو کہہ سکتی ہو؟ جو چاہو کر سکتی ہو؟ تو مس نور یہ بات اپنے دماغ میں بٹھا لو کہ زارون علی اگر خاموش ہونا

جانتا ہے تو خاموش کروانا بھی اُسے اچھی طرح آتا ہے اس لیے دوبارہ کوئی بھی بات کرنے سے پہلے ہزار بار سوچ لینا خاص کر میری ماں کے بارے میں، آنکھوں میں انہتا کی سختی اور غصہ لیے اُس نے آخری بار نور کو وارن کیا جو اُس کی آنکھوں میں پھیلی دہشت اور سرخی دیکھ کر کوئی جواب دینے کے بجائے خاموشی سے اُسے دیکھنے لگی جواب لمبے ڈگ بھرتے عالیان کے کمرے میں جاتے دروازہ زور سے بند کر چکا تھا۔



ملائکہ کو لے کر وہ سب لوگ گھر پہنچے تو خالدہ بیگم کے کمرے کا دروازہ بند دیکھ کر جنید نے اُس جانب قدم بڑھائے۔

”تم مہمانوں کو دیکھو اور دعائم بھا بھی کو لے کر کمرے میں جاؤ میں تمہاری ماں کو دیکھ کر آتا ہوں“، جنید کو روکتے سلیم صاحب نے خود کمرے کی جانب قدم بڑھائے اور کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھا جو اندر سے لاک تھا۔

”خالدہ دروازہ کھلوءے، انہوں نے مہمانوں کی وجہ سے آہستگی سے دستک دی پر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر انہوں نے بعد میں انہیں دیکھنے کا سوچتے اپنا رخ لاوونج کی جانب کیا کہ جنید کے ساتھ مہمانوں کو دیکھ سکیں۔

”آجائیں بھا بھی“، دعائے دروازہ کھولتے اندر دیکھے بغیر ملائکہ سے کہا جو ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اندر داخل ہوئی تو کمرے کا حشر دیکھ کر مسکراہٹ کے ساتھ اُس کے قدم بھی رُکے۔

”یہ کمرے کو کیا ہوا؟“، دعائے بھی اُس کے پیچھے ہی اندر داخل ہوتے وہاں موجود تمام چیزوں کو بکھردا دیکھ کر حیرانی سے کہا اور خالدہ بیگم کا سوچتے ہی خاموش ہو گئی۔

”آپ ساتھ والے کمرے میں آجائیں میں جب تک یہ چیزیں وغیرہ اٹھا لیتی ہوں“، ملائکہ کے

چہرے کے پھیکے پڑتے رنگ دیکھ کر دعا نے بات سنن جانے کی کوشش کی اور اُسے ساتھ لیے دوسرے کمرے میں آگئی جہاں کچھ اور مہماں بھی بیٹھے تھے۔



زارون کے جاتے ہی نور نے ایک نظر فرش پہ بکھرے کا نجخ کو دیکھا اور پھر پرنز کو جو دودھ پینے کے بعد لا و نج سے کچن میں آچکی تھی۔

”نو، پرنز اندر نہیں آنا باہر جاؤ“، اس سے پہلے کہ پرنز اپنا پاؤں کا نجخ پہ رکھتی نور نے جلدی سے آگے بڑھتے اُسے اٹھایا۔

”ابھی لگ جاتا نا تمہیں تو تمہارے اُس جلا دمالک کو پھر سے مجھے باتیں سنانے کا موقع مل جانا تھا“، اُسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لاتے نور نے زارون کے غصے سے خائف ہوتے پرنز سے کہا اور اُسے بیدپہ بٹھاتے وہیں بیٹھنے کا کہتے خود واپس کچن میں آئی تاکہ کا نجخ اٹھا سکے۔

”پتا نہیں کیا سمجھتا ہے خود کو کھڑوس کہیں کا“، کا نجخ اٹھاتے وہ مسلسل زارون کو برا بھلا کہہ رہی تھی جو تب سے خود کو کمرے میں بند کیے بیٹھا تھا۔

”اُفف اب تو میرا بھی کچھ کھانے کو دل نہیں کر رہا“، کا نجخ اٹھانے کے بعد اُس نے باقی چیزوں کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر ہاتھ دھوئے اور شیلیف پر زارون کے بنائے ہوئے انڈوں کو دیکھتے سوچا۔

”ویسے میں نے بھی غلط بات کی مجھے ایسے اُس کی امی کے بارے میں نہیں کہنا چاہیے تھا“، کمرے کے بند دروازے کو دیکھ کر نور نے خود کلامی کی اور اپنی غلطی سدھارنے کے لیے اُس نے زارون کے بازو کا درد یاد آتے ہی، فرنچ سے آٹا نکال کر دوروٹیاں بنائیں اور سالن گرم کرتے تمام چیزیں ٹرے میں رکھ کر کمرے میں لے آئی جہاں زارون کو اس کے آنے کی بالکل توقع نہیں تھی۔

”کیا کرنے آئی ہواب؟“، ایک نظر اُس کی طرف دیکھ کر زارون نے ما تھے پر تیوری ڈالی۔

”وہ تمہیں بھوک لگی تھی اس لیے میں کھانا لے کر آئی ہوں“، ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے نور نے حتی الامکان خود کو غصہ کرنے سے روکا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے اور پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو مجھے تم سے کسی قسم کی کوئی بات نہیں کرنی“، ایک نظر ٹرے میں رکھی چیزوں کو دیکھ کر زارون نے اپنی ناراضی برقرار رکھتے ہوئے کہا اور دوبارہ سے اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہوا۔

”لیکن پہلے تو تمہیں بہت بھوک لگی تھی اور اب میں کھانا لے آئی ہوں تو تم نخرے کر رہے ہو،“ اُس کے سامنے صوف پر بیٹھتے نور نے چاہتے ہوئے بھی نرمی کا مظاہرہ کیا تو زارون کو اُس کی اتنی مہربانی ہضم نہیں ہوئی۔

”پہلے تھی بھوک اب نہیں ہے اور تمہیں میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، مجھے جب بھوک لگی میں خود بنا کر کھالوں گا“، نور سے بات کرتے وہ اپنے لبھ کی تلخی کو چاہتے ہوئے بھی کم نہیں کر پایا۔

”اوے مجھے بھی کوئی شوق نہیں چڑھا تمہارے لیے کھانے بنانے کا یا تمہاری منتیں کرنے کا، میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری بھوک“، زارون کے غصے سے بات کرنے پر نور نے بھی ترٹخ کر کہا اور ٹرے وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

”میرا ہی دماغ خراب تھا جو اُس کھڑوس اور بد دماغ انسان کے لیے کھانا لے کر چلی گئی“، زارون کے انکار پر نور نے کمرے میں آتے ہی اپنی مہربانی پر خود کو سا اور ایک نظر پر نسز پہ ڈالتے جو سکون سے سو رہی تھی اُس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور موبائل اٹھا کر ایف بی آن کی جہاں ابھی بھی آر جے کا کچھ اتنا پتا نہیں تھا۔

”آر جے کہاں ہیں آپ؟“ نور نے پھر سے مسح ٹائپ کرتے سینڈ کیا اور ایف بی آن چھوڑے ہی وضو کرنے والش روم کی جانب بڑھی تاکہ عشاء کی نماز پڑھ سکے۔ وضو کر کے وہ باہر آئی تو موبائل کی بار بار

ہوتی ٹون پر متوجہ ہوتے اُس نے جلدی سے قدم سائیڈ ٹیبل کی جانب بڑھائے اور موبائل انٹھا کر دیکھا جہاں آر جے کے دس بارہ میسجر موجود تھے جنہیں دیکھتے ہی نور کی جان میں جان آئی کہ وہ ٹھیک ہے۔

”کہاں تھے آپ؟ میں کب سے میسجر کر رہی تھی؟“ زین کے تمام میسجر پڑھنے کے بعد (جس میں اُس نے نور کی شادی کی وجہ سے میسچ نہ کرنے کا بتاتے، اُسے مبارکبادی تھی) نور نے غصے اور ناراضی والے ایموجی لگاتے میسچ سینڈ کیا۔

”narash مجھے ہونا چاہیے نہ کہ تمہیں، خود تم اپنی شادی میں اتنی مصروف تھیں کہ مجھے بھول گئیں اور ایک میسچ تک نہیں کیا میں تو بچارا انتظار کرتا ہی رہ گیا کہ کب تم میسچ کرو اور کب میں تم سے بات کروں؟“ معصومیت بھرے ایموجی لگا کر زین نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا تو نور کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں پر وہ چاہ کر بھی زین کو زارون کے بارے میں نہ بتا سکی کیوں کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کی وجہ سے زین کسی مصیبت میں پھنسنے۔

”کیا ہوا؟ کہاں گئی اب؟“ کچھ دیر اُس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد زین نے پوچھا تو نور نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

”یہی ہوں بس آپ کو اتنا کہنا تھا کہ میں اب دوبارہ آپ سے بات نہیں کروں گی“، اُس کا میسچ پڑھتے ہی نور نے فیصلہ کرنے میں ایک سینڈ لگایا۔

”کیوں؟ کیا تمہارے شوہر نے منع کیا ہے؟“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں پر پہلے بات اور تھی پہلے میں کسی کے زکاح میں نہیں تھی اس لیے آپ سے بات کر لیتی تھی پر اب جب کہ میں کسی کے زکاح میں ہوں تو میں اُسے دھوکا نہیں دے سکتی۔ بے شک ہمارے نقچ ایسا ویسا کچھ نہیں ہے پھر بھی اب میرا آپ سے بات کرنا ٹھیک نہیں“، نور نے میسچ ٹائپ کرتے سینڈ کیا اور دوسرا طرف سے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

”ٹھیک ہے اور بہت اچھا فیصلہ کیا ہے تم نے بس میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی زندگی میں ہمیشہ خوش رہو پر پھر بھی اگر کبھی بھی تمہیں میری ضرورت ہو تو تم مجھے میسح کر سکتی ہو،“ زین نے مسکراہٹ والے کچھ ایجو جی لگا کر نور کو میسح سینڈ کیا تو اُس کے اپنے اندر بھی ایک سکون کی لہر دوڑ گئی جسے وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا،“ ایک آخری رشتہ کو ختم کرتے نور کی ہر امید ختم ہو چکی تھی تب ہی اُس نے زین کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر ہی ایف بی ہمیشہ کے لیے لاگ آؤٹ کی اور خاموشی سے اپنی آنکھوں کو بند کیے کچھ دیر سکون سے اپنے فیصلے کے بارے میں سوچنے لگی جو آج پہلی بار اُس نے زارون کے لیے کیا تھا۔

”میں چاہتی تو تم سے بدلہ لینے کے لیے زین سے بات کر سکتی تھی پر میں نے آج تمہاری خاطر اُسے چھوڑا کیوں کہ اب تم جو بھی ہو، جیسے بھی ہو میرے شوہر ہو۔ بے شک نام کے ہی سہی پر جو پاک رشتہ میرا تمہارے ساتھ ہے اسے اللہ نے میرے لیے چنا ہے۔ اس لیے میں اس میں کبھی بھی بد دیانتی نہیں کروں گی، چاہے میں ابھی تمہیں خود پر کوئی حق نہ دوں۔ چاہے میں جتنا مرضی تم سے لڑوں پر زندگی میں کبھی بھی میں کسی اور کے ساتھ کوئی رشتہ رکھ کر نہ تو میں اپنی ذات کو گندرا کروں گی اور نہ ہی اس آڑ میں تم سے کوئی بدلہ لوں گی۔ میں نے آج تمام فیصلے اپنے رب پر چھوڑ دیے ہیں پر جو تم نے کیا؟ میں چاہ کہ بھی تمہیں معاف نہیں کر سکتی،“ زارون کو تصور میں لاتے ہوئے اُس نے کہا اور ایک لمبی سانس لیتے خود کو پر سکون کرنے کی کوشش کی اور کلاک پر گیارہ بجتے دیکھ کر انٹھ کر نماز پڑھنے لگی۔



دعانے کمرا صاف کرنے کے بعد ملانکہ کو وہاں لا کر بٹھایا اور خود عمر کے بلا نے پر اُس کی بات سننے چلی گئی تو ملانکہ نے اُس کے جاتے ہی کمرے کا جائزہ لیا جس میں کچھ دیر پہلے سب کچھ بکھرا ہوا تھا۔

”پتا نہیں کیا سمجھتی ہے خود کو یہ عورت لیکن میرا نام بھی ملائکہ ہے ناک سے لکیریں نہ نکلوادیں تو میرا نام بدل دینا،“، خود کلامی کرتے اُس نے اپنی اور اپنے ماں باپ کی بے عزتی کا بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور دروازہ کھلنے کی آواز پر جلدی سے سر جھکاتے بیٹھ گئی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم اس گھر میں بیاہ کر آگئی ہو تو خالدہ بیگم سے جیت جاؤ گی؟“، جنید کے بجائے زنانہ آواز پر اُس نے سراٹھا کردیکھا تو سامنے خالدہ بیگم اپنے پورے جلال کے ساتھ کھڑی اُسے گھور رہی تھیں۔

”تو آپ کو کیا لگتا ہے ملائکہ ہارنے کے لیے پیدا ہوئی ہے؟“، جواب کے بجائے اُس نے نذر ہو کر اُن کے سامنے کھڑے ہوتے سوال کیا تو خالدہ بیگم اُس معصوم نظر آنے والی لڑکی کی ڈیری ہگز کی زبان دیکھ کر تھوڑا بوکھلا میں پر جلدی ہی خود پر قابو پاتے پھر سے گویا ہوئیں۔

”اووہ مطلب کم ذات ہونے کے ساتھ ساتھ تم کافی بد زبان بھی ہو،“، ایک نظر اُس کے ماتھے پر پڑتے بل دیکھ کر خالدہ بیگم نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھتے طرز کیا۔

”جی بالکل لیکن میری بد زبانی کا لیوں آپ سے تھوڑا نیچے ہی ہے سا سو ماں! میں کوشش کروں گی کہ آپ کے ساتھ رہ کے یہ لیوں آپ کے مطابق کر سکوں،“، ملائکہ نے چہرے پر معصومیت سجائے جتنے آرام سے خالدہ بیگم کو آگ لگائی وہ اُتنی ہی تیزی سے اُس کے اوپر چھپیں۔

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی مجھ سے زبان چلاتی ہے،“، اپنے دونوں ہاتھ اُس کے گلے کی جانب بڑھاتے اُنہوں نے چیختے ہوئے کہا تو ملائکہ نے اپنے بچاؤ کے لیے اُنہیں پیچھے کی جانب دھکا دیا۔

”خبردار اگر دوبارہ مجھ پر ہاتھ اٹھایا یا مجھے پر یوں چلا میں تو میں سارے لحاظ بھول کر آپ کو آپ کی اوقات یاد دلانے میں ایک سینکڑ نہیں لگاؤں گی،“، انگلی اٹھاتے خالدہ بیگم کوختی سے وارن کرتے وہ

جلدی سے آنکھوں میں آنسو لیے جنید کی جانب بڑھی جواب بھی ابھی شور کی آواز پر کمرے میں آیا تھا۔

”جنید دیکھو آنٹی مجھے مارنے کی کوشش کر رہی ہیں“، ملائکہ نے باقاعدہ روتے ہوئے بتایا تو جنید نے حیرت سے خالدہ بیگم کی طرف دیکھا جو اس کی لڑکی کی ہوشیاری پر خود بھی حیران تھیں۔

”امی کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کیوں آپ ملائکہ کو مار رہی تھیں؟“ جنید نے اُسے خود سے الگ کرتے خالدہ بیگم کے قریب آتے پوچھا تو انہوں نے نفی میں سر ہلا�ا۔

”میں ۔۔۔ نے اسے کچھ۔۔۔ نہیں کہا بلکہ یہ خود“، خالدہ بیگم نے وضاحت دینی چاہی مگر اس سے پہلے ہی جنید نے ہاتھ اٹھاتے انہیں روکا۔

”پلیز امی اب مزید کوئی بات کر کے خود کو میری نظر وہ میں اور مت گرائیے گا اور اگر آپ کو ملائکہ پسند نہیں تو مہربانی ہو گی اس سے دور رہیں“، ہاتھ جوڑتے ہوئے اُس نے خالدہ بیگم سے کہا جن کی نظریں پچھے کھڑی ملائکہ پر تھیں جو جنید کی باتوں پر مسکراتے ہوئے افسوس میں سر ہلاتے ان کو مزید طیش دلا چکی تھی۔

جنید کی بات سنتے اور ملائکہ کے سامنے اپنی ایک نہ چلتی دیکھ کر خالدہ بیگم کچھ کہے بغیر ہی غصے میں بھری اپنے کمرے میں آگئیں جہاں سلیم صاحب کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اب کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹے تھے۔

”کہاں تھی تم؟“، ان کے دھرم سے دروازہ بند کرنے پر انہوں نے آنکھیں کھولتے سوال کیا۔

”جہنم میں گئی تھی“، غصے سے تملکاتے ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہر چیز کو آگ لگادیں۔

”تو پھر واپس کیوں آئی ہو وہیں رک جانا تھا“، سلیم صاحب نے ان کے غصے کی پرواکیے بغیر بات کو مذاق کارنگ دیا تو خالدہ بیگم نے کھا جانے والی نظر وہ سے انہیں دیکھا۔

”بہت باتیں آگئی ہیں آپ کو اور میں نے کہا تھا ناجو فیصلہ کرنا ہے سوچ سمجھ کر تجھے گا پر انہیں آپ کو

تو بس بیٹھ کی خواہش پوری کرنے کی پڑی تھی اور بڑا کہہ رہے تھے آپ کہ بہت اچھی ہے ملائکہ، بہت معصوم اُس کے منہ میں تو زبان ہی نہیں اب میں اگر آپ کو آپ کی پیاری بہو کے کرتوت بتا دوں تو اپنے بیٹھ کی طرح آپ بھی میری بات کا یقین نہیں کریں گے، مسلسل کمرے میں چکر لگاتے انہوں نے اپنے نصیب کو کوسا۔

”اچھا بس کرو اور اتنا غصہ تمہاری صحت کے لیے اچھا نہیں اس لیے سکون سے بیٹھ جاؤ جو ہونا تھا وہ تو اب ہو گیا“، سلیم صاحب نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی پرانی کی بات سننے ہی خالدہ بیگم کو پنگے لگ گئے۔

”میں کبھی بھی سکون سے نہیں بیٹھوں گی اور جب تک یہ لڑکی میرے گھر میں ہے میں اُسے بھی سکون نہیں لینے دوں گی“، غصے سے چیختنے ہوئے انہوں نے سلیم صاحب کا ہاتھ جھٹکا اور انٹھ کر باہر صحن میں چل گئیں۔

”اُف یہ عورت کبھی نہیں سدھرے گی“، اُن کے جاتے ہی سلیم صاحب نے سوچا اور تھکاوٹ کی وجہ سے مزید کسی بحث میں پڑنے کے بجائے سکون سے کمبل اور ڈھنے سونے کی کوشش کرنے لگے۔



صحح نور کی آنکھ پر نسز کے بولنے سے کھلی جو اُس کے قریب بیٹھی اُسے جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”کیا مسئلہ ہے تمہیں“، اُس کا پنجھہ اپنے چہرے سے ہٹاتے نور نے کروٹ بد لی اور کلاک پر نظر پڑتے ہی وہاں بارہ بجتے دیکھ کر وہ فوراً سے انٹھ کر بیٹھی۔

”اللہ اتنا طامٰہ ہو گیا“، اپنے بال سیمٹتے ہوئے اُس نے پرنسز کو دیکھا جو شاید بھوک کی وجہ سے اُسے جگا رہی تھی۔

”بھوک لگی ہے؟“ اُسے انٹھا کر اپنی گود میں بٹھاتے نور نے پوچھا تو وہ اپنی مخصوص زبان میں

بولتے اُس کی گود سے نکل کر باہر چلی گئی۔

”لگتا ہے جلا دا بھی تک سور ہا ہے،“ کمبل سائیڈ پر کرتے وہ باہر آئی اور زارون کے کمرے کا دروازہ بند کیکھ کر خود کلامی کرتے کچن کی جانب بڑھی جہاں ابھی ابھی پنسزا پنا باوں میں اٹھا کر لائی تھی۔

”دودھ پینا ہے؟“ نور نے اُسے فرنچ کے پاس بیٹھا دیکھ کر سوال کیا جواب اُس کی بات سننے کے بعد اپنا باوں نیچے رکھتے گول گول چکر کاٹ رہی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ فرنچ کے قریب آتے ہی اُس کے دروازے پر ایک چٹ لگی دیکھ کر نور نے اُسے اُتارا اور پنسزا کو بے چین دیکھ کر اُسے کھولنے کے بجائے پہلے دودھ نکال کر اُس کے باوں میں ڈالا اور پھر اُس چٹ کو کھولتے باہر چیز پر آبیٹھی۔

”میں نے ناشتہ بنایا کر رکھ دیا ہے ٹائم سے کر کے دوائی کھالینا اور میں شام پانچ بجے تک آ جاؤں گا۔“ تم تیار رہنا میں واپس آ کر تمہیں مارکیٹ لے کر جاؤں گا تاکہ تم کل یونیورسٹی جانے کے لیے اپنی کتابیں اور باقی سامان لے سکو،“ کاغذ پر لکھے الفاظ پڑھتے اُس کو زارون کی حرکت پر ہنسی آئی جو صرف اپنی ناراضی کے اظہار کے لیے اُسے جگانے کے بجائے یہ چٹ فرنچ پر لگا کر گیا تھا۔

”توبہ کتنی گندی لکھائی ہے شکل سے ہی ان پڑھ لگتا ہے اور عقل کے خانے میں بھی لگتا ہے بھوسا بھرا ہے جو سیل پہ میسح کرنے کے بجائے اپنی خوب صورت لکھائی میں پیغام لکھ کر فرنچ پر لگا گیا،“ دو تین بار پڑھنے کے بعد بھی جب نور کو آخری دو الفاظ کی سمجھنہ آئی تو اُس نے بے زاری سے کہتے چٹ ٹیبل پر رکھی اور اٹھ کر کمرے میں چلی گئی تاکہ فریش ہو کر ناشتہ کر سکے۔



زارون اپنا کام وغیرہ ختم کرنے کے بعد عالیان کے پاس آگیا جو آج صحیح ہی کراچی سے واپس آیا

تھا۔

”تو پھر کیسی گزر رہی ہے زندگی؟“ چائے کا کپ اُس کے سامنے رکھتے عالیان نے چیز پیچھے کر کے اُس کے قریب بیٹھتے پوچھا تو زارون نے جواب دینے کے بجائے کپ انٹھا کر چائے کا گھونٹ لیا۔ ”کیا ہوا اتنے خاموش کیوں ہو؟ سب ٹھیک ہے نا اور بھا بھی؟“ اُسے سنجیدگی سے چائے پیتا دیکھ کر عالیان کو فکر ہوئی۔

”بھاڑ میں گئی تمہاری بھا بھی قسم سے اتنی بد تیز اور بد دماغ لڑکی ہے کہ اُسے میری کوئی بھی بات سمجھنہیں آتی،“ کپ زور سے ٹیبل پر پڑختے اُس نے نور کا ذکر سننے ہی غصے سے کہا۔ ”ہاہا تو یہ بات تھی ویسے شکل سے تو وہ کافی معصوم لگتی ہیں،“ عالیان نے زارون کی طرف دیکھے بغیر تبصرہ کیا۔

”شکل سے ہی معصوم ہے بس ویسے تو پوری چڑیل ہے ایسے رکھ رکھ کر مجھے طعنے مارتی ہے کہ نہ پوچھو اور یہ تم نے کب اُسے اتنے غور سے دیکھا جو تمہیں پتا کہ وہ معصوم لگتی ہے؟“ زارون نے جواب دینے کے ساتھ ہی اُس کی بات پر غور کرتے ابر واچکا تے پوچھا۔

”بس کرو یار میں نے کیوں غور کرنا ہے ویسے ہی اندازہ لگایا کہ معصوم ہیں تب ہی تمہارے جال میں پھنس گئیں چالاک ہوتی تو کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیتیں،“ عالیان نے آسانی سے اپنی بات مکمل کی یہ سوچ بغیر کہ زارون کو اُس کی بات کتنی بُری لگی ہے۔

”میں نے کوئی جال میں نہیں پھنسایا پسند تھی مجھے تو سیدھا سیدھا نکاح کیا۔ بے شک زبردستی ہی پر تمہاری طرح کسی کو جھوٹی امیدوں اور دلاسوں میں نہیں رکھا،“ زارون نے اُس کی طبیعت صاف کرنے میں ایک سینکنڈ لگایا اور اپنا موبائل اور چاپی اٹھاتے اُس کی مزید کوئی نصیحت یا بکواس سننے سے پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب کیا ہوا؟ کہاں جا رہے ہو؟“ اُسے اٹھتا دیکھ کر عالیان نے بھی کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

”جہنم میں جا رہا ہوں اور میں یہاں کچھ دیر سکون کے لیے آیا تھا تاکہ تم سے بات کر کے اپنے دماغ کا کچھ بوجھ ہلکا کر سکوں پر تمہاری فضول بکواس نے میرا مزید دماغ خراب کر دیا ہے“، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے اپنے راستے سے ہٹاتے وہ اُس کے روکنے پر بھی نہیں رکا۔

☆☆☆

حارت کی اُس دن کی ڈھمکی کے بعد فریحہ بیگم کا پارہ کافی چڑھا ہوا تھا جسے سارہ نے سمجھا بجھا کر تھوڑا نیچے کیا پر آج ناشتے کے وقت حارت کی بد کلامی پر انہیں سکندر صاحب سے بات کرنی پڑی جو طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے آج گھر میں ہی تھے۔

”بھائی صاحب مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی“، فریحہ بیگم نے کمرے میں آتے انہیں اخبار پڑھتا دیکھ کر اپنی جانب متوجہ کیا۔

”ہاں بولو“، اخبار ایک طرف رکھتے انہوں نے فریحہ بیگم سے کہا جوان کے قریب بیٹھ چکی تھیں۔

”میں نے آپ سے حارت کے متعلق بات کرنی تھی“، فریحہ بیگم نے بات کے آغاز کے لیے تمہید باندھی۔

”کیوں کیا ہوا حارت کو؟“ اپنی عینک اُتارتے ہوئے انہوں نے کچھنا سمجھی سے سوال کیا۔

”اُسے کچھ نہیں ہوا، بس کچھ دنوں سے پتا نہیں کیوں وہ مجھ سے کھنچا کھنچا سا ہے۔ نہ ٹھیک سے بات کرتا ہے بس ہر وقت لڑنے کو دوڑتا ہے“، فریحہ بیگم نے دو چار باتوں کا اضافہ خود سے کر کے سکندر صاحب کو بتایا جو خود بھی کچھ دنوں سے حارت کے رویے میں آتی تبدیلی کو محسوس کر چکے تھے۔

”ہم تم پریشان نہ ہو مجھے پتا ہے وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے“، فریحہ بیگم کے سر پر ہاتھ رکھتے سکندر

صاحب نے انہیں تسلی دی۔

”مطلوب کیوں کر رہا ہے وہ یہ سب؟“ آنکھوں میں آنے والے مصنوعی آنسوؤل کو صاف کرتے انہوں نے سوالیہ نظروں سے سکندر صاحب کی طرف دیکھا۔

”اس لیے تاکہ ہم اُس کی دھمکی سے ڈر کر نور کو اُس کا حصہ دے دیں پر میں ایسا کبھی نہیں کروں گا اُس بد کردار لڑکی کی نہ میرے دل میں کوئی جگہ ہے اور نہ ہی اس گھر میں۔“

”پر بھائی صاحب اگر حارث نے اپنے حصے کی تمام جائیداد اُس کے نام کر دی تو؟“ سکندر صاحب کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی فریجہ بیگم نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”میرے جیتے جی تو ایسا کبھی نہیں ہوگا اور ابھی بھی پاور آف اٹارنی میرے پاس ہی ہے اور میرے دستخط کے بغیر کوئی بھی میری جائیداد کونہ تو نیچ سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور کے نام کر سکتا ہے۔ اس لیے تم فکر مت کرو اور سارہ کی رخصتی کی تیاری شروع کرو تاکہ اب ہم جلد از جلد اس فرض سے بھی سبکدوں ہو جائیں،“ سکندر صاحب نے تمام بات تفصیل سے بتانے کے بعد فریجہ بیگم سے کہا جوان کی پاور آف اٹارنی کی بات سُن کر سکتے میں چلی گئیں۔

”کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ اُن کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر سکندر صاحب نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ج۔۔۔ ج۔۔۔ جی بھائی صاحب میں ٹھیک ہوں اور آپ نے بہت اچھا کیا جو سب کچھ ابھی بھی اپنے ہاتھ میں رکھا ورنہ ان بچوں کا کیا اعتبار کب اور کس وقت بدلت جائیں،“ ماتھے پر آنے والے پسینے کو صاف کرتے انہوں نے خود کو سنبھالتے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجا تے دل میں سکندر صاحب کو کوسا جن کا اس عمر میں پہنچ کر بھی اتنا دماغ چلتا تھا۔

عالیان کے اپارٹمنٹ سے نکلتے ہی وہ گھر آنے کے بجائے بے مقصد ہی گاڑی کو سڑکوں پر دوڑانا رہا اور اب دو گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد تھک ہار کر اُس نے گاڑی گھر کے راستے پر ڈالی اور کچھ دیر میں اپارٹمنٹ پہنچتے اُس نے اپنے پاس موجود چابی سے لاک ھولا اور اندر داخل ہوتے ہی کھانے کی خوشگواری مہک نے اُس کا استقبال کیا۔

”لگتا ہے آج میدم پھر سے مجھ سے بدلاہ لینے کے چکر میں ہے“، کوٹ صوف پر رکھتے وہ بندھی کی جانب بڑھا تو وہاں کسی کونہ پا کر اُس نے ایک نظر کمرے کے کھلے دروازے کو دیکھتے آگے بڑھتے کڑھائی کا ڈھکن اٹھایا جس میں خوش شکل ہی بھاپ اڑاتی بریانی موجود تھی۔

”اُف اب تو میں انکار بھی نہیں کر پاؤں گا“، ڈھکن واپس اوپر رکھتے زارون نے خود کلامی کی اور نور کی تلاش میں کمرے کی جانب آیا جہاں وہ اور پنسز بیڈ پر مزے سے سور ہی تھیں۔

”شوہر رات سے خفا ہے اور بیوی کو پرواہی نہیں“، باہر جانے کے بجائے اُس نے قدم بیڈ کی جانب بڑھائے اور اُس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”لگتا ہے آج میرے دل میں جگہ بنانے کے ساتھ ساتھ تم نے میرے ہوش اڑانے کا بھی سارا انتظام کر رکھا ہے“، اُس کے بالوں کو چہرے سے ہٹاتے زارون نے ایک بھر پور نظر اُس پر ڈالی جو سیاہ رنگ کی فراک اور ٹراوَزر کے ساتھ اُسی رنگ کا دوپٹہ (جو اُس کی بے خبری کی وجہ سے آدھا اُس کے اور آدھا پنسز کے اوپر تھا) لیے ڈھلے ہوئے شفاف چہرے کے ساتھ سکون کی نیند سور ہی تھی۔

”اُف فف مجھے یہ تو پتا تھا کہ تم پیاری ہو پر اتنی زیادہ ہو آج پتا چلا“، اُس کے بالوں کو کندھے سے ہٹاتے زارون کو اپنا آپ بے بس سالگنے لگا تب ہی اُس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے اُسے آہستگی سے سیدھا کیا اور اُس کی نیند کی پرواکیے بغیر بے خود سا ہو کر اُس کی گردان پر جھکا تو نور جوابھی کچھ دیر پہلے ہی کاموں سے فارغ ہو کر نہا کر سوئی تھی اُس نے کسی احساس کے تحت آنکھیں کھولیں اور پوری طرح

بیدار ہوتے زارون کو اپنے اوپر جھکا دیکھ کر اس کے لمس پر گھبرا تے ہوئے جلدی سے اُسے خود سے الگ کرنے کی کوشش کی۔ جو شاید اُس کی سننے کے موڑ میں نہیں تھا تب ہی اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیتے وہ اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔

”کیا بے ہودگی ہے یہ؟“، ہمت کر کے اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے سینے پر رکھتے زور سے پیچھے کی جانب دھکا دیا اور جلدی سے اپنا دوپٹہ پرنسز کے اوپر سے کھینچتے ہوئے اٹھ کر بیٹھی۔  
”کون سی بے ہودگی؟“

”بیوی ہوتم میری اور یہ سب میرا حق ہے،“ اُس کے چینخے پر زارون نے ہوش میں آتے اپنی سبک چھپانے کے لیے لاپرواٹی سے کہا۔

”کون سا حق؟ میں صرف نام کی بیوی ہوں تمہاری اور جس حق کی تم بات کر رہے ہو نا وہ حق تم اُسی دن کھو چکے ہو جب تم نے مجھے سب کے سامنے ذلیل کیا میرے اپنوں کو مجھ سے دور کر دیا اور اگر تم نے نکاح ہی کرنا تھا تو میرے گھروالوں کو مناتے اُن کی مرضی سے کرتے تو آج شاید میں تمہیں کسی بات سے نہ روکتی۔ نہ ہی یوں بار بار تمہیں اذیت دیتی اور نہ ہی خود کو، پر یہ اذیت تمہاری اپنی خریدی ہوئی ہے۔ اس لیے دوبارہ میرے قریب آئے تو میں خود کو آگ لگا لوں گی،“ اپنی تیز ہوتی سانسوں کو بحال کرتے وہ اٹھنے لگی جب زارون نے اُس کا ہاتھ پکڑتے اُسے روکا۔

”کیا تم اس بات کو بھول نہیں سکتی؟“ غصے کے بجائے زارون نے اُس کے طعنوں اور تلخ رویے کو نظر انداز کرتے ضبط سے پوچھا۔

”کبھی نہیں، میں مرتے دم تک نہ یہ بات خود بھولوں گی اور نہ ہی تمہیں بھولنے دوں گی،“ نظروں میں نفرت لیے اُس نے زارون کا ہاتھ جھٹکا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”ہم تو میں بھی تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم نہ صرف اس بات کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ گی بلکہ مجھے

سے مجھ سے بھی زیادہ محبت کرنے لگوگی اور ایک دن ایسے ہی میرے لیے بے چین ہوگی جیسے آج میں بے چین ہوں، اُس کے جاتے ہی زارون نے سوچا اور اُس کے پیچھے جانے کے بجائے وہیں بیٹھ کر پنسز کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا جو نور کے دوپٹہ کھینچنے سے اٹھ گئی تھی اور اب اُس کے غصے سے ڈر کر زارون کے قریب بیٹھ چکی تھی۔



وقت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا، نور نے دوبارہ سے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا جہاں خدیجہ کی شکل میں ایک مخلص دوست کے ساتھ نے اُسے کافی حد تک حالات سے مقابلہ کرنے کی طاقت دی پر ایک مہینہ گزرنے کے بعد بھی اُس کا رو یہ زارون کے ساتھ تبدیل نہیں ہوا حالانکہ اس تمام وقت میں زارون نے اُسے ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کی۔ وہ ہر کام اُس کی مرضی کے مطابق کرتا اُس کی ہر ضرورت، ہر خواہش کو اُس کے کہنے سے پہلے ہی پورا کر دیتا مگر نور کا دل تھا کہ کسی صورت بھی اُس کی طرف مائل ہونے کو تیار نہ تھا۔ وہ ہر کام اپنی مرضی سے کرنے کے باوجود بھی زارون سے لڑنے کا یا اُسے طعنے دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ آج بھی صبح زارون نے اُسے ناشتہ بنانے کا کہا تو اُس نے لاپرواٹی سے اُس کی بات ان سنی کر دی۔

”نور ناشتہ بنادو مجھے دیر ہو رہی ہے“، زارون نے دوسری بار آواز لگائی تو اُس نے غصے سے کتاب بند کی اور منجھی میں جانے کے بجائے ساتھ والے کمرے میں آگئی جہاں زارون پچھلے ایک مہینے سے رہ رہا تھا۔

”تم خود نہیں بناسکتے کیا اور میرا پیپر ہے کل میں تمہاری فرمائیں پوری کرنے کے لیے فارغ نہیں بیٹھی“، اُسے ٹائی گاتا دیکھ کر نور نے اپنی بات مکمل کی اور واپس اپنے کمرے میں آگئی۔

”سوری مجھے نہیں پتا تھا کہ تمہارا کل پیپر ہے ورنہ میں تمہیں کبھی بھی تنگ نہیں کرتا“، اُس کے پیچھے

ہی کمرے میں آتے زارون نے معدرت کی تو نور نے کتاب سے نظر اٹھا کر اسے گھورا۔

”تواب پتا چل گیا ہے نا تو پلیز میرا سرمت کھاؤ اور جاؤ یہاں سے مجھے پڑھنا ہے“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے بد تیزی سے اُس کے آگے ہاتھ جوڑے تو زارون نے ایک افسوس بھری نظر اس پر ڈالتے باہر کا رخ کیا اور اپنی باقی تیاری مکمل کرتے ناشتہ کیے بغیر ہی آفس کے لیے نکل گیا۔ زارون کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی ماں نے دروازے پر دستک دی تو نور کا پارہ پھر سے ہائی ہو گیا۔

”اس گھر میں میری جان کو کہیں بھی سکون نہیں ہے خود تو نواب آرام سے آفس چلا جاتا ہے اور میں سارا دن کبھی ماں سے کام کرواؤں کبھی کھانا بناؤں“، خدیجہ ٹھیک کہتی ہے میں نے بہت زیادہ سرپہ چڑھالیا ہے زارون کو نور نے کمرے سے نکل کر باہر کے دروازے تک آتے منہ میں بڑا بڑا ہٹ جاری رکھی۔

”سلام بی بی جی“، ریحانہ نے آتے ہی سر پر ہاتھ رکھتے خوش دلی سے اُسے سلام کیا جو سلام کا جواب دیتے ہی اُسے جلدی جلدی تمام کام سمجھاتے واپس اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

”لگتا ہے بی بی جی کا دماغ آج پھر سے گرم ہے“، نور کے غصے سے اندازہ لگاتے ریحانہ نے اپنی شامت آنے سے پہلے ہی کام شروع کر دیا۔

”اُفف ایک تو یہ اکنا مکس میرا دماغ خراب کر دے گی آج، کمرے میں آتے ہی نور نے ایک نظر بیڈ پر بکھرے نوٹس کی طرف دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے موبائل اٹھا کر خدیجہ کو کال ملائی تاکہ اُس سے کچھ مدد لے سکے۔ ایک گھنٹہ اُس سے با تیک کرنے کے بعد اُس نے ریحانہ کو کمرے میں آتا دیکھ کر خدیجہ سے پھربات کرنے کا کہتے کال کاٹ دی۔

”وہ بی بی جی میں نے سارا کام کر دیا ہے بس آپ کے کمرے کی صفائی رہتی ہے۔ آپ بتا دیں کہ دوں یا کل کرنی ہے؟“، ریحانہ نے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

”کر دو اور پنسز کھاں ہے؟“ اپنے تمام نوٹس اور کتابیں اکٹھی کر کے ایک طرف رکھتے اُس نے پنسز کے متعلق پوچھا جو آج صحیح سے ہی اُسے نظر نہیں آئی تھی۔

”جی وہ صاحب جی کے کمرے میں بیٹھی ہے، مجھے لگ رہا ہے اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں“، ریحانہ نے نور کے قریب ہی نیچے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا تم صفائی کرو میں دیکھتی ہوں“، اپنے موبائل پر خدیجہ کے فون کے درمیان زارون کے آنے والی دس مسڈ کا لزکو دیکھتے اُس نے ریحانہ سے کہا اور موبائل اٹھاتے دوسرے کمرے میں آگئی جہاں پرسز سامنے صوف پر ادا سی بیٹھی تھی۔

”کیا ہوا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو؟“ موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر پرسز کو اپنی گود میں بٹھاتے نور نے نرمی سے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے پوچھا تو وہ اُس کے ساتھ اپنا سر لگاتے بولنے لگی۔

”تمہیں تو بخار ہے“، نور نے اُس کے سر کو ہاتھ لگایا جو ضرورت سے زیادہ گرم تھا اور فکر مندی سے اُس کی سرخ آنکھوں کو دیکھنے لگی کہ اتنی دری میں پھر سے اُس کا موبائل نج اٹھا۔

”ایک تو اس انسان کو کہیں سکون نہیں“، زارون کا نمبر دیکھتے ہی اُس نے تیوری چڑھائی اور کال ریسیو کرتے موبائل کان سے لگایا۔

”کہاں تھیں تم؟ میں کب سے کال کر رہا ہوں“، سلام دعا کے بغیر ہی زارون نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

”گھر ہی ہوں، میرے رشتے دار تو ہیں نہیں جن کی طرف جانا تھا؟“ کندھے اچکاتے اُس نے زارون کے بے نکے سے سوال پر سمجھنکرنے جواب دیا۔

”کس کے ساتھ بات کر رہی تھیں؟ اور جب میں بار بار کال کر رہا تو تم پہلے میرا فون سن لیتیں“۔

”کیوں سن لیتی اور میں جس سے بھی بات کروں تم سے مطلب“، نور نے اُس کی بات مکمل

ہونے سے پہلے ہی ٹوکا۔

”افف ایک تو تم ہر وقت لڑنے کے لیے تیار رہا کرو بس“، زارون نے اشارے سے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا بولتے تیزی سے باہر کی جانب جاتے نور سے کہا۔

”مطلوب کی بات کرو میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ مجھ سے زیادہ فری ہونے کی کوشش مت کیا کرو“، ترڑخ کر کہتے اُس نے موبائل دوسرے کان کے ساتھ لگایا۔

”میں ہو یہی جارہا ہوں دی جان مطلب میری دادی کی طبیعت خراب ہے اس لیے تم ماسی کے جانے کے بعد دروازہ اچھے سے لاک کر لینا اور پلیز کوئی لاپرواٹی مت کرنا“، زارون نے گاڑی میں بیٹھتے اُسے سمجھایا جو دل ہی دل میں اپنی آزادی پر خوش تھی۔

”اوے میں کوئی بچی نہیں ہوں جو مجھے ایسے لیکھر دے رہے ہو اور تم سکون سے جاؤ میں اپنا خیال رکھ سکتی ہوں“، کہتے ہوئے اُس نے اُسے پنسز کے بخار کے متعلق بتایا تو زارون اُسے دوائی کے متعلق بتانے لگا جو پرنسز کو دینی تھی۔

ریحانہ کے جاتے ہی نور نے زارون کی ہدایت پر عمل کرتے دروازے کو اچھے سے لاک کیا اور پرنسز (جس کا بخار دوائی سے کافی حد تک کم ہو گیا تھا) کوئی وی پہاٹھ مارتاد لیکھ کر اُسے ٹوی آن کر کے کار ٹوں لگا کر دیے اور ریموٹ واپس صوفے پر رکھ دیا جسے جلدی سے پنسز نے اپنا ہاتھ اوپر رکھ کر اپنے قبضہ میں لے لیا۔

”تو بہ کتنی چالاک ہے“، نور نے اُس کی حرکت پر مسکراتے سر جھٹکا اور اُسے ٹوی میں مصروف دیکھ کر خود بھوک محسوس ہونے پر کچن میں چل گئی تاکہ اپنے لیے کچھ کھانے کو بناسکے۔

”ویسے کتنا سکون سا ہے آج نہ کوئی شور ہے نہ کوئی لڑائی“، چائے کا پانی چولہے پر رکھتے اُس نے زارون کی غیر موجودگی پر شکر ادا کیا کہ کچھ گھنٹوں کے لیے ہی سہی پر اُس جلا دے اُس کی جان چھٹی۔

”آج میں اپنی مرضی سے سب کروں گی ایسا کرتی ہوں خدیجہ کو بُلا لیتی ہوں،“ نور نے سوچتے ہوئے اپنے خیال پر خود کو داد دی اور کمرے سے موبائل لینے چلی گئی تاکہ خدیجہ کو کال کر کے بُلا سکے پر دو تین بار ڈال کرنے بعد بھی دوسری طرف اُس کا نمبر بند کیا کر نور کو حیرت کے ساتھ پریشانی بھی ہوئی۔

”اس کا نمبر تو کبھی بند نہیں ہوا تو آج کیوں ہے؟“ خود سے سوال کرتے اُس نے واپس نمبر ملا یا جو ابھی بھی بند تھا۔

”چلو کچھ دیر میں ٹرائی کرتی ہوں ہو سکتا ہے کہیں مصروف ہو یا موبائل کی بیٹری لو ہو،“ خود سے ہی اندازہ لگاتے اُس نے چائے کو ابتداء کیا کر جلدی سے چولہا بند کیا اور موبائل شیلف پر رکھتے اپنے لیے بسکٹ اور کیک نکال کر پلیٹ میں رکھتے باہر لا ونج میں پرنسز کے پاس آبیٹھی جو کیک دیکھتے ہی ریموٹ چھوڑے اُس کے پاس آ چکی تھی۔

”بہت بھوکی ہو،“ اُسے کیک کو دیکھ کر بولتا دیکھ کر نور نے منہ بسورا اور کیک کے دو حصے کرتے ایک اُس کے سامنے رکھا اور دوسرا خود کھانے لگی۔

چائے ختم کرنے کے بعد وہ کچھ دیر پرنسز کے ساتھ بیٹھی ٹوی دیکھتی رہی اور پھر پیپر کا یاد آتے ہی ٹوی بند کرتے اُسے بھی اپنے ساتھ اٹھا کر کمرے میں لے آئی جو بار بار باہر کی جانب جاتے اُسے دوبارہ سے ٹوی دیکھ کر نے کا کہہ رہی تھی۔

”اُف ایک تو یہ بچوں سے بھی چار ہاتھ آگے ہے،“ نور نے اُس کے بولنے سے تنگ آ کر کتاب بند کی اور اپنے موبائل پر ٹام اینڈ جیری لگا کر اُس کے سامنے کیا تو وہ جلدی سے بیڈ پر بیٹھتے خاموشی سے اسکرین کی طرف دیکھنے لگی۔

”اب اس پہ ناخن مت مارنا ورنہ تھپٹ کھاؤ گی مجھ سے،“ اُسے بار بار اسکرین پر ہاتھ مارتا دیکھ کر نور نے غصے سے کھا تو پرنسز نے ایک بار اُس کی طرف دیکھ کر اپنا ہاتھ ایک طرف رکھ لیا۔ پڑھنے میں مصروف

اُسے وقت گزر نے کا اندازہ ہی نہیں ہوا اور مغرب کی اذان ہونے پر ہوش آیا تو اُس نے گھڑی کی طرف دیکھا جہاں شام کے چھنگ رہے تھے۔

”اللہ اتنا ٹائم ہو گیا“، ایک نظر سوئی ہوئی پنسز پر ڈال کر اُس نے پردے ہٹاتے موسم کا جائزہ لیا جو دو پھر سے ہی خراب تھا۔

”لگتا ہے آج بارش ہو گی“، پردے پھر سے برابر کرتے اُس نے سوچا اور زارون کا خیال آتے ہی اپنا موبائل اٹھاتے اُس کا نمبر ملایا جو مصروف تھا۔

”ہونہہ پتا نہیں کس سہیلی کے ساتھ مصروف ہے اتنا بھی نہیں پتا کہ رات ہو رہی ہے اور میں گھر پہ اکیلی ہوں“، موبائل کا ن سے ہٹاتے ہی اُسے اب بادلوں کے گر جنے سے خوف آنے لگا تب ہی اُس نے کچھ بھی سوچے بغیر زارون کو دوبارہ سے کال کی۔

”کہاں ہوتم؟ ابھی تک آئے کیوں نہیں؟“، دوسری طرف اُس کی آواز آتے ہی نور نے سلام دعا کے بغیر ہی سوال کیا۔

”بس آرہا ہوں اور میرے موبائل کی بیٹری لو ہے کسی بھی وقت بند ہو جائے گا اس لیے پریشان مت ہونا میں ایک گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا“، زارون جو بارش کی وجہ سے گاؤں کے کچے پکے راستوں میں ڈرائیو کرتا خود بھی الجھا ساتھ انور کے غصے پر مزید بے زار ہوا۔

”سہیلیوں سے باتیں کم کر لینی تھی ناتا کہ موبائل کی بیٹری مجھ سے رابطہ رکھنے کے لیے بچ جاتی“، کہتے ساتھ ہی اُس نے کھٹ سے فون بند کیا تو زارون کو اُس لڑکی پر انہا کا غصہ آیا جس کے لیے وہ اتنی بارش میں ذلیل و خوار ہو کرو اپس جا رہا تھا۔

”بہت دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا اور یہ سب میری نرمی کی وجہ سے ہے“، موبائل ڈیش بورڈ پر پھینکتے زارون نے غصے سے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا اور گاڑی کی اسپیڈ مزید بڑھا دی تاکہ جلدی گھر پہنچ

سکے۔

زارون سے بات کرنے کے بعد نور کو تھوڑی تسلی ہوئی کہ وہ گھر آ رہا ہے اور اُسے رات اکیلے نہیں رہنا پڑے گا پر پھر بھی ایک گھنٹہ کا سنتے اُسے بے چینی ہوئی کیوں کہ جب سے وہ آئی تھی زارون شام پانچ بجے تک گھر آ جاتا اور اُس کے آنے سے وہ بے فکر ہو جاتی۔ پرانج ساتھ چکے تھے اوپر سے موسم بھی کافی خراب تھا جس کی وجہ سے اُسے ڈر کے ساتھ ساتھ گھبراہٹ بھی ہو رہی تھی۔

”اللہ پلیز زارون جلدی آجائے“، نور نے دعا مانگی اور کھانا بنانے کا سوچتے کتابیں اور نوٹس ایک سائیڈ پر کر کے انٹھی پر اس سے پہلے کہ وہ اپنی سوچ کو تمیل دینے کچن میں جاتی لائٹ آف ہو گئی۔

”اُف یہ لائٹ کو کیا ہوا پہلے تو کبھی بند نہیں ہوئی“، نور نے ڈرنے کے بجائے ہمت سے کام لیتے اندر ہیرے میں ڈوبے کمرے کو دیکھا اور ہاتھ مار کر بیڈ سے اپنا موبائل انٹھا کر اُس کی لائٹ آن کی اور باہر دروازہ کھلنے کی آواز پر کمرے سے نکلی۔

”تم نے تو کہا تھا کہ ایک گھنٹے میں آؤ گے تو پھر اتنی جلدی کیسے آگئے“، زارون کو دروازہ لاک کرنا دیکھ کر نور نے حیرت سے اُس کی پشت کو گھورتے ہوئے سوال کیا اور لائٹ لیے اُس کے قریب آئی جس کے پلٹتے ہی اُس کے قدموں کے ساتھ ساتھ زبان کو بھی بریک گئی۔

”کو۔۔۔ کو۔۔۔ ن۔۔۔ ہو۔۔۔ ت۔۔۔ م۔۔۔“ زارون کی جگہ کسی نقاب پوش کو دیکھ کر نور نے آگے بڑھنے کے بجائے وہیں کھڑے سوال کیا تو اُس شخص نے جواب دینے کے بجائے قدم اُس کی جانب بڑھائے۔

”کون ہوتم؟ اور تم اندر کیسے آئے؟“ اُسے اپنے قریب آتا دیکھ کر گھبراہٹ کے مارے موبائل اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرا تو اُس شخص نے اُس کی حالت سے محفوظ ہوتے ہوئے کوئی بھی جواب دینے کے بجائے اپنی پیش رفت جاری رکھی۔

”زارون؟“ اُس کے نقاب میں چھپے چہرے کو دیکھ کر نور کو ایک سینکڑ کے لیے احساس ہوا کہ وہ زارون ہے جو اُسے ڈرانے کے لیے یہ سب کر رہا ہے۔

”لگتا ہے کچھ زیادہ، ہی محبت ہو گئی ہے تمہیں اُس سے جو میرے چہرے میں بھی تمہیں وہی نظر آ رہا ہے،“ زارون کا نام سنتے ہی اُس شخص نے ایک نوک دار چیز نور کے گلے پر رکھتے کہا تو لائٹ آنے پر نور نے اُس کی آنکھوں کو بغور دیکھا جو زارون سے بالکل مختلف تھیں اور اب رہی سہی کسر اُس کی آواز نے نکال دی۔

”کو۔۔۔ ن۔۔۔ ہو۔۔۔ تم اور پلیز تمہیں جو چاہیے لے لو پر میرے قریب مت آنا،“ نور نے تیز دار چاقو اپنی گردن پر دیکھ کر پوری آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔

”اوو! نور میری جان مجھے یہاں سے بھلا کیا چاہیے میں تو صرف تم سے ملنے تمہیں دیکھنے آیا ہوں،“ ایک ہاتھ دیوار پر رکھتے اُس نے اُس کا نام پکارا تو نور نے حیرت اور خوف کے ملے جلنے تاثرات لیے اُس کی جانب دیکھا جو ہلاکا سا جھکتے اُس کے چہرے کے بالکل قریب آ چکا تھا۔

”مجھ سے دور رہو اور کون ہوتم؟“ چاقو کی پرواکیے بغیر اُس نے اُس کے سینے پر ہاتھ رکھتے پیچھے کی جانب دھکا دیا۔

”نه میری جان ایسے تو نہیں چلے گا۔ ایسے تم مجھے دھکے دو گی تو مجبوراً مجھے تمہارے ساتھ زبردستی کرنی پڑے گی جو میں بالکل بھی نہیں چاہتا،“ نور کی مزاحمت پر اُس نے قہقہہ لگایا اور دوبارہ سے اُس کے قریب آتے چاقو کی نوک اُس کے بازو میں پوسٹ کرتے غصے سے کہا۔

”پلیز میں نے کہا نا تمہیں جو چاہیے یہاں سے لے سکتے ہو پر مجھ سے دور رہو،“ اپنی عزت اور جان دونوں خطرے میں دیکھ کر نور نے خود کو مزید مزاحمت کرنے سے روکا۔

”ہاہاہا میں نے پہلے بھی کہا کہ مجھے صرف تم چاہیے ہو کیوں کہ اب مجھ سے مزید برادرست نہیں ہوتا“

کہ تم اُس زارون کے لیے مجھے چھوڑ کر میری چار سال کی محنت کو یوں بر باد کرو، آنکھوں میں سرخی لیے اُس نے لفظوں کو تھی سے ادا کیا اور اُس کا بازو پکڑ کر کمرے کی جانب دھکا دیا تو زمین پر گرنے کے ساتھ ہی اُس کی چیخ نکلی۔

”کیا سمجھتی ہو تم خود کو کہ اتنی آسانی سے مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح الگ کر کے تم سکون سے اپنی زندگی اُس زارون کے ساتھ گزار لوگی جس سے زندگی میں میں نے سب سے زیادہ نفرت کی، اُسے سیدھا کرتے اُس شخص نے نور کے جبڑوں کو اپنے ہاتھ سے دبایا۔

”کون ہوتا؟“ نور نے اُس کا ہاتھ ہٹاتے اُس کے منہ سے بار بار زارون کا اور اپنانام سن کر خوف سے کانپتے ہوئے پوچھا تو اُس شخص نے لنگی میں سر ہلاتے چاقو کی نوک اُس کے گال پر پھیری جس پر نور نے بالکل ساکت ہو کر اُس کی جانب دیکھا جس کی آنکھوں میں خون اُتار آیا تھا۔

”بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم مجھے بھول گئیں اپنے چار سال پرانے دوست کو،“ چاقو کی نوک کو اُس کی آنکھ کے قریب لا کر روکتے اُس نے کہا تو نور نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے اُس کی بات پر غور کیا۔ ”آر جے؟“ اپنے دماغ میں آنے والے نام کی تصدیق کے لیے اُس نے ڈرتے ہوئے اندازہ لگایا۔

”مجھے پتا تھا تم مجھے پہچان لوگی،“ ایک نظر پر نسرا کو دیکھا جو اُس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر ڈر کر بیڈ کے نیچے جا چکھی۔

”نہیں تم آر جے نہیں ہو، تم کیسے ہو سکتے ہو؟“ نور نے اُس کی تصدیق پر بھی بے یقینی سے آنکھوں میں خوف اور زبان میں لڑکھڑاہٹ لے کر لنگی میں سر ہلا�ا۔

”کیوں؟ میں آر جے کیوں نہیں ہو سکتا اور میری جان مجھ سے ڈر کیوں رہی ہو؟“ اُسے کھسک کے تھوڑا اپیچھے ہوتا دیکھ کر اُس نے کہا تو نور نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے آگے جوڑے۔

”پلیز مجھے معاف کر دو اور تمہیں جو چاہیے یہاں سے لے جاؤ، میں نے آخر کیا بگاڑا ہے تمہارا“، اس کی بے باک نظر وہ کو اپنے اوپر دیکھتے نور نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے اٹھنے کی کوشش کی پر اس سے پہلے ہی زین نے اس کے قریب آتے اس کی کوشش کو ناکام بنادیا۔

”تم نے ہی تو بگاڑا ہے سب میرا اور تم تو جنید سے شادی کرنے والی تھی نا اور اس دن یونیورسٹی میں زاروں کے لیے ہاں کیوں کہا؟“ اس کے بالوں کو سختی سے مٹھی میں دبوچے زین نے اس کے چہرے کو اپنے چہرے کے پاس لاتے پوچھا۔

”وہ۔۔۔ میں۔۔۔ پلیز مجھے معاف کر دو“، نور نے اس کی سخت ہوتی گرفت پر آنکھوں سے نکلنے آنسوؤں کو روکتے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے جواب چاقو کی نوک کو اس کی شہرگ پر پھیرتے اس کے الفاظ کا گلا گھونٹ چکا تھا۔

”ایک شرط پر معاف کروں گا“، خوف سے اس کی پھیلتی آنکھوں کو دیکھ کر زین نے ایک سینڈ کے لیے چاقو اس کی گردن پر روکتے اس کی آنکھوں سے نکلنے آنسوؤں کو دیکھا۔

”کیا۔۔۔ ش۔۔۔ ر۔۔۔ ط؟“ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس نے شدت سے اللہ کو یاد کیا اور اپنی مدد کے لیے کسی فرشتے کو بھیجنے کی دعا کی۔

”کچھ زیادہ نہیں بس کچھ حسین لمحے میں تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں وہ بھی آج ہی“، چاقو کو پھر سے اس کے گلے پہلگاتے اس نے اپنی شرط بتائی تو نور نے بالوں میں تکلیف کے باوجود بے یقین سے اسے دیکھا جواب چاقو کی نوک سے اس کی قیمیض کندھے سے پھاڑ چکا تھا۔

”میں تمہارا خون پی جاؤں گی اگر تم نے میرے قریب آنے کی کوشش کی“، اس کی حرکت پر آگ بگولہ ہوتے نور نے اپنے اندر جتنی طاقت تھی اسے جمع کرتے اسے پیچھے کی جانب دھکا دیا اور اٹھ کر باہر کی جانب بھاگی۔ پر اس سے پہلے ہی زین نے ہوشیاری دکھاتے اس کا پاؤں پکڑا تو وہ منہ کے بل

زمین پر گرگئی۔

”میں نے کہا تھا نازیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا ورنہ۔۔۔“، اس کے پاؤں پر چاقو کی نوک سے کراس کا نشان بناتے وہ ہنسا تو درد کے مارے نور کی چیخ فضا میں بلند ہوئی اور ساتھ ہی اس کے پاؤں سے خون نکل کر فرش کو سرخ کرنے لگا۔

”بہت ضری ہوتم۔ میں نے کہا تھا آرام سے میری بات مان لو پر نہیں تمہیں تو ہوشیاری دکھانی تھی،“ درد سے ٹھال ہوتے نور نے سرز میں پر رکھا تو زین نے ایک مکروہ ہنسی ہنسنے سے اس کے قریب آتے ہوئے کہا جس کی آنکھوں کے سامنے اندر ھیرا چھار ہاتھا۔

”بہت شوق ہے نازاروں کو تمہیں ہر کسی کی نظر سے چھپا کر رکھنے کا؟ تمہیں صرف اپنی دسترس میں رکھنے کا؟“ دوپٹہ اس کے گلے سے نکال کر دور پھینکتے وہ مسلسل زہرا گلتے اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا جو درد کی وجہ سے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

”تم دیکھنا میں اُسے ایسی سزا دوں گا کہ وہ زندگی بھریا درکھے گا،“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے اس کے چیخنے چلانے کی پرواکیے بنا، ہی چاقو کی نوک سے اس کے بازو پر ایک اور کراس کا نشان بنایا تو نور کے منہ سے ایک کربناک چیخ نکلی جس کے ساتھ ہی وہ اپنے حواس کھوتے بالکل ساکت ہو گئی۔

مسلسل بارش کے باوجود بھی وہ ایک گھنٹے سے دس منٹ پہلے ہی گھر پہنچ چکا تھا اور اب اپنے پاس موجود اپارٹمنٹ کی چابی نکالتے اس نے دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھتے ہی سامنے نور کے کمرے کے کھلے دروازے سے کسی کو ٹیس کا دروازہ کھول کر بھاگتا دیکھ کر اس نے جلدی سے بیگ و ہیں پھینک کر کمرے کی جانب دوڑ لگائی تاکہ اُسے پکڑ سکے پر نور پر نظر پڑتے ہی وہ ٹیس پر جانے کے بجائے اس کی جانب بڑھا جو خون میں لٹ پت زمین پر پڑی تھی۔

”نور؟ نور آنکھیں کھولو میری جان، دیکھو میں آگیا ہوں،“ اس کی پھٹی قیمض اور بازو سے نکلنے

خون پر زارون کی اپنی حالت غیر ہونے لگی پر پھر بھی ہمت کرتے اُس نے صوف پر پڑا تو یہ اٹھا کر جلدی سے اُس کے بازو پر کھا اور الماری سے چادر نکال کر اُس کے اوپر دی اور مزید کچھ سوچے بغیر اسے اٹھا کر باہر کی جانب بھاگتا کہ جلد از جلد ہسپتال پہنچ سکے۔ نور کو لٹاتے اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گاڑی اسٹارٹ کی اور سڑک پر ڈالتے ہی اُس نے احمد کو کال کرتے نور کی حالت کا بتا کے سب انتظام کرنے کا کہہ دیا تا کہ کوئی بھی تاخیر نہ ہو۔ تیز ڈرائیور کرنے کے باوجود بھی اُسے ہسپتال پہنچتے پہنچتے سات منٹ لگ گئے۔

”کس نے کیا یہ سب؟“ احمد جو پہلے ہی سب انتظام کر چکا تھا اُس نے نور کی حالت دیکھتے ہی پولیس کی وجہ سے زارون سے پوچھا۔

”پتا نہیں بس پلیز تم نور کو دیکھو باقی سب میں سنبھال لوں گا،“ زارون نے کہنے کے ساتھ ہی اپنا مو بال نکالا اور سب سے پہلے عالیان کو کال کر کے ہسپتال آنے کا کہا جوا بھی تک آفس کے کاموں میں مصروف تھا۔

”کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہونا؟“ زارون کا فون سنتے ہی وہ دس منٹ میں ہسپتال پہنچا تو وہاں اُس کی خون سے بھری شرط اور پریشان کن حالت دیکھ کر عالیان کو لگا شاید اُس سے کسی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔

”کچھ ٹھیک نہیں ہے عالیان نور کو کچھ ہو گیا تو میں مر جاؤں گا، پلیز تم احمد سے کہو اسے بچائے،“ زارون نے اُسے دیکھتے ہی اُس کے گلے لگتے کہا تو اُس کے منہ سے نور کا نام سن کر عالیان کو خود حیرت ہوئی۔

”کیا ہوا بھا بھی کو؟“ تم نے کچھ کیا ہے کیا لیکن تم تو حویلی گئے تھے نا تو یہ سب؟“ اپنے ذہن میں آنے والوں سوالوں کو اُس نے گھبراہٹ کے مارے ایک ساتھ ہی پوچھ دیا۔

”پتا نہیں میں گھر آیا تو نور۔۔۔“، زارون نے ایک ہی سانس میں تمام بات تفصیل سے بتائی جسے سن کے عالیان کو خود بھی حیرت ہوئی کہ بلڈنگ میں اتنی سیکیورٹی کے باوجود بھی کوئی ایسا کیسے کر سکتا ہے۔

”اچھا بس تم حوصلہ رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا“، اُس کے منہ سے نور کی حالت کے متعلق سنتے وہ خود بھی کافی فکر مند ہو چکا تھا پر پھر بھی اُس نے زارون کو حوصلہ دیتے وہاں کرسی پر بٹھایا اور وہیں اُس کے ساتھ بیٹھتے آپ پریشن ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

”احمد، نور ٹھیک ہے نا؟“، زارون نے اُسے آئی سی یو سے باہر آتا دیکھ کر جلدی سے اُس کی جانب بڑھتے سوال کیا تو اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر چکے ہیں پر زخم کافی بڑے اور گھرے تھے کچھ دینے کے لیے چکی تھیں، جس کی وجہ سے خون روکنے میں ہمیں کافی وقت لگا اور اب حالات یہ ہیں کہ اس سڑھر دینے کے بعد بھی خون زخموں سے بہرہ رہا ہے جو اگر نہ رکاوے تو بھا بھی کی جان کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، اس لیے بس ہمت رکھو اور دعا کرو“، احمد نے زارون سے کچھ بھی چھپانا مناسب نہیں سمجھا اور کھل کر اُسے سب بتایا تاکہ وہ اپنے دل و دماغ کو ہر خبر کے لیے تیار رکھے۔

”پلیز احمد کچھ بھی کرو پر نور کو بچالو اگر اُسے کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو کبھی بھی معاف نہیں کر سکوں گا“، اُس کی بات سنتے ضبط کے باوجود بھی آنسو بند توڑ کر زارون کی گال پر بہہ نکلے۔

”کیا ہو گیا ہے یا رہت؟ ہمت رکھو اور نا امید مت ہو، ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا“، آج زندگی میں پہلی بار اُسے ہمت ہارتا اور روتا ہوا دیکھ کر احمد کو خود بھی تکلیف ہوئی تب ہی اُس نے آگے بڑھتے زارون کو اپنے ساتھ لگاتے دلا سادیا۔

”میں ٹھیک ہوں تم میری فکر مرت کرو بس تم سے جو ہوتا ہے کرو جتنا پیسہ لگتا ہے لگاؤ۔ جس چیز یا ڈاکٹر کی ضرورت ہے مجھے بتاؤ میں سب کچھ تمہیں یہاں ارتیخ کر کے دوں گا پر میری نور کو بچالو اگر اُسے

کچھ ہوا تو میں اس ہسپتال سمیت ہر چیز کو آگ لگا دوں گا،”، ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو رگڑتے زارون اُس سے الگ ہوا تو احمد نے اُس کی زرد نگت دیکھ کر تسلی دیتے سامنے موجود کرسی پر بٹھایا۔

”میں نے کہانا کہ تم پریشان مت ہواللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا ویسے بھی ہم لوگ تو بس وسیلہ ہیں اصل کام تو اُسی کا ہی ہے اس لیے دعا کرو، اُس کے قریب بیٹھتے احمد نے تسلی دی تو زارون نے غصے سے اُس کا ہاتھ جھٹکا۔

”مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں اور اگر تم لوگوں سے کچھ نہیں ہو رہا تو مجھے بتا دو میں نور کو کہیں اور لے جاؤں گا پر احمد اگر نور کو کچھ ہوا تو یہاں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا،“، غصے اور تکلیف کے ملے جلے تاثرات لیے زارون نے اپنے لبھ کو سخت بناتے اُسے تنبیہ کی جو عالیان کو آتا دیکھ کر زارون کو چھوڑ کے اٹھ کر اُس کے قریب آیا۔

”کہاں تھے تم؟ اور میں نے کہا تھا ان کہ اس کو اکیلامت چھوڑنا،“، احمد نے اُس کے سامنے آتے ہوئے کہا جو پچھلے دو گھنٹے سے زارون کے ساتھ ہی ہسپتال میں موجود تھا۔

”یار میں تو ابھی دو منٹ پہلے باہر گیا تھا وہ بھی ایک ضروری کام کے لیے، اور کیا ہوا؟ سب خیریت ہے نا؟ بھا بھی ٹھیک ہیں؟“، عالیان نے اُس کی خفگی پر پریشانی سے پوچھا۔

”ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا، بس دعا کرو اور اسے کوئی جوس وغیرہ پلاو نور سے زیادہ تو مجھے اس کی حالت دیکھ کر خوف آرہا ہے،“، احمد نے زارون کی طرف اشارہ کرتے کہا جو خون سے لتھڑی شرط پہنچنے بے جان سے وجود کے ساتھ ان دونوں کی طرف خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ”پچھلے دو گھنٹے سے اسے ہی سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہوں پر۔۔۔“، ایک نظر زارون کے چہرے کی طرف دیکھتے عالیان نے افسر دگی سے کندھے اچکائے۔

”پھر بھی یار کو شش کروا سے کچھ کھلاو پلاو تاکہ آگے آنے والے وقت کا سامنا ہمت سے کر سکے،“،

احمد نے اشارے سے نور کی طرف سے نا امیدی ظاہر کرتے، ڈاکٹر کے بُلانے پر فوراً واپس آئی سی یو کارخ کیا اور عالیان نے بھی قدم زارون کی جانب بڑھائے جواب دیوار کے ساتھ سر لگائے جچت کو گھور رہا تھا۔

”زارون پلیز خود کو سنبھالو، دیکھو کچھ ہی گھنٹوں میں تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے“، اُس کے قریب بیٹھے عالیان نے اُس کی آنکھوں میں سرخی دیکھتے دلاسا دیا تو اُس نے جچت سے نظریں ہٹا کر اُسے دیکھا جو خود بھی اُس کی حالت پر کافی پریشان تھا۔

”میری حالت اُس انسان کی حالت بگاڑ کر ٹھیک ہو گی جس نے میری نور کو ہاتھ لگانے کی جرأت کی۔ جس نے میری زندگی، میرے دل پر وار کیا بس مجھے وہ شخص ہر حال میں چاہیے جس نے زارون علی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کی اور جب تک میں اُس کے جسم کا ایک ایک حصہ الگ نہیں کر لیتا مجھے سکون نہیں آئے گا۔ اس لیے جاؤ اور اُس سے ڈھونڈو، مجھے وہ نور کے ہوش میں آنے سے پہلے چاہیے ورنہ تمہارے لیے بھی اچھا نہیں ہو گا“، آنکھوں میں غصہ لیے اُس نے اپنے جبڑوں کو مضبوطی سے بھینچا تو عالیان نے اُس کی بات سنتے کچھ کہنے کے بجائے اثبات میں سر ہلا کیا اور کچھ ہی دیر میں اُس شخص کے مل جانے کا یقین دلاتے اٹھ کر کو ریڈور سے باہر نکل گیا۔

عالیان نے ہسپتال سے نکلتے ہی زارون کے گارڈز کو بھی کال کر دی کہ وہ اُس کے اپارٹمنٹ میں پہنچ جائیں تاکہ وہ سب مل کر تمام چیزوں کا اچھے سے جائزہ لینے کے بعد پولیس کو مطلع کر کے ان کی مدد لے سکیں پر وہاں پہنچتے ہی اُسے اندازہ ہوا کہ وہ شخص نا صرف پوری تیاری سے وہاں آیا تھا بلکہ اُسے بلڈنگ میں لگے کیمروں کے بارے میں بھی بہت اچھی طرح علم تھا تب ہی نہ تو وہ اُسے کسی کیمرے کی ریکارڈنگ میں ڈھونڈ سکے اور نہ ہی اپارٹمنٹ کی کسی چیز سے اُس کا کوئی ثبوت ملا۔

”سر میں نے ساتھ والے اپارٹمنٹ میں سب لوگوں سے پوچھ لیا ہے پر کسی نے بھی زارون سر

کے اپارٹمنٹ میں نہ تو کسی مشکل کو شخص کو آتے دیکھانہ ہی جاتے، اکرم نے بھی ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد عالیان کو مطلع کیا تو وہ ان سب کو وہیں رکنے اور تمام لوگوں پر نظر رکھنے کا کہتے خود واپس ہسپتال آگیا جہاں ابھی تک ڈاکٹرز نے نور کے بارے میں کوئی امید ظاہر نہیں کی تھی۔

”کیا بنا کچھ پتا چلا؟“ عالیان کے چہرے کی مايوی کوڈ لکھتے ہی زارون کو اُس کے جواب کا اندازہ ہو چکا تھا پر پھر بھی اُس نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

”نہیں ابھی تو نہ کوئی ثبوت ملا ہے اور نہ ہی سراغ لیکن اکرم لوگ پوری کوشش کر رہے ہیں تم فکر نہ کرو جلد ہی ہم اُس شخص تک پہنچ جائیں گے، اُس کے قریب بیٹھتے عالیان نے پوری تفصیل زارون کو بتائی جسے سُن کر اُسے مزید غصہ آیا۔

”مجھے تمہاری کسی قسم کی کوئی بات نہیں سننی، میں نے کہا تھا ناجب تک وہ شخص مل نہیں جاتا یہاں مت آنا تو کیوں آئے ہو پھر یہاں؟“ اپنی مسٹھیوں کو مضبوطی سے بند کرتے وہ پوری شدت سے عالیان پہ چلا یا تو پاس سے گزرتے لوگوں نے رک کر اُن دونوں کی طرف دیکھا۔

”پلیز یار کچھ تو خیال کرو یہ ہا سپیل ہے اور میں کوشش کر رہا ہوں نا جلد ہی کچھ پتا چل جائے گا،“ ان سب کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر عالیان نے نرمی سے سمجھایا پر زارون نے بنا کسی کی پرواکیے اُسے گریبان سے پکڑا۔

”میں نے تمہیں کوشش کرنے بھیجا تھا کیا وہاں؟ جو تم پورے پانچ گھنٹے بعد آ کر مجھے بتا رہے ہو کہ ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا،“ کسی بھی چیز کا لحاظ کیے بغیر اُس نے آنکھوں میں غصہ لیے چینختے ہوئے کہا تو احمد جو اُسے نور کا بتا نے آیا تھا پر اُس کے ہاتھ میں عالیان کا گریبان دیکھ کر جلدی سے اُن کی جانب بڑھا۔

”زارون کیا کر رہے ہو؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ اُس کا ہاتھ ہٹاتے احمد نے عالیان کی طرف دیکھا جو اپنی اتنی بے عزتی پر شرم سے لال ہوتے سر جھکا چکا تھا۔

”ہاں پاگل ہو گیا ہوں میں، میں نے اسے کہا تھا کہ وہ شخص مجھے ہر حال میں چاہیے ہے پر یہ اتنے آرام سے آ کر مجھے بتا رہا کہ ابھی تک اس کا کچھ پتا نہیں چلا“، احمد کی طرف دیکھتے ہی وہ اس کا ہاتھ جھٹکتے غصے اور تکلیف کے ملے جلے نثارات لیے بولا۔

”یہ جگہ لڑنے کی نہیں ہے اس لیے ہم دونوں پہ اپنا عرب جمانے کے بجائے اپنی بیوی کے لیے دعا کرو جو اندر زندگی اور موت کی کشکاش میں پڑی ہے“، احمد نے بھی کوئی لحاظ کیے بغیر غصے سے کہا اور عالیان کے ہاتھ میں پیپر پکڑاتے کچھ دو ایساں لانے کا کہتے زارون کو خاموش چھوڑ کر واپس چلا گیا۔



رات سے صبح ہو چکی تھی لیکن ڈاکٹر زنے ابھی تک نور کی طرف سے کوئی امید ظاہر نہیں کی تب ہی زارون نے احمد سے اُسے دوسرے ہسپتال لے جانے کی بات کی۔

”یار میں تمہیں اتنی بار بتا چکا ہوں کہ دوسرے ہسپتال والے بھی یہی ٹرینمنٹ دیں گے جو ہم لوگ دے رہے ہیں اس لیے تم پریشان مت ہو اور اللہ پر یقین رکھو اس نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا“، زارون کی حالت دیکھ کر احمد کی ناراضی زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔

”تو پھر ابھی تک نور کو ہوش کیوں نہیں آیا؟ ساری رات گزر چکی ہے“، ایک بار پھر سے زارون نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو احمد نے جواب دینے کے بجائے عالیان (جو زارون کے غصہ کے باوجود بھی رات سے اس کے ساتھ تھا) کی طرف دیکھا جو ہاتھ میں چائے کے کپ پکڑے اُن دونوں کے قریب آچکا تھا۔

”کیا ہوا سب خیریت ہے نا؟“، اُن کے پاس رک کر عالیان نے سوالیہ نظر وہ سے احمد کی جانب دیکھا۔

”ہاں سب خیریت ہے تم بس اس کو کچھ کھلاوتا کہ اس کا دماغ کچھ سیٹ ہو اور یہ چائے مجھے دو۔“

رات سے مسلسل جاگ کر میرا تو سر پھٹ رہا ہے، ایک کپ عالیان کے ہاتھ سے لیتے احمد نے ایک گھونٹ بھرا تو عالیان نے دوسرا کپ زارون کی جانب بڑھایا۔

”میرا دل نہیں ہے تم پی لو، نفی میں سر ہلاتے وہ واپس جا کر کرسی پر بیٹھ گیا تو عالیان نے احمد کی طرف دیکھا جو خود بھی اگلا گھونٹ بھرتے بھرتے رک گیا۔

”یہ اپنے ساتھ ساتھ ہمارا بھی دماغ خراب کر دے گا اس لیے دعا کرو نور کو جلدی ہوش آجائے،“ عالیان کی نظروں کا مفہوم سمجھتے احمد نے اپنی آواز آہستہ رکھتے کہا اور کپ واپس اُسے پکڑاتے نہ کے بُلانے پر اندر کی جانب بڑھا جو اُسے نور کے ہوش میں آنے کا بتا رہی تھی۔



اُس کا ذہن بیدار ہوا تو آنکھیں کھولتے خود کو ایک نئی جگہ پر دیکھ کر وہ کچھ پریشان ہوئی اور ایک خیال آیا کہ شاید آربے اُسے یہاں لے کر آیا ہے، اُسے خوف زدہ کر گیا تب ہی اُس نے کسی کی آواز پر نظر اٹھا کر دیکھا۔

”کیسا محسوس کر رہی ہیں اب آپ؟“ احمد نے اُس کے قریب آکر نرمی سے پوچھا تو نور نے ذہن پر زور ڈالتے اُسے پہچاننے کی کوشش کی جسے وہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔

”مجھے یہاں کون لایا ہے؟“ اُس کی بات کا جواب دینے کے بعد اُس نے ایک نظر پاس کھڑی نہ کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تو احمد نے اُس کی آنکھوں میں خوف کی لہر دیکھ کر زارون کا بتا کے مطمئن کیا تاکہ وہ پر سکون ہو جائے کہ اُسے وہ شخص یہاں نہیں لایا۔

”زارون کو بُلا دیں اور مجھے ہاتھ مت لگائیں گا،“ احمد نے اپر میں لگانے کے لیے جیسے ہی ہاتھ آگے بڑھائے نور نے جلدی سے اپنا بازو پیچھے کرتے چھختے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے نہیں لگا تا بس آپ پریشان مت ہوں،“ اُس کی حالت دیکھ کر احمد نے تسلی دی اور

نر نے کو باہر سے زارون کو بولا نے کا کہتے خود بیڈ سے کچھ فاصلہ پہ جا کھڑا ہوا۔

”سر آپ کو ڈاکٹر صاحب اندر بular ہے ہیں“، نر نے زارون کے قریب آتے کہا تو وہ جلدی سے اُس کے ساتھ اندر کی جانب بڑھا (کیوں کہ عالیان اُسے پہلے ہی نور کے ہوش میں آنے کا بتا چکا تھا جسے سن کر اب اُس کی آدھی پریشانی کم ہو چکی تھی)۔

”کیا ہوا؟ نور ٹھیک ہے؟“ اندر قدم رکھتے ہی اُس نے احمد کو دروازے کے پاس کھڑا دیکھ کر پریشانی سے پوچھا۔

”ہال ٹھیک ہے پر شایدابھی تک اُس حادثے کو لے کر خوف زده ہے۔ مجھے چیک بھی نہیں کرنے دیا“، احمد نے بتانے کے ساتھ ہی نر نے اپنے ساتھ آنے کا کہا تاکہ زارون سکون سے بات کر سکے۔

”نور“، احمد کے جاتے ہی وہ اُس کے قریب آیا جو آنکھیں بند کیے لمبی سانس لیتے خود کو پر سکون کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”زارون پلیز مجھے بچاؤ وہ مجھے مار دے گا“، نور نے اُس کی آواز پرفٹ سے آنکھیں کھولتے کسی اپنے کو قریب دیکھ کر آنکھوں میں خوف کے ساتھ آنسو لیے کہا اور انٹھنے کی کوشش کی پر زارون نے آگے بڑھتے اُسے سنبھالا۔

”کوئی کچھ نہیں کہے گا تمہیں اس لیے پریشان مت ہو اور سکون سے لیٹی رہو میں ہوں یہاں تمہارے پاس“، اُس کی حالت دیکھ کر زارون کو نئے سرے سے اُس شخص پر غصہ آیا جس کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

”وہ مجھے مار دے گا وہ مجھے مار نے ہی آیا تھا“، نور نے آنکھوں میں خوف لیے اُس کے بازو کو پکڑا تو زارون نے اُسے اپنے ساتھ لگاتے دلاسا دیا جو بار بار ایک ہی بات کو دوہراتے چخ رہی تھی۔

”پلیز نور خود کو سنبھالو، کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا“، اُس کی طبیعت کے پیش نظر زارون نے اُسے

خود سے الگ کرتے سمجھانے کی کوشش کی تھی تو اُس نے روتے ہوئے غصے سے اُس کا ہاتھ جھٹکا۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم کیوں مجھے اکیلا چھوڑ کر گئے تھے؟ اور کیوں تم نے آنے میں اتنی دیر لگائی؟ مجھے پتا ہے تم چاہتے ہی یہ تھے کہ وہ مجھے مار دے، نہیں بلکہ یہ سب کروایا، ہی تم نے ہو گا تاکہ مجھ سے تمہاری جان چھوٹ جائے یا میں ڈر جاؤں اور تم جو چاہو مجھ سے کرو اسکو پر میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی“، غصے سے پاگل ہوتے اُسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ زارون کو کیا کچھ بول رہی ہے اور ان باتوں کا اُس پہ کیا اثر ہو گا جو کل سے کسی ہارے ہوئے انسان کی طرح پوری دنیا سے صرف اُس کے لیے اڑ رہا تھا جو اتنی آسانی سے اتنا بڑا الزام اُس کے سر لگا چکی تھی۔



دس دن مسلسل وہ ہسپتال میں نور کے پاس رہا، اس دوران اُس نے ایک لمحے کے لیے بھی اُسے کسی اور کے سہارے پر نہیں چھوڑا حالانکہ احمد اور عالیان کتنی ہی بار اُسے اپنے وہاں ہونے کا یقین دلاتے گھر جا کر آرام کرنے کا کہہ چکے تھے پر اب نہ تو اُسے نور کے معااملے میں کسی پر اعتبار تھا اور نہ ہی وہ پھر سے اُسے اکیلا چھوڑ کر اُس شخص (جس کا اتنی کوشش کرنے کے بعد بھی ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا) کو دوبارہ سے کسی ایسی ولیٰ حرکت کا موقع دینا چاہتا تھا جس سے نور کو تکلیف ہوتی۔

”بس کچھ دیر میں ہم بھا بھی کوڈ سچارج کر دیں گے اس لیے تم اُس وقت تک ساری چیزیں وغیرہ سمیٹ لو اور پلیز گھر جاتے ہی اپنا یہ مجنووں والا حلیہ ٹھیک کر لینا، نہیں تو بھا بھی نے تمہیں کوئی بھکاری سمجھ کر گھر سے نکال دینا ہے“، احمد نے نور کو چیک کرنے کے بعد (جس کے ٹانکے کچھ دیر پہلے ہی کھلے تھے) زارون سے کہا جس کی شیوکافی بڑھ چکی تھی۔

”زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں اس حالت میں بھی تم سے زیادہ ہینڈسم لگتا ہوں اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے اُس نے احمد کو دانت نکالتا دیکھ کر گھورا“۔

”بس کریا فرض سے تمہاری حالت دیکھ کر تو میں نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے ہیں کہ زندگی میں سب کچھ کرنا ہے پر عشق نہیں کرنا“، احمد نے اُسے آج صحیح سے ہی کچھ ڈھیلا سادیکھ کر چھپرا تاکہ وہ کچھ فریش ہو جائے۔

”اچھا فیصلہ ہے اور ویسے بھی عشق کرنا مجھے جیسے شیروں کا کام ہے تم جیسے گیدڑوں کا نہیں“، زارون نے اُس کی بات سنتے ہی تیوری چڑھاتے جواب دیا تو احمد نے گیدڑ کا نام سنتے ہی ہونقوں کی طرح منہ کھولے اُسے دیکھا جو اُس کے چہرے کے بدلتے زاویے دیکھ کر اب خود بھی مسکرانے لگا تھا۔

”ہونہہ، جتنے تم شیر ہونا میں ان دس دنوں میں دیکھ چکا ہوں اس لیے میرے سامنے زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں اور یہ کیا تم میرے اسٹاف کو ہر وقت گھورتے رہتے ہو؟ تمہاری دہشت کی وجہ سے بے چاروں کا آدھا خون خشک ہو گیا ہے“، احمد نے اُسے سوپر کواشارہ کرتے نور کے کمرے سے جانے سے روکتا دیکھ کر ٹوکا۔

”میں جو کر رہا ہوں نابالکل ٹھیک کر رہا ہوں اس لیے مجھے زیادہ سبق دینے کی ضرورت نہیں“، احمد کو سنا تے وہ سوپر کی خبر لینے کے لیے اُس کی جانب بڑھا تو اس نے دور سے اُسے اپنے طرف آتا دیکھ کر جھاڑو وہیں پھینک کر دوسرا جانب دوڑ لگا دی تو زارون بھی اُس کی خبر لینے اُس کے پیچے بھاگا۔

”حد ہے یہ انسان کبھی نہیں سدھ رے گا“، احمد نے سوپر کی حرکت پر مسکراتے شکر ادا کیا کہ آج اُس کی اور اُس کے ہسپتال کی زارون نامی جلا دسے جان چھوٹ جائے گی کیوں کہ جس دن سے وہ یہاں تھا اُس نے احمد سمیت تمام اسٹاف کا جینا حرام کیا ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ نور کو لے کر گھر پہنچا جس کی طبیعت اب بہتر تھی اور زخم بھی کافی حد تک ٹھیک ہو چکے تھے پر ابھی بھی پاؤں کے زخم کی وجہ سے ڈاکٹر نے اُسے زیادہ چلنے سے منع کیا تھا۔ تب ہی زارون اُسے سہارا دے کر بیڈ روم تک لا یا جہاں پر نسز (جسے اُس دن سے اکرم ہی سن بھاں رہا تھا) اُن دونوں کو

دیکھتے ہی خوشی سے گول گول چکر کا ٹنگی۔

”درد تو نہیں ہے؟“ اُسے بیڈ پر بٹھاتے زارون نے پوچھا تو نور نے نفی میں سر ہلاتے پرنسز کو آواز لگائی جو جلدی سے بیڈ پر چڑھتے اُس کی گود میں آبیٹھی۔

”میں جوس لے کر آتا ہوں،“ ان دونوں کو مصروف دیکھ کر زارون نے کہا اور باہر آگیا جہاں اکرم ابھی تک دروازے کے پاس اُسی کے انتظار میں کھڑا تھا۔

”تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ نیچے جاؤ اور اپنے کام پلگ جاؤ کیوں کہ اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا،“ زارون نے اُسے سر جھکائے کھڑا دیکھ کر حکم دیا۔

”جی سربس اب وہ شخص جلد ہی آپ کو مل جائے گا،“ اکرم نے اُس کی بات سنتے ہی یقین دہانی کروائی اور ویسے ہی نظریں جھکائے باہر نکل گیا تو زارون نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا۔ واپس کچن میں آتے فرتح سے جوس نکالا اور گلاس میں ڈال کر اندر لے آیا جہاں نور ابھی تک پرنسز کو لاڈ کرنے میں مصروف تھی۔

”جوس پی لو،“ گلاس اُس کے پاس ٹیبل پر رکھتے زارون نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا تو نور نے نظر اٹھا کر اُسے دیکھا جواتنے دنوں سے کسی سایہ کی طرح اُس کے ساتھ تھا۔ اُسے کب پیاس لگی ہے کب بھوک، کب اُس نے سونا ہے کب اٹھنا، کب اُسے کس چیز کی ضرورت ہے، کب نہیں زارون کو سب اُس کے بتائے بغیر ہی پتا ہوتا جو نور کے لیے کافی حیران کن تھا۔

”کیا ہوا؟“ اُسے اپنی طرف ٹکلٹکی باندھے دیکھتا پا کر زارون نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

”نہیں، کچھ نہیں ہوا بس ابھی میرا دل نہیں ہے کچھ دیر میں پی لوں گی،“ اپنی چوری کپڑے جانے پر جلدی سے نظریں اُس کے چہرے سے ہٹاتے (جس کی حالت دیکھ کر نور کو اپنے پچھلے کچھ دنوں کے رویے اور الفاظ پر شرمندگی ہوئی) اُس نے پھر سے پرنسز کے بالوں میں ہاتھ پھیرا جو پہلے کی نسبت کافی

کمزور ہو چکی تھی۔

”ٹھیک ہے جب دل ہو پی لینا اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو مجھے آواز دے دینا میں باہر لا اونچ میں بیٹھا ہوں،“ ٹرے نیچے سے نکال کر گلاس کے اوپر رکھ کر زارون نے کہا اور پلٹ کر جانے لگا کہ نور نے اُس کا ہاتھ تھامتے روکا۔

”سوری، وہ مجھے کچھ کہنا تھا،“ زارون کے دیکھنے پر شرمندہ ہوتے ہوئے اُس نے جلدی سے اُس کا ہاتھ چھوڑتے وضاحت دی۔

”ہاں کہو؟“ اُس کی ہمچکیا ہٹ اور غیر معمولی سی حرکت پر اپنی حیرت چھپاتے زارون نے اجازت دی تو نور نے اپنے الفاظ کو ترتیب دیتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

”وہ اُس دن میں نے جو بھی کہا، مطلب میں نے تمہیں مجرم ٹھہرا�ا کہ تم نے وہ سب کروایا بس اُسی کے لیے سوری بولنا تھا،“ اُس سے نظریں ملائے بغیر نور نے اپنی بات کہی تو زارون کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا کیوں کہ وہ نور سے اس بات کی بالکل بھی توقع نہیں رکھتا تھا کہ وہ اُس بات کے لیے اُسے سوری بولے گی۔

”ہم خیر ہے مجھے کوئی غصہ نہیں اور تم بھی وہ سب بھول جاؤ،“ اُسے سر جھکائے بیٹھا دیکھ کر زارون نے نرمی سے کہتے اُسے شرمندگی سے نکلنے کی کوشش کی کیوں کہ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ سب وقتی ہے اور نور صرف اُس کے خیال رکھنے کو احسان سمجھ کر یہ سب بول رہی ہے۔



کمرے میں ٹھلتے سکریٹ کے کش پکش لیتے وہ مسلسل بے چین تھا کیوں کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اُسے خبر ملی تھی کہ زارون نور کو ہسپتال سے گھر لے آیا ہے۔

”اس بار تو تم زارون کی وجہ سے نجگئی پر اگلی بار نہیں بچوگی اس لیے جتنا خوش ہونا ہے ہلو کیوں

کہ اگر زارون تمہیں بچانا جانتا ہے تو میں بھی یہ بات باخوبی جانتا ہوں کہ اُسے کس طرح اور کون کون سے طریقے سے اذیت دینی ہے، آنکھوں میں سرخ انگارے لیے وہ سگریٹ کا دوسرا پیکٹ بھی ختم کر چکا تھا پر اُس کا غصہ تھا کہ ختم ہونے کے بجائے مزید بڑھتا ہی جا رہا تھا تب ہی اُس نے اپنا موبائل اٹھاتے کسی کا نمبر ملا یا جو دوسری ٹیبل پہ اٹھا لیا گیا۔

”جی سر کیا حکم ہے؟“ دوسری طرف کسی لڑکی کی آوازا بھری تو زین نے سگریٹ کا آخری کش لیتے اُسے زمین پر پھینک کر جوتے سے مسلما۔

”جو کام میں نے کہا تھا ہو گیا ہے یا نہیں؟“ ٹیبل پر پڑے پیکٹ سے ایک اور سگریٹ نکال کر اُسے سلگاتے اُس نے ٹیرس کی جانب جاتے سوال کیا۔

”جی سر میں نے آپ کا کام کر دیا ہے بس اب نور کے یونیورسٹی آنے کا انتظار ہے، اُس لڑکی نے بتانے کے ساتھ ہی اُسے تمام تفصیل سے آگاہ کیا تو زین کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

”بہت خوب بس اب دھیان رکھنا کہ کسی کو تم پرشک نہ ہو، اُس کی تمام بات سننے کے بعد زین نے اُسے مزید کچھ ہدایات دیتے فون بند کیا اور فضا میں دھواں چھوڑتے ایک زوردار قہقهہ لگایا۔

”اب میں دیکھوں گا کہ زارون اپنی نور کو کیسے میرے قہر سے بچاتا ہے،“ دانتوں کو سختی سے پیستے اُس نے سگریٹ کے مزید دو کش لیتے اُسے ختم کیا اور ایک نظر رات کی پھیلتی تاریکی کو دیکھتے واپس کمرے کی جانب بڑھا۔



حارت کافی دنوں سے گھر لیٹ آر رہا تھا تاکہ اُس کا کسی سے سامنا نہ ہو پر آج وہ تقریباً دس بجے کے قریب ہی گھر آگیا کیوں کہ چند دنوں سے اُس کا دل نور کی طرف سے بہت پریشان تھا جیسے وہ کسی مصیبت میں ہو۔

”پتا نہیں مجھے اُس وقت کیا ہو گیا تھا؟ کیوں میں نے تمہارا اعتبار نہیں کیا؟ کیوں میں نے تمہیں اُس شخص کے ساتھ جانے دیا؟“ گھر آتے ہی وہ سیدھا اُس کے کمرے میں گیا (جو اُس دن سے بند تھا) اور وہاں پڑی چیزوں کو دیکھتے ہی ایک بار پھر سے اُس کا دل بھر آیا جونہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی آنکھوں کو نم کر گیا۔

”نور میری گڑیا، میری چھوٹی سی گڑیا، اپنے حارث بھائی کو معاف کر دینا۔ جب تمہیں سب سے زیادہ میری ضرورت تھی میں نے تمہارا ساتھ نہیں دیا میں نے بھی باقی سب کی طرح تمہیں مجرم ٹھہرایا پرم نے بھی تو اپنے حارث بھائی پر اعتبار نہیں کیا۔ کیوں تم نے مجھ سے وہ سب چھپایا جو تمہیں نہیں چھپانا چاہیے تھا۔ کیوں تم نے خاموش رہ کر خود کو سب کی نظر وہ میں گرا لیا؟ کیوں تم نے مجھے اپنی زندگی کے اتنے بڑے راز سے بے خبر رکھا۔ کاش کہ تم مجھے بتا دیتی تو وہ سب نہ ہوتا جو اُس دن ہوا،“ ٹیبل پر پڑی اُس کی چیزوں کو اٹھاتے وہ آج ہر بات اُس کے تصور سے کہہ دینا چاہتا تھا جس نے اُسے اُس دن سے لے کر اب تک بے سکون کیے ہوئے تھا۔



”تم آج بھی دوسرے کمرے میں سوئے گے؟“ نور نے اُسے دو دھا اپنے پاس رکھ کر کمرے سے باہر جاتا دیکھ کر چہرے پر فکر مندی کے آثار لاتے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، کیوں تمہیں کوئی کام تھا؟“ پلٹ کراس کی جانب دیکھتے زارون نے پوچھا تو نور نے گڑ بڑاتے ہوئے نفی میں سر ہلا�ا۔

”نہیں کام کوئی نہیں تھا پر وہ میں کہہ رہی تھی کہ۔۔۔“ ایک نظر ٹیرس کے بندرووازے کو دیکھتے اپنی بات مکمل کرنے کے لیے اُس نے ہمت جمع کی۔

”کیا کہہ رہی تھیں؟ اور جو بھی بات ہے کھل کے بتاؤ ایسے ڈر کیوں رہی ہو،“ اُس کی ہچکچاہٹ کو

محسوس کرتے زارون نے نرمی سے اُسے اپنی بات مکمل کرنے پر اکسایا۔

”وہ تم یہاں سوجاؤ، میرا مطلب ہے اس کمرے میں کیوں کہابھی مجھ سے چلانہیں جاتا اور ہو سکتا ہے مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوا اور تم تک میری آواز نہ پہنچی تو میں کیا کروں گی؟“ نور نے اپنی بات سنبھالنے کے لیے وضاحت دی تو زارون کے ہونٹوں پر مسکرا ہٹ آگئی جسے اس کے دیکھتے ہی سکیڑ گیا۔

”تمہاری آواز مجھے آجائے گی اس لیے تم پریشان نہ ہوا اور سکون سے سوجاؤ“، جان بوجھ کر انکار کرتے وہ لائٹ آف کرتے کمرے سے نکلنے لگا تو نور نے جلدی سے اُسے پکارا۔

”پلیز مت جاؤ مجھے یہاں اکیلے ڈر لگے گا“، اصل بات پر آتے اُس نے چہرے پر معمومیت طاری کرتے ہوئے کہا تو زارون کو اُس کی حالت دیکھ کر ہنسی آئی جسے کنٹرول کرتے کوئی بھی جواب دیے بغیر وہ کمرے سے نکل گیا۔

”ہونہہ کھڑوں بد تینیز کہیں کا، پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے“، اُس کے جاتے ہی نور کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ اُس نے کیوں زارون کو یہاں سونے کا کہا۔

”پتا نہیں کون سی موت پڑنے لگی تھی مجھے یہاں اکیلے سونے میں جو میں نے اُس جلا دکی منت کی“، کمبل ٹھیک کر کے لیتے وہ مسلسل اپنے آپ کو برا بھلا کہہ رہی تھی تب ہی زارون پرنسز کو اٹھائے واپس کمرے میں آیا تو اُسے واپس آتا دیکھ کر اُس کا غصہ حیرت میں بدل گیا۔

”کیا ہوا؟ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ پرنسز کو صوفے پر بٹھاتے جو نیند میں تھی خود وہ بیڈ پر اُس کے قریب آ کر لیٹا۔

”کچھ نہیں“، نظریں اُس کے چہرے سے ہٹاتے نور نے نفی میں سر ہلا کیا اور کروٹ دوسری طرف لے کر لیٹنے اُس نے زارون کے آجائے پر اللہ کا شکر ادا کیا اور آنکھیں بند کرتے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

زارون کی آنکھ لگے ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ اُس کے کانوں میں نور کے بڑا بڑا نے کی آواز پڑی تب ہی اُس نے سر اٹھاتے اُسے دیکھا جو شاید نیند میں ڈر جانے کی وجہ سے مسلسل بول رہی تھی۔

”نور، میری طرف کروٹ لے لو“، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے زارون نے ہلکا سا ہلا یا تو اُس نے ڈر سے چیختے ہوئے آنکھیں کھو لیں۔

”کیا ہوا؟“ سردی کے باوجود بھی اُس کے چہرے پر پسینہ دیکھ کر زارون نے نرمی سے پوچھا تو نور نے اُسے جواب دینے کے بجائے اپنے اور اُس کے درمیان موجود ھوڑ اسافا صلح کرنے میں ایک سیکنڈ لگایا اور کچھ بھی سوچ سمجھے بغیر اُس کے سینے سے جا لگی۔

”زارون وہ مجھے مار دے گا پلیز تم مجھے چھوڑ کر مت جانا“، زین کو خواب میں دیکھ کر وہ ایک بار پھر سے ڈر گئی تب ہی تحفظ کے لیے وہ اپنے ساتھ لیٹے اُس شخص کا سہارا چاہتی تھی جس کی زندگی میں اُس نے زہر گھولنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

”کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا، میں پاس ہوں تمہارے اس لیے ڈرومٹ اور سکون سے سو جاؤ“، اُسے ایک دم سے اپنے اتنے قریب دیکھ کر زارون بالکل بوکھلا سا گیا تھا پر جلد ہی اپنے آپ پر قابو پاتے اُس نے نور کو سلی دی جواب خوف سے رو نے لگی تھی۔

”نہیں، وہ مجھے مار دے گا۔ وہ ہم دونوں سے بدلہ لینا چاہتا ہے اور وہ مجھے بھی میری غلطی کی سزا دے گا“، کچھ کہتے کہتے اُس نے اپنی زبان کو بریک لگائی تو زارون نے اُسے خود سے الگ کرتے سوالیہ نظر وں سے دیکھا۔

”کس غلطی کی سزا اور ہم سے کون بدلہ لینا چاہتا ہے؟ کون تھا وہ؟ تم نے اُسے دیکھا تھا کیا اور اُس نے تم سے یہ سب کہا؟ پلیز نور مجھے سب سچ بتانا“، پہلے تو زارون کو لگا تھا کہ ابھی نور سے یہ سب پوچھنا اُسے دوبارہ سے وہ سب یاد دلانے اور تکلیف دینے کے مترادف ہو گا تب ہی وہ اُس دن سے خاموشی

اختیار کیے اُس کے سنبھلنے کا انتظار کر رہا تھا پر اب نور کے منہ سے یہ سب سُن کر اُسے پوچھنا پڑا۔

”پ۔۔۔تا۔۔۔ن۔۔۔نہیں۔۔۔مجھے۔۔۔کہ۔۔۔وہ۔۔۔کو۔۔۔ن تھا“، خود کو زین کا نام لینے سے روکتے نور نے پھر سے سر اُس کے سینے پر رکھا تو زارون نے اُس کی ہچکچا ہٹ کو اُس کا خوف سمجھ کر مزید کچھ پوچھنے کے بجائے اپنے حصار میں قید کیا۔

”سو جاؤ، میں پاس ہوں“، اُس کی پیشانی پر بوسہ دیتے زارون نے کہا تو نور نے آنکھیں موندیں خود کو کوسا کہ کیوں اُس نے زین کے ڈر کو اپنے سر پر اتنا سوار کیا کہ اُسے زارون کے سامنے وہ سب بولنا پڑا جس کی وجہ سے اُس کی آگے آنے والے زندگی مزید خراب ہو سکتی تھی۔

نور کے سونے کے بعد زارون کافی دریتک اُس کی بات کے بارے میں سوچتا رہا پر پھر اتنے دنوں کی تھکاوٹ اور مسلسل ہسپتال میں جانے کی وجہ سے اُس کی آنکھ لگ گئی جو صحیح اپنے موبائل کی بیپ پر کھلی۔

”اُف کس کو مصیبت پڑ گئی صحیح صحیح“، الجھن سے بڑھاتے ہوئے اُس نے بند آنکھوں سے ہی سائیڈ میبل پر ہاتھ مارا اور موبائل کے نیچے گرنے کی آواز پر آنکھیں کھول کر اٹھنے کی کوشش کی پر اپنے سینے پر وزن محسوس کرتے اُس نے حیرت سے سر اٹھاتے دیکھا تو نور سکون سے اُس کے سینے پر سر رکھے سو رہی تھی۔

”اُف یہڑ کی کل سے میرے ہوش اڑانے میں لگی ہے اور اب اگر میں نے ذرا سی بھی پیش رفت کی تو اس کا منہ بن جانا ہے کہ میرے قریب مت آنا۔ خبردار مجھے چھواتو“، نور کی نقل اُتارتے اُس نے سر واپس تکیہ پر رکھا اور ساتھ ہی شکر ادا کیا کہ موبائل نیچے گرنے سے خود ہی بند ہو گیا۔

”ہونہہ رات سے ایسے میرے ساتھ چمٹ رہی ہے جیسے میں شہد ہوں اور یہ شہد کی مکھی، ویسے ہے تو مکھی ہی وہ بھی زہریلی، جواب ساری زندگی مجھے ہی ڈنگ مارے گی“، اُس کے بالوں میں ہاتھ

پھیرتے زارون نے سوچا اور اپنی سوچ پر مسکراتے ہوئے آہستگی سے اُسے سیدھا کیا جو کسم کاتے ہوئے پھر سے سوگئی۔

”جتنی تم پیاری ہونا کاش اتنی اچھی بھی ہوتی“، اپنے کندھے پر اُس کا سر رکھتے زارون نے اُس کی طرف کروٹ لی اور اُس کے چہرے سے بالوں کو ہٹا کے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ہونٹ اُس کے رخسار پر لگائے جو ایک طرف لیٹے رہنے کی وجہ سے سرخ ہو چکا تھا۔

”جان ہوم میری، بس تھوڑی سی بد تیز اور نک چڑھی ہوئی، ہونٹ اُس کی بند آنکھوں پر لگاتے زارون نے آہستہ سے کہا تو نور نے اُس کے لمس کو محسوس کرتے نیند میں ہی ما تھے پر بل ڈالے جس پر مسکراتے ہوئے زارون نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگایا اور کچھ لمبے اُس کے سرخ ہونٹوں کو دیکھتے وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُس کے ہونٹوں پر جھکا تو نور نے اپنا سانس بند ہوتا محسوس کرتے ہوئے آنکھیں کھو لیں۔

زارون کو اپنے اوپر جھکا دیکھ کر پوری آنکھیں کھولتے اُسے دیکھا جو سکون سے اپنے کام میں مصروف اُس کے دونوں ہاتھ اپنے سینے سے ہٹا کر اپنے ہاتھوں میں قید کر چکا تھا۔ کچھ لمحات کی خاموشی کے بعد زارون نے اُس کے ہونٹ آزاد کیے تو نور نے تیزی سے سانس لیتے اُسے بحال کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو آچکے تھے۔

”پلیز میرا سانس بند ہو جائے گا“، اُسے واپس اپنے اوپر جھکتا دیکھ کر نور نے جلدی نفی میں سر ہلایا تو اُس کی معصومیت پر مسکراتے زارون نے تھوڑا اوپر ہوتے اُس کی پیشانی پر ایک آخری بوسہ دیا جو شرم سے لال ہو چکی تھی۔

”اُٹھ جاؤ بہت طامٰم ہو گیا ہے“، اپنے منہ زور ہوتے جذبات پر قابو پاتے زارون نے کہا اور پنسز کو بولتا دیکھ کر بیڈ سے اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ نور نے اپنی تیز ہوتی دھڑکنوں کو بحال کیا جو

آج پہلی بار زارون کے قریب آنے سے منتشر ہو رہی تھیں۔

”اُف یہ جلا دکسی دن میری جان لے گا، اپنا دوپٹہ ٹھیک کر کے جلدی سے اٹھ کر بیٹھتے اُس نے سوچا اور زارون کے آنے سے پہلے ہی بیڈ کا سہارا لے کر انٹھتے جا کر صوفے پر بیٹھ گئی تاکہ پھر سے اُسے کسی ایسی حرکت کا موقع نہ ملے۔

☆☆☆

زارون کی شادی کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پوری حوالی میں پھیلی تو ساجدہ بیگم نے بے یقینی کی سی کیفیت میں تصدیق کے لیے اختشام صاحب کو اپنے کمرے میں بلا یا جن کے کسی خاص بندے نے انہیں یہ خبر دی تھی۔

”یہ میں کیا سُن رہی ہوں کہ زارون نے شادی کر لی ہے؟“ شہنماز بیگم کو بھی اُن کے ساتھ کمرے میں آتا دیکھ کر ساجدہ بیگم نے پرواکیے بناء اختشام صاحب کو سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے سوال کیا۔

”جی، ٹھیک سنा ہے آپ نے، آج صحیح مجھے اطلاع ملی تھی جسے میں نے کچھ دیر پہلے ہی اکرم سے فون کر کے کنفرم کیا ہے،“ اختشام صاحب نے ساجدہ بیگم کو ساری تفصیل بتائی جسے سُن کر شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی پر پھر بھی انہیں یقین نہیں آیا۔

”پرا بھی کچھ دن پہلے ہی تو زارون حوالی آیا تھا مگر اُس نے تو مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی اور ہو سکتا ہے اکرم کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو،“ ساجدہ بیگم نے اختشام صاحب کے ساتھ ساتھ اپنے دل کو بھی تسلی دی کہ زارون اُن کو بتائے بغیر ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا۔

”مجھے بھی یہی لگا تھا پر یہ بات مجھے دو دن پہلے اسلام (زارون کا ڈرائیور) نے بھی بتائی تھی اور اُسی کے بعد میں نے خود شہر جا کر تصدیق کی،“

”ہم پر میرا دل نہیں مان رہا اس لیے تم اچھے سے پتا کروالو۔ ہو سکتا ہے یہ سب جھوٹ ہوا اور کسی نے ہماری بدنامی کے لیے یہ بات پھیلائی ہو، ساجدہ بیگم نے اپنے دل کے خدا شے کو احتشام صاحب کے سامنے بیان کیا تو انہوں نے اُن کی بات سنتے ہی اثبات میں سر ہلایا پر شہناز بیگم جن کی زبان پر کب سے کھلبی ہو رہی تھی وہ اُن کے خاموش ہوتے ہی بولیں۔

”اما حضور کوئی بھی اتنی بڑی بات ایسے ہی نہیں کر دیتا، ضرور آپ کے پوتے نے کوئی گل کھلا�ا ہو گا جو لوگ ایسی بات کر رہے ہیں اور آپ سے میں نے اتنی بار کہا تھا کہ جوان اولاد کو یوں اکیلانہ چھوڑیں پر آپ کو تو میری کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا“، اپنے طعنوں تشویں کا رخ ساجدہ بیگم سے احتشام صاحب کی طرف کرتے انہوں نے سنائی جسے سُن کر احتشام صاحب کا سرمزید جھک گیا۔

”زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں اور میرے پوتے کے بارے میں کوئی بھی بات کرنے سے پہلے ہزار بار سوچ لینا“، انہیں زارون کے خلاف آگ الگتا دیکھ کر ساجدہ بیگم نے تختی سے ٹوکا تو شہناز بیگم کو مزید پنگ لگ گئے۔

”آپ میرا منہ تو بند کروادیں گی پر خاندان والوں کو کیا جواب دیں گی؟ جب سب یہ پوچھیں گے کہ ایسا کیا ہو گیا تھا کہ آپ کے اکلوتے پوتے نے آپ کو بتائے بغیر اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اکیلے ہی کر لیا وہ بھی چوری چھپے“، ساجدہ بیگم کی بات پر بھڑکتے ہوئے شہناز بیگم نے انہیں آئینہ دکھایا اور مزید کچھ بولے یا سنے بغیر ایک تیز نظر خاموش بیٹھے احتشام صاحب پر ڈالتے پیر پٹختے ہوئے کمرے سے چلی گئیں۔

”اسے کس نے بتایا ہے یہ سب اور تمہارے پیٹ میں کوئی بات نہیں ٹھہر تی کیا جو تم ہر بات اسے بتا دیتے ہو“، شہناز بیگم کے جاتے ہی ساجدہ بیگم نے احتشام صاحب کو آڑ رے ہاتھوں لیا۔

”میں نے کچھ نہیں بتایا اس نے مجھے فون پر اکرم سے بات کرتے سُن لیا تھا“، ساجدہ بیگم کے

غصے کی وجہ سے اخشم صاحب نے چکچا تے ہوئے بتایا۔

”ٹھیک ہے اب جو ہونا تھا ہو گیا تم جاؤ اپنی بیوی کا منہ بند کرو اور اگر یہ بات اس حوالی سے باہر نکلی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا اور زاروں سے میں خود ہی بات کر لوں گی،“ اپنے غصے کو ضبط کرتے انہوں نے کہا تو اخشم صاحب نے سر ہلاتے انہیں یہ بات باہر نہ نکلنے کی تسلی دی اور کمرے سے چلے گئے۔



ملائکہ کے گھر میں آنے پر جہاں جنید کی زندگی پر سکون ہو گئی تھی وہیں خالدہ بیگم کی زندگی میں ایک نہ ختم ہونے والا عذاب آچکا تھا۔ جو دن بدن کم ہونے کے بجائے بڑھ رہا تھا۔ وہ جتنی کوشش اور شدت سے ملائکہ کو جنید کے دل سے نکالنے کی کوشش کرتیں وہ اتنی ہی چالاکی سے انہیں شکست دیتے جنید کے دل میں جگہ بناتی جا رہی تھی۔ جس کی وجہ سے خالدہ بیگم کی برداشت جواب دے چکی تھی تب ہی انہوں نے ملائکہ جیسی تیز مچھلی کو پکڑنے کے لیے ایک بڑا جمال بچھایا تاکہ کسی کو بھی شک دلانے بغیر اس کا پتہ آسانی سے صاف کر سکیں۔

”اب دیکھتی ہوں تم میرے شر سے کیسے بچتی ہو،“ گیس کے سلنڈر کا پائپ کھول کر سائیڈ پر پر کرتے انہوں نے اُسے فل اسپیڈ میں کھولا تاکہ ملائکہ جیسے ہی ماچس جلائے تو آگ پوری طرح سے پھیل جائے۔ ”کہتے ہیں اگر گھر سیدھی انگلی سے نکلے تو انگلی ٹیڑھی کر لینی چاہیے،“ اپنے چہرے پر شاطرانہ مسکراہٹ سجاتے انہوں نے ملائکہ کو کمرے سے نکلتا دیکھ کر جلدی سے باور پھی خانہ سے نکلتے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

”اُف آج تو بہت دیر ہو گئی ہے پتا نہیں میں اتنی دریتک کیسے سوئے رہی،“ ملائکہ نے اپنے بالوں کو فولڈ کرتے جوڑے کی شکل دے کر کچھ میں قید کیا اور کچن میں جانے کے بجائے سلیم صاحب کی آواز

ستے ان کی بات سننے کے لیے لاونچ میں آگئی۔

”جی ابوآپ نے بلا یا تھا؟“ سر پر دوپٹہ اور ٹھیکانے اس نے پوچھا تو سلیم صاحب نے ٹی وی کی آواز ہلکی کی۔

”میں تو خالدہ کو بُلا رہا تھا، کہاں ہے وہ؟“

”پتا نہیں میں تو ابھی باہر آئی ہوں اور آپ کو کوئی کام تھا تو مجھے بتا دیں،“ سلیم صاحب کے نرم رویے کی وجہ سے ملانکہ ان کا کافی خیال کرنے لگی تھی۔

”ہاں بیٹھا چائے کا کہنا تھا بس کافی دری سے دل کر رہا ہے پر خالدہ بیگم کو لڑائی جھگڑے سے فرصت ملے تو میرا کوئی کام کریں،“ نظریں ٹی وی پر جمائے انہوں نے سر جھٹکا تو ملانکہ نے ان کی بات پر مسکراتے ہوئے پانچ منٹ میں چائے بنانے کا کہتے باور پچی خانے کا رخ کیا جہاں داخل ہوتے ہی اس کے نھنھوں میں گیس کی بمحسوں ہوئی۔

”اُف ایک تو یہ سلنڈر کو پتا نہیں کیا ہے دوسرے ہی دن لیک ہونے لگ جاتا ہے،“ قدم آگے بڑھاتے اس نے خود کلامی کی اور پہلے بھی کچن سے اس طرح کی بوآتی رہنے پر کچھ بھی سوچ سمجھے بغیر شیل ف پر پڑی ماچس جلائی تو ایک دھماکے کے ساتھ پورے باور پچی خانے میں آگ پھیل گئی جس سے آتی ملانکہ کی دخراش چینیں پورے گھر کو ہلا گئیں۔



اختشام صاحب کے جاتے ہی ساجدہ بیگم نے رشیدہ کو بُلا کر اپنا سامان پیک کرنے کا کہا کیوں کہ وہ اب زاروں کو بُلانے کے بجائے خود شہر جا کر دیکھنا چاہتی تھیں کہ اختشام صاحب کی بات میں کتنی صداقت ہے۔

”بی بی جی میں نے سب چیزیں رکھ دی ہیں آپ کی دوائیاں بھی اور کچھ رکھنا ہے کیا؟“ رشیدہ جو

ساجدہ بیگم کی پرانی اور خاص ملازمتی اُس نے تمام کام کرنے کے بعد موڈ بانہ انداز میں پوچھا۔

”نہیں بس تم مراد کو گاڑی تیار کرنے کا کہوا اور اپنا سامان بھی رکھ لو تم بھی میرے ساتھ جاؤ گی،“  
اُسے ہدایت دیتے ساجدہ بیگم نے جلدی کرنے کا کہا تو رشیدہ نے اُن کا حکم سنتے ہی اثبات میں سر ہلایا  
اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

”میں چاہتی ہوں کہ جواحتشام نے بتایا وہ سب جھوٹ ہو کیوں کہ اگر وہ سچ ہوا تو مجھے بہت دکھ ہو  
گا کہ تم نے اپنی زندگی کے اتنے اہم فیصلے میں مجھے شامل کرنا تو دور کی بات مجھ سے اجازت لینا بھی گوارا  
نہیں کیا،“ سائیڈ ٹیبل پر پڑی زارون کی تصویر اٹھا کر اُس سے کہتے ساجدہ بیگم نے یہ سب جھوٹ ہونے  
کی دل سے دعا کی اور اپنی چھڑی اٹھاتے کپڑے تبدیل کرنے چلی گئیں تاکہ جلدی سے شہر کے لیے نکل  
سکیں۔

دو گھنٹے کے تھکا دینے والے سفر کے بعد مراد نے احتشام صاحب کی بتائی ہوئی بلڈنگ کے سامنے  
گاڑی روکی تو رشیدہ نے ساجدہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اُتارا اور مراد کی رہنمائی میں لے کر زارون کے  
اپارٹمنٹ تک پہنچی، جہاں پہنچتے ہی اُنھوں نے مراد کو واپس جانے کا کہا اور رشیدہ کو بیل بجانے کا اشارہ  
کیا جس کے ایک منٹ بعد ہی اندر سے زارون کی آواز اُبھری اور ساتھ ہی دروازہ کھلا جس کے بعد  
دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔

”دی جان؟ آپ یہاں؟“ زارون نے حیرت اور خوشی کے ملے جلنے تاثرات کے ساتھ خاموشی  
کو توڑا اور ساتھ ہی آگے بڑھتے اُن کا ہاتھ تھاما۔

”ہاں میں یہاں، کیا میں یہاں نہیں آ سکتی؟“ اُس کے ہاتھ تھامتے ہی اُنھوں نے رشیدہ کا ہاتھ  
چھوڑا اور زارون کے سہارے اندر آتے اپارٹمنٹ میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔

”آ سکتی ہیں آپ کا اپنا گھر ہے پرمجھے بتا دیتیں میں خود آپ کو ہو یلی سے لے آتا یسے اکیلے آنے

کی کیا ضرورت تھی؟، خفگی کا اظہار کرتے وہ انھیں لاوئخ میں موجود صوفوں میں سے ایک پر بٹھا چکا تھا۔  
”کبھی کبھی جوان اولاد کے پیچھے ماں باپ کو اچانک بھی چلے جانا چاہیے تاکہ خبر رہے کہ ان کی اولاد کوئی ایسا کام تو نہیں کر سکتی جس سے ان کی اور ان کے خاندان کی بدنامی ہو،“ رشیدہ کو سامان لیے کھڑا دیکھ کر ساجدہ بیگم نے آہستگی سے اپنی بات مکمل کی جوزارون کی چھٹی حس کو فوراً ہی سرخ سگنل دے چکی تھی۔

”ہاہاہا! تو مطلب اس بار آپ میری جاسوسی کرنے آئی ہیں اور وہ بھی اچانک تاکہ مجھے کچھ چھپانے کا یا بھاگنے کا موقع نہ ملے،“ رشیدہ کو سامان سامنے کمرے میں لے جانے کا کہتے زارون نے نیچے زمین پر بیٹھ کر سر ان کی گود میں رکھا جن کی نظریں کمرے سے نکلتی لڑکی پر جسمی گئی تھیں۔

”یہ کون ہے؟“ زارون کی بات کا جواب دینے کے بجائے انہوں نے نور کی طرف اشارہ کیا تو زارون نے سراٹھاتے اپنے پیچھے دیکھا جہاں نور بھی ساجدہ بیگم کو دیکھ کر کچھ گھبرا گئی تھی۔

”بیوی ہے میری،“ ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیتے زارون نے نظریں جھکاتے بتایا تو ساجدہ بیگم نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

”مطلب جوا طلاع مجھے ملی تھی وہ بالکل ٹھیک تھی اور میں ایسے ہی تم پر اعتبار کرتے سب سے لڑتی رہی کہ نہیں میرا پوتا مجھے بتائے بغیر ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا پر میں بھول گئی تھی کہ تم اب بڑے ہو گئے ہو، تمہیں اب اپنی زندگی کے فیصلوں کے لیے نہ تو اپنے باپ کی ضرورت ہے اور نہ ہی میری،“ غصے اور دکھ کی ملی جلی کیفیت میں اپنی بات مکمل کرتے انہوں نے ایک نظر خاموش کھڑی نور پر ڈالی جو خود تمام معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتے حیرت سے ساجدہ بیگم کی طرف دیکھ رہی تھی جوزارون کے روکنے کے باوجود بھی اُس کی کوئی بھی وضاحت سنے بغیر سامنے موجود کمرے میں چلی گئیں جہاں زارون نے کچھ دیر پہلے رشیدہ کو بھیجا تھا۔

”یہ کون ہیں؟“ ساجدہ بیگم کے کمرے میں جاتے ہی زارون کو صوفے پر سرپکڑے بیٹھتا دیکھ کر نور نے قریب آتے پوچھا۔

”دادی ہیں میری اور اب تمہاری بھی پر ابھی غصے میں ہیں اس لیے تم اپنے کمرے میں جاؤ اور جب تک میں نہ بلاؤں باہر مت آنا،“ سنجیدگی سے کہتے زارون نے خود ساجدہ بیگم کو منانے کے لیے ان کے کمرے کا رخ کیا اور نور بھی اُس کی بات سنتے کندھے اچکاتے خاموشی سے واپس اپنے کمرے میں چل گئی۔



ملائکہ کی چینوں اور دھماکے کی آواز پر جہاں سلیم صاحب ریبوٹ پھینکتے جلدی سے کچن کی طرف بڑھے وہیں گھر میں داخل ہوتے جنید نے بھی کچن سے آگ اور دھواں نکلتا دیکھ کر جلدی سے اپنے قدم اُس جانب بڑھائے جہاں اب ملائکہ کی چیخ و پکار کی آوازیں آہستہ آہستہ ٹھم چکی تھیں۔

”یہ کیا ہوا؟ یا میرے خدا ملائکہ۔۔۔“ سلیم صاحب نے کچن کے قریب آتے ہی جنید کو سن بھالا جو ملائکہ کی آواز پر اندر کو دنے والا تھا اور خالدہ بیگم کو آواز لگائی جب تک محلہ کے کچھ لوگ بھی اُن کے گھر سے چیخ و پکار سُن کر وہاں آگئے اور جلدی سے جنید اور سلیم صاحب کے ساتھ مل کر پانی ڈالتے آگ بُجھانے کی کوشش کی جس کے تھمتے ہی جنید جلدی سے اندر داخل ہوا جہاں ملائکہ کی حالت دیکھ کر اُس نے کسی کے بھی آنے سے پہلے خالدہ بیگم کو اندر آتا دیکھ کر انہیں چادر لانے کا کہا اور دروازے کی سامنے کھڑے ہوتے کسی کو بھی اندر آنے سے روکا۔

”پلیز ابو آپ جلدی سے ایمبو لینس بلا کیں،“ ملائکہ کی حالت دیکھ کر جنید کے حواس بالکل اُڑ چکے تھے پر یہ وقت ہمت ہارنے کا نہیں تھا اس لیے اُس نے خالدہ بیگم کے آتے ہی اُن سے چادر لے کر ملائکہ کے اوپر دی جس کے جسم کے ساتھ ساتھ اُس کی سانسیں بھی کہیں آگ میں ہی جھلس چکی تھیں پر پھر

بھی امید کا دامن تھا متنے جنید نے اُسے اچھی طرح چادر میں لپیٹ کر وہاں سے باہر نکلا اور ایمبو لینس کے آتے ہی سلیم صاحب اور خالدہ بیگم سمیت (جو فقط بیٹی اور دنیا کے دھلاؤے کے لیے جھوٹے آنسو بہاتے بار بار ملائکہ کی زندگی کے لیے دعا کر رہی تھیں) اُسے لے کر ہسپتال پہنچ جہاں جاتے ہی ڈاکٹر نے چیک اپ کرنے کے بعد ملائکہ کی موت کی تصدیق کر دی۔

☆☆☆

”دی جان پلیز غصہ چھوڑ دیں میں نے آپ کو بتایا ناکہ کہ کن حالات میں ہمارا نکاح ہوا اور کیسے نور کے گھروالے اُس کی کسی دوسری جگہ شادی کرنے والے تھے تو آپ بتائیں میں کیا کرتا؟ کیا نکاح پر نکاح ہونے دیتا؟“ زارون نے اپنے زبردستی نکاح والی بات کو گول کرتے کچھ سیکنڈز پہلے دماغ میں اخذ کی گئی کہاںی پورے یقین کے ساتھ سنائی۔

”مجھے کوئی غصہ نہیں اور نکاح کر رہی لیا تھا تو تب ہی مجھے بتا دیتے پر تم نے تو نکاح کے بعد خصتی کر کے پچھلے ڈیر ڈھ مہینے سے اُس لڑکی کو اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے اور ہمیں بتانا تو دور کی بات بھنک تک نہیں پڑنے دی،“ ساجدہ بیگم نے اُس کی بات سنتے اپنی خفگی برقرار رکھتے ہوئے ایک اور اعتراض اٹھایا۔

”جی، یہ میری غلطی ہے کہ میں نے آپ کو نہیں بتایا پر آپ خود سوچیں میں آپ کو اتنی بڑی بات کیسے بتاتا؟ جب کہ میں یہ بات اچھے سے جانتا تھا کہ یہ سب سُن کر آپ کو ناصرف غصہ آئے گا بلکہ دکھ بھی ہو گا کہ میں نے اپنی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ آپ کو بناتا کر لیا لیکن دی جان یقین جانیں میں نے یہ سب اراداتاً نہیں کیا،“ زارون نے کہنے کے ساتھ ہی اُن کی گود میں سر رکھا تو اُس کے چہرے پر شرمندگی دیکھ کر ساجدہ بیگم مزید اپنے غصے کو برقرار نہ رکھ سکیں۔

”اچھا بس اب جو ہونا تھا ہو گیا پر اب سب میری مرضی سے ہو گا اور جو میں چاہوں گی تم ویسا ہی کرو گے،“ ساجدہ بیگم نے اُسے معاف کرنے کے ساتھ ساتھ شرط رکھی تو زارون نے جلدی سے سر

اٹھاتے ان کا ہاتھ پکڑا۔

”ٹھیک ہے جیسا آپ کہیں گی اور چاہیں گی میں ویسا ہی کروں گا اور دوبارہ آپ کو میری اور نور کی طرف سے شکایت کا کوئی موقع نہیں ملے گا،“ چہرے پر چمک لیے اُس نے ان کی بات سننے سے پہلے ہی ہامی بھری جس پر ساجدہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اُس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا جس سے انہوں اخشم صاحب سے بھی زیادہ محبت تھی۔

”بس ٹھیک ہے اپنی بیوی کو بلا و آج سے وہ میرے ساتھ رہے گی اُس وقت تک جب تک میں حوالی میں سب لوگوں کی موجودگی میں شاندار طریقے سے تم لوگوں کی شادی نہیں کر دیتی،“ جتنی نرمی سے ساجدہ بیگم نے اپنی شرط بتائی زارون نے اُتنی ہی حرمت سے ان کی طرف دیکھا۔

”دی جان یہ تو ظلم ہے وہ بھی بہت بڑا،“ ان کی بات سنتے ہی زارون کے چہرے کا رنگ بدلا کیوں کہ کل ہی تو نور نے اُسے قبول کرتے ڈیڑھ مہینے میں پہلی بار اُس کے حق جتلانے پر نہ کوئی لڑائی کی اور نہ ہی غصہ اور آج دی جان نے آکر پھر سے پابندی لگادی۔

”تم نے کہا تھا کہ تم میری ہر بات مانو گے،“ ساجدہ بیگم نے اُسے اُس کا وعدہ یاد دلایا تو زارون نے منہ پھلانے ان کی طرف دیکھا جو اُس کی حالت سے محفوظ ہوتے کوئی بھی اثر لیے بغیر رشیدہ کو آوازیں دینے لگیں (جو زارون کے آتے ہی کمرے سے چلی گئی تھی)۔



سلیم صاحب نے جنید کو ہمت ہارے دیکھ کر خود ہی ہسپتال کے تمام معاملات ننمائے پر عین واپسی کے وقت پولیس کے آنے پر ان کے ساتھ ساتھ خالدہ بیگم کے بھی رنگ اُڑے۔

”جی، جناب یہ بادی آپ پولیس کی کارروائی کے بغیر گھر نہیں لے جاسکتے،“ انسپکٹر نے آگے بڑھتے سلیم صاحب کو مخاطب کیا۔

”پر کیوں؟ اور یہ سب ایک حادثہ تھا۔ اس لیے پلیز ہم پہلے ہی بہت پریشان ہیں آپ مزید مت کریں،“ سلیم صاحب نے انسپکٹر کی بات سنتے ہی اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”ہم یہ تو بعد میں پتا چلے گا کہ یہ حادثہ تھا یا کوئی سازش اور جناب اس طرح کے ہزاروں کیس ہم روزانہ دیکھتے ہیں جس میں یا تو گھروالے بہو کو آگ لگادیتے ہیں یا خاوند خود اپنی بیوی کی جان لے لیتا ہے اور بعد میں اُسے حادثے کا رنگ دے کر اپنی جان بخشی کروالیتے ہیں۔ پر ہم پولیس والوں نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلیں اس لیے جب تک ہماری طرف سے ساری کارروائی مکمل نہیں ہو جاتی نہ آپ لوگ یہاں سے کہیں جاسکتے ہیں اور نہ ہی باڑی کو لے جاسکتے ہیں،“ سلیم صاحب کی بات پر انسپکٹر نے طیش میں آتے ہوئے کہا اور وارڈ بوانے کو باڑی واپس اندر لے جانے کا کہتے اپنے ساتھ موجود لیڈی انسپکٹر کو خالدہ بیگم سے پوچھ پکھ کرنے کا کہتے خود سلیم صاحب سے پوچھتے کچھ پولیس والوں کو ان کے گھر روانہ کیا تاکہ محلہ داروں سے واقعہ کے متعلق تحقیق کر سکیں۔ خود ان سے نمبر لیتے ملانکہ کے گھر فون کرتے انہیں اُس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا بتاتے جلد از جلد ہسپتال پہنچنے کا آرڈر دیا تاکہ ساری بات کھل کر سامنے آسکے۔



دی جان نے رشیدہ کو بول کر نور کو اپنے کمرے میں بُلا یا جو کچھ منٹ بعد پہنچاتے ہوئے وہاں آئی جہاں زاروں ابھی تک بیٹھا دی جان سے اُن کی شرط پر نظر ثانی کی درخواست کر رہا تھا۔

”آؤ بیٹا یہاں میرے پاس بیٹھو، اُس کے چہرے پر گھبراہٹ دیکھ کر ساجدہ بیگم نے ہاتھ آگے بڑھاتے خود ہی اپنے قریب آنے کا کہا۔

”میں زاروں کی دادی ہوں اور اب تمہاری بھی اس لیے تم بھی اب سے مجھے دی جان بولوگی جیسے زاروں بولتا ہے، اپنے بیگ سے کچھ پسیے نکال کر نور کے ہاتھ میں تھماتے اُنہوں نے جتنے خلوص اور

نرمی سے سمجھا یا نور کو انکار کرنا مناسب نہیں لگا۔

”جی دی جان“، اثبات میں سر ہلاتے اُس نے ایک نظر ان کے پُر نور چہرے کی جانب دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے کی نسبت اب کافی نرمی اور سکون تھا۔

”زارون نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے اس لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ میں بالکل بھی ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی اولاد کی غلطی کو اپنے اور ان کے لیے پوری زندگی کا عذاب بنادیتے ہیں۔ ویسے بھی جو فیصلے جس طرح اللہ پاک نے لکھے ہیں وہ ویسے ہی ہونے ہوتے ہیں پر ہم انسان اپنی اناکے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ سوچ لیتے ہیں کہ نہیں ہماری اولاد نے ہماری مرضی کے خلاف فیصلہ کیا ہے تو ہم انہیں کبھی معاف نہیں کریں گے حتیٰ کہ جوڑے تو آسمان پر بنتے ہیں اور ہو سکتا ہے جو ہم فیصلہ کرتے وہ ہمارے ساتھ ساتھ ہماری اولاد کے لیے بھی غلط ثابت ہوتا اس لیے جو ہو گیا اُسے بھول جاؤ اور ہمیشہ خوش رہو“، اُس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ساجدہ بیگم نے بہت پیار سے اُسے شرمندگی سے نکالا جس پُر نور کا دل ایک دم سے بھرا یا کیوں کہ آج تک ماں کالمس تو اُس نے محسوس ہی نہیں کیا اور فریجہ بیگم نے بھی آج تک اُسے کبھی اپنے ساتھ نہیں لگایا۔ ہمیشہ اُس نے عورت کا ایک ہی روپ دیکھا تھا جس میں وہ بہت ظالم تھی پر آج ساجدہ بیگم کی باتوں اور پیار نے اُس کا یہ نظریہ غلط ثابت کر دیا تھا (ہی وہ جذبات میں آکر زارون کی پرواکیے بنا) (جو قب سے اُن دونوں کی باتوں کے درمیان خاموش بیٹھا تھا) ساجدہ بیگم کے ساتھ لگتے رونے لگی تو وہ خود بھی بوکھلا کر اُسے چپ کرواتے سوالیہ نظر وہ سے زارون کی طرف دیکھنے لگیں جس نے نفی میں سر ہلاتے کندھے اچکا دیے۔



ملائکہ کے گھروالوں کے آتے ہی ان سپکٹر نے اُن سے پوچھ گئی جو جوان بیٹی کی موت کا سُن کر ویسے ہی غم سے نڈھاں ہو چکے تھے اور اب ان سپکٹر کی باتیں اور سوال وجواب انہیں مزید اذیت دے

رہے تھے تب ہی سلیم صاحب نے سکندر صاحب کو فون کیا تاکہ وہ اپنے کسی جان پہچان والے سے بات کر کے اس معاملے کو ختم کروائیں۔

”ٹھیک ہے میں آتا ہوں، کس ہسپتال میں ہیں آپ لوگ؟“ سلیم صاحب کی مکمل بات سننے کے بعد انہوں نے ملانکہ کی موت پر اظہار افسوس کرتے اُن سے پوچھا تو سلیم صاحب نے انہیں ہسپتال کا نام بتاتے فون بند کیا اور جنید کے پاس آگئے جو تب سے ہی خاموش بیٹھا تمام لوگوں کے چہروں کو تک رہا تھا۔

”جنید بیٹا خود کو سنبھالو اور اٹھو میرا ساتھ دو، دیکھو پولیس والے ملانکہ کی ڈیڈ بادی نہیں دے رہے،“ سلیم صاحب نے اُس کے قریب آتے اُسے مخاطب کیا جس کی نظر وہ میں ابھی تک ملانکہ کا جھلسا ہوا وجود گھوم رہا تھا۔

”جنید؟“ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر سلیم صاحب نے اُسے ہلا�ا جو ایک نظر ان کی طرف دیکھ کر پھر سے خاموشی سے سامنے دیوار کو دیکھنے لگا۔

”اُفف میرے اللہ ہمیں اس مصیبت سے نکال اور میرے بیٹے کو صبر دئے،“ جنید کی حالت دیکھ کر سلیم صاحب نے ہاتھ اٹھاتے دعا کی اور اپنے بوڑھے وجود کو پھر سے حوصلہ دیتے انسپکٹر کے پاس آئے جو ابھی تک ملانکہ کے والدین سے اُس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں سکندر صاحب حارت کے ساتھ ہسپتال پہنچے اور اپنی جان پہچان کے کچھ لوگوں سے بات کرتے پولیس کے ہاتھوں سے اُس معاملے کو رفع کروایا اور ملانکہ کی ڈیڈ بادی لے کر گھر پہنچ جہاں تمام محلے والے (جو پہلے ہی پولیس والوں سے ملانکہ کی موت کا سُن چکے تھے) وہاں موجود تھے۔ سکندر صاحب نے کال کر کے فریجہ بیگم کو بھی بتا دیا تھا تب ہی وہ بھی کچھ دیر میں وہاں پہنچ گئیں جہاں ایک قیامت کا سماء تھا۔

ملائکہ کی ماں اور بھنیں رورو کے بے حال ہو چکی تھیں پر خالدہ بیگم کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں گرا۔ وہ بہت پر سکون انداز میں تمام مہمانوں سے مل رہی تھیں اور ساتھ اس حادثہ کو قسمت کا لکھا بول کر سب کو واقعہ کی تمام تفصیل سے آگاہ کرتے ایک نظر جنید پر بھی ڈال لیتیں جوتب سے اب تک کسی بُت کی مانند خاموش بیٹھا لوگوں کی تسلیاں اور باتیں سن رہا تھا۔

ملائکہ کی حالت کیوں کہ زیادہ دیر رکھنے والی نہیں تھی اور پورا وجود جلنے کی وجہ سے چہرہ بھی کسی کو دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا اسی لیے سلیم صاحب نے حارث اور حاشر کو بول کر ملائکہ کو اُس کی آخری منزل تک پہنچانے کے تمام انتظامات مکمل کروائے اور کفن دفن کے بعد ملائکہ کے گھر والوں کو تڑپتا چھوڑ کر جنازہ اٹھائے قبرستان کی طرف بڑھے جہاں پہنچ کر جنید نے سارے وقت میں پہلی بار ملائکہ کو لئر میں اُتر تاد لیکھ کر اپنی خاموشی توڑی اور اُس سے پکارتے ہوئے آگے بڑھا جو کافی دیر پہلے ہی اُس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔



دی جان کے آنے سے جہاں زارون کو نور کی طرف سے تسلی ہو گئی تھی کہ اب وہ گھر میں اکیلی نہیں ہے۔ وہیں نور بھی گھر میں کسی اور فرد کے اضافے سے کافی خوش تھی۔ وہ سارا وقت اُن سے باتوں میں مصروف، کبھی حارث کے بارے میں بتاتے خوش ہو جاتی تو کبھی سکندر صاحب کے ذکر پر افسرده۔ دی جان کی نرم طبیعت کی وجہ سے وہ ایک ہی ہفتے میں اُن سے کافی حد تک گھل مل گئی تھی۔

رات بھی اُن کی پابندی کے مطابق وہ اُن کے ساتھ سوتی جس پر زارون نے کافی بار اعتراض اٹھایا پر نور تو پہلے ہی اُس کے معا ملے میں کافی لاپروا اور بے فکر تھی، اوپر سے باقی رہی سہی کسر دی جان نے اُس سے دور کر کے نکال دی پر آج آفس سے آتے خود کو مسلسل ایک ہفتے سے اگنور ہوتا دلکھ کر اُس کی ہمت جواب دے چکی تھی تب ہی اُس نے دی جان سے بات کرنے کا سوچتے اُن کے کمرے کی

جانب قدم بڑھائے۔

”دی جان مجھے آپ سے بات کرنی تھی“، کمرے کے دروازے پر دستک دیتے وہ اندر آیا تو نور نے اُس کو دیکھتے ہی مکبل چہرے پر لیا جس پر زارون نے دل میں بدلہ لینے کا ارادہ کرتے دی جان کو اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

”ہاں، کرو بات“، اپنے قریب بیٹھنے کی جگہ دیتے انہوں نے اجازت دی تو زارون نے اپنی بات کے لیے مناسب الفاظ تلاش کرتے ایک نظر رشیدہ کو دیکھا جو دی جان کے ساتھ ہی سنگل بیڈ پر لیٹی اُن سے زیادہ اُس کے بولنے کی منتظر لگ رہی تھی۔

”وہ میں نے کہنا تھا کہ بلکہ پوچھنا تھا کہ آپ کو یہاں کسی چیز کی تنگی تو نہیں؟ مطلب آپ تینوں ایک کمرے میں تنگ تو نہیں ہوتیں؟“، زارون نے بات شروع کی تو اسے سمجھنہیں آیا کہ وہ کیا بولے تب ہی بات بدلتے اُس نے دی جان کو اپنی مسکراہٹ چھپاتا دیکھ کر شرمندگی سے سر جھکایا۔

”نہیں، ہمیں یہاں کوئی مسئلہ نہیں اور نہ ہی کوئی تنگی، پر لگتا ہے تمہیں کوئی مسئلہ ہے؟“، اُس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر ساجدہ بیگم نے با مشکل اپنی مسکراہٹ چھپاتے پوچھا۔

”نہیں مجھے کیا مسئلہ ہو گا میں تو بس آپ کے لیے بول رہا تھا“، اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پاتے اُس نے نفی میں سر ہلایا اور ایک ضروری کام کا بولتے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔



ایک ہفتہ گزرنے کے بعد بھی جنید نہ تو ملائکہ کی موت کا یقین کر پایا اور نہ ہی خود کو سنبھال سکا جس کی وجہ سے نا صرف سلیم صاحب بلکہ خالدہ بیگم بھی کافی پریشان تھیں۔ تب ہی انہوں نے جنید کو سمجھا نے کی کوشش کی تاکہ وہ اس حقیقت کو قبول کرتے زندگی کی طرف لوٹ آئے پر جنید کے زرد پڑتے رنگ اور آنکھوں کے گرد گھرے حلقوں نے انہیں اپنی خاموشی توڑنے پر مجبور کیا اور وہ اپنے کمرے میں آتے ہی

سلیم صاحب پر برس پڑیں جو ابھی ابھی دکان سے واپس آئے تھے۔

”سلیم میں آپ سے کتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں کہ جنید کو سمجھا تھا میں کہ اُس لڑکی کا غم منانا بند کرے اور کمرے سے باہر آئے تاکہ میرے دل کو تھوڑی تسلی ہو کہ وہ ٹھیک ہے“، خالدہ بیگم نے بیڈ پر اُن کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، میں تو روز سمجھاتا ہوں پرشاید ابھی اُس کا ذہن ملائکہ کی موت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے“، اپنی عینک اُتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے انہوں نے خالدہ بیگم کی بات کو ایک مامتا کی ترڑ پ سمجھ کر نرمی سے جواب دیا۔

”تو کیا ساری زندگی اُس کم ذات کا سوگ مناتے خود کو تکلیف دیتا رہے گا؟“، اُن کی بات سنتے ہی خالدہ بیگم نے کوئی بھی لحاظ کیے بغیر غصے سے کہا۔

”خالدہ شرم کرواب تو وہ بچاری مرچکی ہے پر تم اب بھی اُس کے لیے ایسے الفاظ استعمال کر رہی ہو“، سلیم صاحب نے اُن کی بات سنتے ہی تھوڑی شرم دلانا چاہی مگر خالدہ بیگم نے اُن کی کسی بات کا اثر لیے بغیر ملائکہ کو ایک بار پھر سے کوسنا شروع کر دیا۔

”تو کیا کہوں؟ مرگئی ہے پر میرے بیٹے کا پیچھا ابھی تک نہیں چھوڑا، پتا نہیں کیا گھول کے پلاٹی رہی ہے جو میرا بیٹا یوں اُس کے لیے پاگل ہو رہا ہے جیسے پتا نہیں کون سی کوئی حور پری تھی“، کمر پر ہاتھ رکھتے انہوں نے ماتھے پر بل ڈالتے حقارت سے اپنی بات مکمل کی جس پر سلیم صاحب نے کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے اُن کے ایک دم سے بدلتے رویے کو محسوس کیا۔

”حور پری نہیں تھی وہ لیکن جنید کو محبت تھی اُس سے اور پتا ہے زندگی میں سب سے مشکل کام کیا ہے؟“، سلیم صاحب نے اُن کے سامنے آتے سوالیہ نظرؤں سے دیکھتے خود ہی جواب دیا۔

”کسی ایسے انسان کی دوری برداشت کرنا جسے آپ نے زندگی میں سب سے زیادہ چاہا ہو، شدت

سے اُس کی خواہش کی ہو مگر وہ انسان کچھ دیر کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے آپ کی نظر وہ کے ساتھ ساتھ اس دنیا سے بھی دور ہو جائے نا تو ایک نہ بیان ہونے والی تکلیف آپ کی زندگی کا احاطہ کر لیتی ہے پر تم یہ سب کبھی نہیں سمجھ پاؤ گی کیوں کہ مجھ سے تو دور کی بات کبھی تم نے اپنی اولاد تک سے محبت نہیں کی،“ بڑی نرمی سے انہوں نے خالدہ بیگم کو آئینہ دکھایا اور مزید کچھ سننے یا کہے بغیر جنید کے کمرے کی جانب بڑھے۔

”ہونہہ یہاں تو ہر کوئی میرا استاد بنارہتا ہے بس کوئی بات کرنے کی دیر ہوتی ہے سب شروع ہو جاتے ہیں،“ کندھے اچکاتے انہوں نے سلیم صاحب کی بات کو دوہرایا اور تمام باتوں کو دفع کرتے ہیں وی لگاتے ڈرامہ دیکھنے لگیں۔



نور کے زخم اب بالکل ٹھیک ہو چکے تھے اور اُس کے پیپر بھی قریب تھے (جس کے بارے میں اُسے خدیجہ نے بتایا تھا) تب ہی اُس نے یونیورسٹی جانے کا فیصلہ کیا اور دی جان سے اجازت لیتے اُس کے کمرے میں آئی تاکہ اُسے صحیح یونیورسٹی چھوڑنے کا بول سکے۔

”آ جائیں،“ دستک کی آواز پر زارون نے لیپ ٹاپ کی اسکرین سے نظریں ہٹا کر دروازے کی جانب دیکھا۔

”تم مصروف تو نہیں؟“ اندر داخل ہوتے نور نے اُس کے سامنے لیپ ٹاپ کھلا دیکھ کر سوال کیا۔ ”نہیں، آ جاؤ تم،“ جلدی سے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ہاتھ مار کر بند کرتے اُس نے نور کو خوشگوار حیرت سے دیکھا۔

”وہ میں نے ایک بات کرنی تھی اس لیے آئی ہوں،“ اُس کے چہرے کی چمک پر نور نے جلدی سے وضاحت دی اور سامنے موجود صوفے پر بیٹھ گئی۔

”ہاں بولو، اُس کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد زارون نے اپنی نظروں کا زاویہ بدلتے کلاک کی جانب دیکھا جہاں رات کے دس نج رہے تھے۔

”وہ میرا پیپر ہے جمعہ کو، میری دوست ہے ناخدیجہ اُس نے بتایا تو میں سوچ رہی تھی کل یونیورسٹی چلی جاؤں، نوٹس وغیرہ لے لوں گی ساتھ یا پھر بھی نوٹ کرلوں گی تاکہ پھر سکون سے گھر بیٹھ کر پیپر زکی تیاری کر سکوں،“ نور نے پوری تفصیل سے اُسے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

”تو چلی جاؤ بلکہ میں صحیح جاتے ہوئے تمہیں چھوڑ دوں گا اور مجھے کال کر دینا واپسی پہنچی لے لوں گا،“ اُس کی بات سنتے ہی زارون نے نرمی سے جواب دیتے ایک سینکڑ میں اُس کا مسئلہ حل کیا۔

”پرمجھے ڈرگتا ہے کہ وہ وہاں بھی آگیا تو؟“ نور نے اپنی ہمکچاہٹ کی اصل وجہ بتاتے نظر اٹھا کر اُسے دیکھا جواب انٹھ کر اُس کے قریب آچکا تھا۔

”کیوں ڈرگ رہا ہے اور وہ کیسے وہاں آئے گا؟ کیا تمہیں لگتا ہے کہ وہ اتنا طاقتور ہے کہ میرے ہوتے ہوئے دوبارہ تمہیں تکلیف پہنچا سکے؟“ اُس کے سامنے زمین پر بیٹھتے زارون نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا جو اُس کے دیکھتے ہی نظریں چراگئی۔

”پتا نہیں پرمجھے ڈرگتا ہے، آنکھوں میں نبی لیے اُس نے نفی میں سر ہلایا تو زارون نے لمبی سانس لیتے خود کو پرسکون کیا اور انٹھ کر صوفے پر اُس کے قریب بیٹھا جواب چہرہ ہاتھوں میں چھپائے رونے لگی تھی۔

”ٹھیک ہے اگر تمہیں ڈرگتا ہے تو میں کل آفس نہیں جاؤں گا بلکہ تمہارے ساتھ یونیورسٹی جاؤں گا اور جب تک تمہارا کام مکمل نہیں ہو جاتا تمہارے ساتھ وہیں رہوں گا،“ زارون نے اُس کا ہاتھ پکڑتے یقین دلایا تو نور نے کوئی بھی جواب دینے کے بجائے اُس کی بات پر غور کرتے رونا دھونا چھوڑتے جیرت اور بے یقینی سے اُس کی طرف دیکھا۔

”مطلوب تم سارا وقت میرے ساتھ رہو گے؟“ تصدیق کے لیے نور نے اُس کی بات دوہرائی۔

”ہاں ساتھ رہوں گا بلکہ تمہارے نوٹس وغیرہ مکمل کرنے میں مدد بھی کر دوں گا،“ زارون نے ایک عزم سے کہا تو نور نے اُس کی بات پر مسکراتے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ کے نیچے سے نکالا۔

”لکھائی دیکھی ہے اپنی؟ تو بہ اتنی گندی ہے کہ میں نے اُس دن وہ چٹ دس بار پڑھی تب جا کر سمجھ آئی مجھے،“ اُس کی بات سنتے ہی نور نے تیوری چڑھاتے اُس کے منہ پر ہی اُس کی بے عزتی کی۔

”ہونہہ اب اتنی بھی بری نہیں جتنی تم نے بے عزتی کر دی ہے میری،“ خفگی سے کہتے زارون نے اُس کا ہاتھ دوبارہ سے پکڑتے اپنے قریب کیا۔

”کیا کر رہے ہو؟ چھوڑو مجھے،“ اُسے فری ہوتا دیکھ کر نور نے جلدی سے اُس کے سینے پر ہاتھ رکھتے پیچھے کی جانب دھکیلا اور انٹھ کر جانے لگی پر اُس سے پہلے ہی زارون نے اُسے سنبلنے کا موقع دیے بغیر ہی ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ سیدھی اُس کے اوپر آگری۔

”کیا بد تیزی ہے یہ؟“ شرم سے لال ہوتے اُس نے غصے سے سر انٹھاتے دروازے کی طرف دیکھا جو کھلا تھا۔

”وہی جو تم پچھلے دس دن سے کر رہی ہو،“ اُسے اپنے حصار میں لیتے زارون نے جتنی نرمی سے جواب دیا نور نے اتنے ہی غصے سے اُسے گھورا۔

”پلیز چھوڑو مجھے دی جان کیا سوچیں گی کہ اتنی دیر سے گئی ہے اور ابھی تک آئی کیوں نہیں،“ نور نے نظریں دروازے پر رکھتے زارون کی منت کی۔

”تو سوچ لینے دو اور چپ کر کے لیٹی رہو۔ اتنے دن سے ایسے مجھ سے بھاگ رہی ہو جیسے میرے ساتھ کوئی رشتہ ہی نہ ہو تمہارا،“ بال اُس کے چہرے سے ہٹاتے زارون نے اُس کی مزاحمت پر آنکھیں نکالیں اور اُس کی گردن پر جھکنے لگا کہ نور نے اُس کا ارادہ بھانپتے ہی اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔

”پلیز میں کہہ رہی ہوں نا، مجھے چھوڑ دو، ورنہ میں زور سے چینوں گی تاکہ دی جان خود، ہی یہاں آجائیں،“ نور نے اپنا ہاتھ ہٹاتے اُسے دھمکایا جس کا کوئی بھی اثر لیے بغیر زارون نے اپنی گرفت مزید تنگ کی۔

”تو چخ لو، آنکھوں میں شرارت لیے اُس نے جتنے سکون سے کہا نور نے اُتنی ہی بے چینی سے دروازے کو دیکھا۔

”پلیز زارون رشیدہ آجائے گی،“ نور نے غصے سے بات بنتی نہ دیکھ کر نرمی سے کہا تو زارون نے جواب دینے کے بجائے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے نیچے جھکتے اُس کے ہونٹوں کو اپنی گرفت میں قید کیا تو نور نے اُس کی شرط کو مضبوطی سے اپنی مٹھی میں دبوچے آنکھیں بند کیں۔

کچھ سیکنڈز کی خاموشی کے بعد زارون نے اپنے چہرے پر نمی محسوس کرتے اپنی گرفت کمزور کی۔

”کیا ہوا؟“ اُس کے گال پر آنسوؤں کی نمی دیکھ کر زارون نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں،“ نفی میں سر ہلاتے اُس نے آنکھیں کھولیں تو زارون نے اُس کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے سمجھا کہ وہ اُس کی زبردستی پر رورہی ہے تب ہی اُسے اپنے حصار سے نکالتے صوف پر بیٹھایا۔

”سوری وہ بس میں۔۔“ زارون نے شرمندگی سے سر جھکاتے وضاحت دینا چاہی پر اُس سے پہلے ہی نور اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

”اُفف پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے مجھے،“ اُس کے اس طرح خاموشی سے جانے پر زارون نے خود کو کوسا اور صبح نور کو منانے کا ارادہ کرتے اٹھ کر لیپ ٹاپ آن کیا تاکہ اپنا کام مکمل کر سکے۔



”حارت،“ سکندر صاحب جولا و نج میں اُسی کے انتظار میں بیٹھے تھے انہوں نے اُسے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتا دیکھ کر آواز دی۔

”السلام عليكم ابو آپ ابھی تک سوئے نہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟“، سکندر صاحب کی آواز پر اُس کے سیڑھیوں کی جانب بڑھتے قدم رکے اور اُس نے اُن کی جانب متوجہ ہوتے حیرت سے سوال کیا۔

”ہاں طبیعت ٹھیک ہے میری بس تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ یہاں آؤ مجھے کچھ بات کرنی ہے،“ صوفے پر بیٹھتے اُنہوں نے اُسے بھی اپنے سامنے پڑے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔  
”جی بولیں،“، ہاتھ میں پکڑا موبائل ٹیبل پر رکھتے وہ اُن کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”یہ آج کل تم کچھ زیادہ ہی لیٹ نہیں آنے لگ گئے اور کون سا ایسا کام ہے جو صحیح سات بجے شروع ہو کر رات بارہ ایک بجے تک ختم ہوتا ہے؟“، سکندر صاحب نے اُسے منتظر پا کر بات کو گھمانے کے بجائے اصل بات پر آتے پوچھا۔

”آفس میں ہی کام ہے کچھ نئے پراجیکٹ شروع ہوئے ہیں جن کو میں ہی ڈیل کر رہا ہوں اس لیے دیر ہو جاتی ہے،“، صفائی سے جھوٹ بولتے اُس نے ایک نظر فریجہ بیگم کے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا جو بند تھا۔

”ہم آئندہ جو بھی کام ہو مجھے تم ٹھیک دس بجے گھر پر موجود چاہیے ہو اور میں نے رخصتی کی ڈیٹ فکس کر دی ہے۔ اگلی اتوار کو کچھ مہمانوں کی موجودگی میں سارہ کو تمہارے ساتھ اوپرشفت کر دیا جائے گا اس لیے اپنی روٹین ٹھیک کروتا کہ سارہ کو تم سے کوئی شکایت نہ ہو۔ باقی میں جو فیصلہ کر چکا ہوں وہ تبدیل نہیں ہو گا اس لیے اسے میرا حکم سمجھ لو یا درخواست، پر اب مجھ میں کسی قسم کی کوئی پریشانی برادرست کرنے کی ہمت نہیں ہے تو تمہارے لیے بہتر ہو گا کہ اب اپنی نئی زندگی کا آغاز پچھلی تمام باتوں کو بھول کر کرو،“، حارث کو کچھ بولنے کے لیے منہ کھولتا دیکھ کر سکندر صاحب نے اشارے سے منع کرتے اپنی بات ختم کی اُسے اپنی تمام تیاری مکمل رکھنے کا کہتے اُس کی کوئی بھی بات سنے بغیر کمرے میں چلے گئے۔

☆☆☆

اگلی صبح زارون اپنے وعدے کے مطابق نور کے ساتھ ہی یونیورسٹی گیا جہاں ان کا سب سے پہلا سامنا خدیجہ سے ہی ہوا۔

”السلام علیکم“، نور نے اُس کے قریب جاتے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا جو کسی لڑکی سے کوئی بات کرنے میں مصروف تھی۔

”اوو وو و شکر ہے نور مجھے تمہاری شکل دیکھنے کو ملی ورنہ تم تو ایسے غائب ہوئیں جیسے اس دنیا میں موجود ہی نہ ہو“، اُس کے سلام کا جواب دیتے وہ اپنی ہی دھن میں بولتے اُس کے لگنے تو زارون نے اُس بھورے بالوں والی لڑکی کو غصے سے گھورا۔

”یہ کون ہے؟“ اُس پر نظر پڑتے ہی خدیجہ نے نور سے الگ ہوتے سوال کیا۔

”یہ زارون ہیں میرے شوہر اور زارون یہ خدیجہ ہے میری بیست فرینڈ“، نور نے ان دونوں کا تعارف ایک دوسرے سے کروایا تو اُس نے ایک بار پھر سے اُس لڑکی کا تفصیلی جائزہ لیا جو ٹھنڈوں سے اوپنجی جیز کے ساتھ با مشکل پیٹ تک آتی شرط اور دوپٹے سے بے نیاز، میک اپ سے اٹے چہرے پر بے فکری مسکراہٹ سجائے اُسے کہیں سے بھی نور کی چوائیں نہیں لگی۔

”اویہ تو بہت ہینڈسم ہیں میری سوچ سے بھی زیادہ“، ایک بے باک سی نظر زارون پر ڈالتے جو اُس کے دیکھتے ہی اپنی نظروں کا زاویہ بدل کر نور کو دیکھنے لگا جو گاؤں کے ساتھ اچھے سے جا ب کیے چہرے پر معمومیت لیے خدیجہ کی بات پر نرمی سے مسکراتے اثبات میں سر ہلاگئی۔

”ہم شکر یہ، مگر پلیز براہم مانیے گا مجھے آپ کسی بھی اینگل سے اچھی نہیں لگیں اور نہ ہی مجھے آپ سے مل کر کوئی خاص خوشی ہوتی۔ اس لیے میں آپ کی کوئی تعریف نہیں کر سکتا“، زارون نے نور کے گھورنے کی پرواکیے بناءہی لاپرواٹی سے اپنی بات کمکل کی تو خدیجہ نے اُس کے منہ پھٹ ہونے کے

ساتھ ساتھ بد تیز ہونے پر بھی اپنی مسکراہٹ سکریٹ نور کو دیکھا جوزارون کو چپ رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

”زارون کیا بول رہے ہوتم؟“ نور نے اُسے آنکھیں نکالنے اُس کے مزید کچھ بولنے سے پہلے ہی ٹوکا تو خدیجہ نے اُسے اشارے سے چپ کرواتے دو قدم آگے بڑھائے اور پھر سے چہرے پر مسکراہٹ سجائتے اُسے دیکھنے لگی جوابھی بھی آنکھوں میں ناپسندیدگی لیے اُسے گھور رہا تھا۔

”خیر ہے بولنے دخوب صورت لوگوں پر اسی طرح کا ایپنیو ڈاچھا لگتا ہے، اُس کی آنکھوں میں دیکھتے وہ ایک ادا سے کہتے اُس کے مزید قریب ہوئی تو زارون نے خونخوار نظروں سے اُسے دیکھتے دو قدم پیچھے کی جانب بڑھائے۔

”اپنی حد میں رہو، انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتے اُس نے نور کا ہاتھ پکڑا (جو خود خدیجہ کی حرکت پر شرمندہ تھی) اور یونیورسٹی کے دوسرے حصے کی جانب بڑھا۔

”زینٹھیک کہتا ہے بہت دماغ خراب ہے اس شخص کا“، اُس کی پشت کو گھورتے خدیجہ نے اپنی بے عزتی پر گردھتے ہوئے خود کلامی کی اور اپنا موبائل نکال کر زین کو کال کرنے لگی تاکہ اُسے زارون کے یونیورسٹی آنے کے بارے میں بتاسکے۔



”کیا مسئلہ ہے تمہیں؟ کیوں تم نے میری دوست کی انسٹ کی؟ اگر تمہیں وہ اچھی نہیں لگی تھی تب بھی اُس کے سامنے یہ سب بولنے کی کیا ضرورت تھی؟“ نور نے تھوڑی دور جاتے ہی زارون کا ہاتھ جھکلتے حصے سے کہا۔

”میں کسی کا ادھار نہیں رکھتا اور اُس لڑکی نے جس طرح مجھ سے بات کی شکر کرو میں نے منہ سے ہی جواب دیا ورنہ ایسے لوگوں کو تو میں جواب دینا دور کی بات، دیکھنا تک پسند نہیں کرتا اور تم؟ پاگل ہو

کیا؟ کیا ضرورت ہے ایسی فضول لڑکی کو دوست بنانے کی؟، زارون نے کسی کی پرواکیے بناءُ اُس سے بھی زیادہ غصے سے بات کی تو نور نے پاس سے گزرتے اسٹوڈنٹس کو اپنی طرف متوجہ پا کر جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کی اور اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے اپنے قدم لا بیری کی جانب بڑھائے۔

”پتا نہیں کیا سمجھتی ہے خود کو، سڑی ہوئی چڑیل کہیں کی،“ اُس کی پشت کو دیکھتے زارون نے خود کلامی کی اور اُس کے پیچھے ہی لا بیری کی جانب بڑھا۔

”میرے پیچھے کیوں آئے ہو؟“ لا بیری میں داخل ہوتے ہی نور نے اُسے اپنے پیچھے ہی اندر داخل ہوتا دیکھ کر ٹوکا۔

”ہاں تو کہاں جاؤں میں؟ یہاں کون سی میری ماں بیٹھی ہے جس کے پیچھے جانا تھا مجھے؟ اور تم اتنا غصہ کیوں کر رہی ہو؟“ معصومیت کے تمام ریکارڈ توڑتے زارون نے آنکھیں جھپکائیں تو نور نے خونخوار نظروں سے اُسے گھورتے پاؤں پٹختے ایک خالی ٹیبل کا رخ کیا۔

”ہونہہ بہت نک چڑھی ہے یہ لڑکی،“ ایک نظر وہاں بیٹھے لوگوں پہ ڈالتے وہ منہ میں بڑ بڑا یا اور اُس ٹیبل کی جانب بڑھا جہاں ابھی ابھی نور نے جا کر اپنا بیگ پٹھا تھا۔



”سر آپ کا کام تو میں نے آج ہی کر دینا تھا پر وہ زارون کسی سائے کی طرح نور کے ساتھ ہے،“ خدیجہ نے زین کے فون ریسیوکرتے ہی اُسے زارون کے یونیورسٹی آنے کے بارے میں بتاتے باقی بھی تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔

”ہم مطلب آج بھی نور میرے ہاتھ نہیں آئے گی اور یہ زارون ساتھ کیوں آیا ہے تم نے پوچھا نہیں؟“ خدیجہ کی تمام بات سننے کے بعد زین نے پوچھا۔

”نہیں سر مجھے لگتا ہے زارون کوشک ہو گیا ہے تب ہی وہ اُس کے ساتھ یہاں آیا ہے“، لا بھریری کی وجہ سے آواز پنجی رکھتے اُس نے ریک سے ایک کتاب اٹھاتے اُس نے اندازہ لگایا اور سامنے ٹیبل کی طرف دیکھا جہاں اب وہ دونوں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

”ہمم ٹھیک ہے، مجھے بھی یہی لگ رہا ہے اور زارون بہت شاطرانسان ہے اس لیے تم تھوڑی احتیاط کرنا تاکہ اُسے تم پر کسی قسم کا کوئی شک نہ ہو“، اُسے ہدایت دیتے زین نے اُسے مزید کچھ باتیں سمجھائیں اور پھر سے مختار ہنے کا کہہ کے کال بند کی۔

”اب میں دیکھتی ہوں یہ نور مجھ سے کیسے بچتی ہے“، موبائل کی اسکرین پر ہاتھ مارتے اُس نے اُسے آف کیا اور چہرے پر مسکراہٹ سجائتے اُس ٹیبل کی جانب بڑھی جہاں وہ دونوں بیٹھے تھے۔

”آؤ خدیجہ بیٹھو“، اُسے دیکھتے ہی نور نے زارون کو نظروں ہی نظروں میں خاموش رہنے کی التجاکی تو وہ کچھ بولتے بولتے رکا۔

”نہیں میں بیٹھنے نہیں آئی بس یہ تمہیں لیکھ رزدینے آئی تھی“، اپنارجسٹر اُس کی جانب بڑھاتے اُس کی نظریں زارون پر ہی تھیں جو سر جھکائے رجسٹر پر کچھ بنانے میں مصروف تھا۔

”شکریہ پر میں نے نمرہ سے لے لیے ہیں سب نوٹس، وہ یہاں لا بھریری میں ہی بیٹھی تھی تو میں نے اُس سے لے لیے“، نور نے بتانے کے ساتھ ہی وضاحت کی اور اصرار کرتے اُسے اپنے ساتھ والی چیئر پر بیٹھا لیا۔

”لاو میں بھی کچھ مدد کر دیتی ہوں، ویسے تم اتنے دن یونیورسٹی کیوں نہیں آئیں؟ طبیعت ٹھیک تھی؟“، خدیجہ نے اُس کے ساتھ بیٹھتے بڑی ہوشیاری سے اُسے گریدا۔

”ہاں بس پاؤں میں کانچ لگ گیا تھا، زخم کافی گھرا تھا تو چلانہیں جا رہا تھا مجھ سے اور کچھ مہماں بھی آئے ہیں اسی وجہ سے زیادہ چھٹیاں ہو گئیں“، نور نے زارون کی بات پر عمل کرتے خدیجہ سے بھی جھوٹ

بولا جیسے اُس نے اپنی چوٹ کے متعلق دی جان سے بولا تھا (کہ اُس کے پاؤں میں ٹوٹا ہوا کا نچ لگ گیا تھا جس کی وجہ سے پاؤں پر زخم ہوا اور بازو کا زخم تو ویسے ہی اُس کی آستین میں چھپ جاتا تھا تو اُس کے متعلق اُسے کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں پڑی)۔

”اچھا، خیال رکھا کرو یا راپنا اور دھیان سے کام کیا کرو“، خدیجہ نے اُس کی بات سننے ہی اپنے لہجے میں نرمی سموتے سمجھایا تو نور نے اثبات میں سر ہلایا اور رجسٹر میں سے ایک یکچھ زکار نکال کر اُس سے اُس کے متعلق پوچھنے لگی تو زارون نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”مجھے بتا دو کون کون سی چیزیں فوٹو کاپی کروانی ہیں میں جب تک کروالیتا ہوں“، ان دونوں کو مصروف دیکھ کر زارون نے کہا تو نور نے خدیجہ سے پوچھتے زارون کو کچھ نوٹس اور یکچھ زتمہائے تو وہ اُس سے شاپ کار استہ پوچھتے لاءہ بریری سے باہر نکل گیا۔

”سوری یا رزارون بس کبھی کبھی تھوڑا روڈبی ہیو کر جاتا ہے“، اُس کے جاتے ہی نور نے خدیجہ سے کہا جوتب سے اُسے نارمل طریقے سے سب سمجھا رہی تھی۔

”ہم خیر ہے، کوئی بات نہیں مجھے بُرانہیں لگا ویسے بھی تم نے جو کچھ مجھے اُس کے متعلق بتایا تھا مجھے امید بھی یہی تھی کہ وہ اسی قسم کی کوئی بات کرے گا“، خدیجہ نے اپنے غصے کو ضبط کرنے کے ساتھ ساتھ لہجے کو نارمل رکھتے نور کو شرمندگی سے نکالا جو بار بار زارون کی طرف سے اُس سے معذرت کر رہی تھی۔

سارا دن اُس کے نوٹس فوٹو کاپی کرواتے اور کچھ کتابیں ایشو کروانے میں شام کے پانچ نج کچے تھے تب ہی زارون نے بھوک کا احساس ہونے پر اُسے کینٹین چلنے کو کہا جو کافی دیر سے خدیجہ سے یکچھ زسمجھنے میں مصروف تھی۔

”ہاں، ٹھیک ہے چلتے ہیں مجھے بھی کافی بھوک لگی ہے“، اُس کی بات سننے ہی نور نے خدیجہ کو بھی پیشکش کی جو زارون کو کچھ خاص پسند نہیں آئی۔

”نہیں تم لوگ جاؤ میں بس گھر کے لیے نکلوں گی کافی ٹائم ہو گیا ہے“، کافی دیر سے وہ زارون کے سامنے اچھا بننے کا ناٹک کر کر کے تھک چکی تھی تب ہی اپنی گھٹری پر وقت دیکھتے اُس نے زارون کے کچھ کہنے سے پہلے ہی انکار کر دیا پر نور نے اُس کی کوئی بھی بات سنے بغیر اسے زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹا۔

”نور میں کہہ رہی ہوں ناجھے بھوک نہیں ہے تم لوگ جاؤ“، خدیجہ نے اپنے آگے چلتے شخص کے چہرے پر اکتا ہٹ دیکھ کر ایک بار پھر سے منع کیا تواب کی بار زارون نے رک کر ان دونوں کو دیکھا جو کافی دیر سے ایک ہی بات پر بحث کر رہی تھیں۔

”نور کیا مسئلہ ہے تمہیں؟ جب وہ کہہ رہی ہے کہ اُسے بھوک نہیں تو کیوں زبردستی کر رہی ہو؟“، ایک نظر خدیجہ کے چہرے کی طرف دیکھتے (جس پر میک اپ کی تہہ زارون کو کافی دیر سے کوفت میں مبتلا کر رہی تھی) اُس نے نور کو ٹوکا جو کافی دیر سے اُس کی میتیں کر رہی تھیں۔

”زارون پلیز تم پہلے ہی میری دوست کی کافی انسلٹ کر چکے ہو پر اب تم نے ایک لفظ بھی کہا تو میں برادشت نہیں کروں گی اس لیے اگر تمہیں کوئی مسئلہ ہے خدیجہ کے آنے پر تو تم اکیلے ہی چلے جاؤ“، زارون کی بات سنتے ہی خدیجہ کے چہرے کا بدلتارنگ دیکھ کر نور نے غصے سے کہا اور خدیجہ کا ہاتھ پکڑتے اُس کے انکار کرنے کے باوجود بھی زارون کو وہیں کھڑا چھوڑ کر آگے نکل گئی۔

”اس لڑکی کا کوئی تو علاج کرنا پڑے گا مجھے“، ان دونوں کو سامنے کینٹیں میں داخل ہوتا دیکھ کر زارون نے سوچا اور نور کی حرکت پر غصے سے لال ہوتے وہیں لان میں موجود چیز پر بیٹھ کر اُس کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔



سلیم صاحب کے سمجھا نے پر جنید آج کمرے سے باہر آیا تو خالدہ بیگم نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

”شکر ہے اللہ کا کہ تمہیں ہم پر ترس آیا“، خالدہ بیگم نے اُسے دیکھتے ہی کہا اور انٹھ کر اُس کے

قریب آئیں جو کچھ دنوں میں کافی کمزور ہو گیا تھا۔

”طبعیت ٹھیک ہے؟“ اُسے خاموشی سے اپنی طرف دیکھتا پا کر خالدہ بیگم نے آہستگی سے اُس کی پیشانی سے بال ہٹائے۔

”جی ٹھیک ہوں بس سر میں درد ہے چائے بنادیں،“ آگے بڑھ کر صوف پر بیٹھتے اُس نے کہا تو خالدہ بیگم پانچ منٹ میں بنا کر لانے کا کہتے جلدی سے کچن کی جانب بڑھیں اور وہ وہیں بیٹھ کر لاونچ میں پڑی چیزوں کو دیکھنے لگا جو ملائکہ نے اپنے ہاتھوں سے سیٹ کی تھیں۔

”پتا نہیں تمہیں کیا جلدی تھی مجھ سے دور ہونے کی،“ سائیڈ ٹیبل پر پڑے چھوٹے گلدان کو انھاتے (جو ملائکہ نے خاص لاونچ میں رکھنے کے لیے ضد کر کے لیا تھا) جنید نے خود کلامی کی اور احتیاط سے اُسے واپس رکھتے سلیم صاحب کے آنے پر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

”السلام علیکم بھائی آج تو تم نے دل خوش کر دیا ہے میرا،“ جنید کو دیکھتے ہی سلیم صاحب نے بغل گیر ہوتے خوشی سے کہا تو وہ بھی با مشکل مسکرا یا۔

”جی بس سوچا کہ خود کو سن بھال لوں اب تاکہ آپ لوگوں کو مزید پریشانی نہ ہو،“ الگ ہوتے اُس نے نرمی سے جواب دیا اور ان کے اشارہ کرنے پر ان کے ساتھ ہی صوف پر بیٹھ گیا۔

”اچھا کیا ویسے بھی قسمت کے لکھے کو کوئی ٹال نہیں سکتا، ملائکہ کی زندگی اتنی ہی تھی جو وہ بہت اچھے سے گزار گئی اب تم بھی خود کو سن بھالو کیوں کہ اُس کی روح تمہیں اس طرح دیکھ کر بے چین ہو گی اس لیے اگر تم چاہتے ہو کہ وہ پر سکون ہو تو زندگی میں آگے بڑھو کیوں کہ زندگی بڑھنے کا نام ہے اور موت بھی ایک حقیقت ہے۔ آج نہیں تو کل ہم سب کو اس کا سامنے کرنا ہی ہے اور خود سوچو اگر وہ زندہ رہتی تو کیا تم اُس کی تکلیف کو برداشت کر سکتے؟ یقیناً نہیں کیوں کہ جس طرح اُس کا پورا وجود جھلساتھا اُس کے لیے زندگی کا ایک ایک پل اذیت بن جانا تھا،“ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے سلیم صاحب نے ہمیشہ کی طرح

اُسے بہت نرمی اور پیار سے سمجھایا۔

”جی، میں جانتا ہوں پروہ اتنی جلدی مجھ سے دور ہو جائے گی اور اس طرح سے کہ اپنی واپسی کی کوئی امید تک میری زندگی میں نہیں چھوڑے گی، مجھے صبر نہیں آتا حالانکہ میں نے اللہ سے بہت دعا کی ہے پر ابو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ابھی بھی ملائکہ تکلیف میں ہو؟ وہ روز میرے خواب میں آتی ہے مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے جیسے اُسے کوئی پریشانی ہو؟“ جنید نے ان کا ہاتھ پکڑتے کسی بچے کی مانند انہیں اپنی الجھن سے آگاہ کیا۔

”تب ہی کہتا ہوں کہ خود کو سنبھالو تو اس کی روح کو سکون ہو، وہ تمہاری وجہ سے ہی بے چین ہو گی جو بار بار ایسے تمہارے خواب میں آتی ہے۔“

”پتا نہیں پر مجھے لگتا ہے وہ مجھے کچھ بتانا چاہتی ہے پر کہہ نہیں پاتی،“ سلیم صاحب کی بات سنتے ہی جنید نے نفی میں سر ہلا�ا تو خالدہ بیگم ٹرے اٹھائے لاونج میں داخل ہوئیں۔

”یہ لو تمہاری چائے اور یہ کتاب تمہیں پسند ہیں نا،“ ٹرے سے چائے کا کپ نکال کر پہلے جنید اور پھر سلیم صاحب کے سامنے رکھتے خالدہ بیگم نے کتاب ایک پلیٹ میں رکھتے جنید کو تھما۔

”میرا دل نہیں ہے اور امی یہ آپ کے ہاتھ پہ کیا ہوا ہے؟“ جنید نے پلیٹ واپس ٹیبل پر رکھتے ان کے باٹیں ہاتھ کی جانب اشارہ کیا۔

”کچھ نہیں شاید کسی چیز نے کاٹا ہے،“ اپنا ہاتھ پیچھے کرتے انہوں نے خوب بھی ایک نظر اسے دیکھا جو کافی دن سے درد کر رہا تھا پروہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھیں کہ اُس پر ہوا کیا ہے؟

”نہیں مجھے تو یہ کوئی زخم لگ رہا ہے،“ پریشانی سے ان کا ہاتھ تھامے جنید نے کہا تو سلیم صاحب بھی ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

”ہاں میں بھی کافی دنوں سے اسے کہہ رہا ہوں پر یہ کسی کی سننی کہاں ہے؟“

”ہاں، بس ہو جائیں شروع و یسے بھی آپ کو تو موقع چاہیے مجھے بتائیں سنانے کا“، اُن کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹوکتے خالدہ بیگم نے جنید سے اپنا ہاتھ چھڑوایا۔

”خود ہی ٹھیک ہو جائے گا تم فکرنا کرو اور سکون سے چائے پیو پہلے ہی سر میں درد ہے“، اُسے تسلی دیتے انہوں نے اپنا کپ اٹھایا اور اپنے اندر کے خوف کو چھپاتے سامنے سنگل صوفے پر جا بیٹھیں۔



گھروالپس آنے کے بعد بھی زارون کا موڈ کافی خراب تھا جو نور کے ساتھ ساتھ دی جان نے بھی محسوس کیا۔

”کیا ہوا ہے؟ ایسے ہر چیز کو گھور کیوں رہے ہو؟ کھانا نہیں کھانا کیا؟“، اُسے مسلسل پلیٹ میں چمچہ گھوماتا دیکھ کر دی جان سے رہا نہیں گیا تب ہی انہوں نے سوال کیا۔

”کھار ہا ہوں“، زارون نے انہیں شک پڑنے کے ڈر سے جلدی سے چمچہ بھر کے منہ میں رکھا۔  
”یتم دونوں کو کیا ہوا ہے آج؟ لڑکے آئے ہو کیا؟“، زارون کے نظریں چرانے اور نور کی مسلسل خاموشی پر دی جان کو کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔

”نہیں، ہم نے کیوں لڑنا تھا اور ہم تو کبھی بھی نہیں لڑے، کیوں نور میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“، اُس کے جواب دینے سے پہلے ہی زارون نے بات سن بھالی۔

”ہونہہ تو بہ کتنا چالاک ہے“، اثبات میں سر ہلاتے نور نے اُسے گھورا جو اسے اشارے سے دی جان کو کچھ بھی بتانے سے منع کر رہا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے بس میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تم دونوں ہمیشہ خوش رہو“، نور کا جواب سنتے ہی انہیں کچھ تسلی ہوتی کہ سب ٹھیک ہے تب ہی انہوں نے زارون سے نور کے پیپر ختم ہوتے ہی اُسے اپنے ساتھ گاؤں لے جانے کی بات کی۔

”پر دی جان آپ نور کو وہاں کیوں لے کے جائیں گی؟ اور وہاں سب سے کیا کہیں گی کہ یہ کون ہے؟“ ان کی بات سنتے ہی چاول زارون کے گلے سے جا لگے تب ہی کھانستے ہوئے اُس نے دو گھونٹ پانی کے پیتے خود کو پر سکون کرتے دی جان سے پوچھا۔

”چاہتی تو میں یہ تھی کہ نور کے گھروالوں کو خود جا کر منالوں اور ان کے گھر سے ہی تمام برادری کے ساتھ باعزت طریقے سے رخصت کروا کے ہو یا لے کر جاؤں پر نور کی باتیں سننے کے بعد مجھے ان کا منانا بہت مشکل لگ رہا ہے پر پھر بھی میں اپنی طرف سے ایک کوشش ضرور کروں گی کہ وہ مان جائیں اور اپنی دعاوں میں اسے تمہارے ساتھ رخصت کریں پر اگر وہ پھر بھی نہیں مانتے تو میں نور کو اپنے ساتھ سائیں فاروق (ساجدہ بیگم کے بھائی) کی ہو یا لے جاؤں گی اور وہیں سے کچھ باعتماد لوگوں کی موجودگی میں اسے اپنی ہو یا لے کر جاؤں گی تاکہ ہماری عزت بھی رہ جائے اور تمہیں یا نور کو بھی زندگی میں کبھی کوئی یہ طعنہ نہ دے کہ تم لوگوں نے خود سے شادی کی، دی جان نے بڑی نرمی سے اُس کو ساری بات سمجھائی جس پر زارون نے اثبات میں سر ہلاتے نور کی طرف دیکھا جو ایک نفرت بھری نگاہ زارون کے چہرے پر ڈالتے (جس نے دی جان کو زبردستی نکاح کے بارے میں نہ بتا کر نور کو بھی اس جرم میں برابر کا شریک ٹھہرایا تھا) اُس نے خود کو ساکہ کیوں اُس نے زارون کی بات مانتے دی جان کو اُس کی اصلیت نہیں بتائی کہ کیسے اُس نے زبردستی اُس کے ساتھ نکاح کیا اور پھر کیسے اسے اُس کے گھروالوں کی نظروں میں گرا یا۔

”میں تھک گئی ہوں بس کچھ دیر آرام کروں گی“، مزید وہاں رکنا نور کو ناممکن لگا تب ہی رشیدہ کو برتن اٹھانے کا کہتے وہ اپنے کمرے میں چل گئی۔

”لگتا ہے نور کو میری بات پسند نہیں آئی“، اُس کے اس طرح جانے پر دی جان نے کہا تو زارون نے انہیں تسلی دی اور بیل کی آواز پر اٹھ کر دروازہ کھولنے چلا گیا جہاں عالیان نے اسے دیکھتے ہی منہ

پھیر لیا۔

”اگر منہ ہی پھیرنا تھا تو آنے کی کیا ضرورت تھی؟“ (عالیان اُس دن ہسپتال میں ہونے والی بدکلامی پر ابھی تک ناراض تھا اُس وقت تو زارون کو تکلیف میں دیکھ کروہ خاموشی سے اُس کے ساتھ رہا پر نور کے ٹھیک ہوتے ہی اُس نے زارون سے ہر طرح کی بول چال بند کر دی حتیٰ کہ زارون نے اُسے منانے کی کافی کوشش کی پر وہ آفس میں بھی بس مطلب کی بات کرتا اور اپنے اپارٹمنٹ سے بھی وہ ایک دوست کی طرف شفت ہو گیا تھا تاکہ زارون کو اُسے منانے کا کسی قسم کا کوئی موقع نہ ملے) زارون نے اُسے دیکھتے ہی اپنی مسکراہٹ چھپاتے خفگی سے طعنہ مارا۔

”میں تم سے ملنے نہیں آیا اس لیے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں،“ اُسے دروازے سے ہٹاتے عالیان نے اپنی ناراضی برقرار رکھتے سامنے بیٹھی دی جان کا رخ کیا تو زارون بھی دروازہ بند کرتے اُس کے پیچھے آیا۔

”کیسے ہو بیٹا؟ اور اپنی دی جان سے ناراض تھے کیا؟ جو اتنے دنوں بعد ملنے آئے ہو،“ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے دی جان نے شکوہ کیا تو عالیان نے زارون کو اگنور کرتے اُن کے ساتھ والی چیسر پیچھے کر کے اُن کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”میں بھلا آپ کو بھول سکتا ہوں؟ اور مجھے آج ہی پتا چلا کہ آپ آئی ہوئی ہیں تو دیکھیں میں آج ہی ملنے آگیا،“

”پر میں تو کافی دن سے زارون سے پوچھ رہی ہوں کہ عالیان کو نہیں بتایا میرے آنے کا؟ تو اس نے کہا کہ بتایا ہے پر وہ مصروف ہے نہیں آسکتا،“ دی جان نے ایک نظر اُس کے چہرے پر ڈالتے عالیان کو بتایا جو آج زارون کی کھچائی کروانے کا پکا ارادہ کر کے آیا تھا، دی جان کے موقع دیتے ہی شروع ہو گیا۔

”میں مصروف نہیں تھا دی جان بلکہ آپ کے پوتے کا دماغ آج کل کافی خراب ہے مجھے تو یہ انسان ہی نہیں سمجھتا جب چاہے جہاں چاہے بے عزت کر دیتا ہے حالانکہ بعض دفعہ تو مجھے خبر بھی نہیں ہوتی کہ یہ مجھے پہ غصہ نکال کیوں رہا ہے“، زارون کے آنکھیں نکالنے کے باوجود بھی عالیان نے اپنی بات مکمل کر کے ہی سانس لیا۔

”زارون یہ میں کیا سن رہی ہوں؟“ اسے پرنسر کو گود میں اٹھا تادکیکھ کر دی جان نے تصدیق چاہی۔

”دی جان یہ انسان تو پیدا ہی میری برائیاں کرنے کے لیے ہوا ہے آپ کو یاد ہے نا ایک بار پہلے بھی اس نے آپ سے میری شکایت کی تھی جو بعد میں جھوٹی ثابت ہو گئی اور پھر الٹا آپ کو شرمندگی ہوئی تھی کہ آپ نے مجھے کیوں ڈانتا“، بڑی چالاکی کے ساتھ زارون نے دی جان کو اپنی سائیڈ پر کیا جو اس کی تمام تیزی بڑے اچھے سے سمجھتی تھیں۔

”دی جان یہ جھوٹ بول رہا ہے اُس وقت بھی میں نے آپ کو سچ بتایا تھا اور اب بھی“، عالیان نے کہنے کے ساتھ ہی بریانی پلیٹ میں نکالی جو روشنیدہ اٹھانے لگی تھی۔

”اُف کیا تم لوگ بچوں کی طرح لٹر رہے ہو، بس کرو اب اور زارون سوری بولو عالیان کو، مجھے پتا ہے تم نے ضرور بد تیزی کی ہو گئی“، دی جان نے اُن کی بڑھتی ہوئی بحث کو ختم کرنے کے لیے زارون سے کہا جو سوری کے نام پر ہونقوں کے طرح منہ کھولے دی جان کو دیکھنے لگا۔

”میں اس سے سوری بولوں؟ اس بند رنما انسان سے؟“ اسے بریانی کے ساتھ انصاف کرتا دکیکھ کر زارون نے دی جان کا لحاظ کیے بغیر ہی پلیٹ اُس کے آگے سے اپنی طرف سر کا۔

”دی جان دکیکھ لیں یہ مجھے بند رکھ رہا ہے“، عالیان نے پلیٹ والپس اپنی طرف کرتے شکایت کی تو دی جان نے سر پکڑے اُن دونوں کو ان کے حال پر چھوڑتے اپنی چھڑی اٹھاتے کمرے کا رخ کیا۔

کچھ دیر بحث کرنے کے بعد زارون نے سیریس ہوتے عالیان سے اپنے رویے کی معافی مانگی تو اُس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے اُسے معاف کر دیا۔

”اس بارتو میں نے معاف کر دیا ہے پر اگلی بار تم نے ایسا کیا تو میں معاف نہیں کروں گا“، اُس کی معذرت قبول کرنے کے ساتھ ہی عالیان نے شرط رکھی تو زارون نے تابعداری سے سرجھ کایا۔

”ٹھیک ہے نہ کرنا ویسے بھی مجھے تم جیسے فضول انسان کو بار بار منانے کا کوئی شوق بھی نہیں ہے“، ایک بار پھر سے اُس نے آنکھوں میں شرارت لیے کہا تو عالیان کا تیسرا بارٹرے کی طرف بڑھتا ہاتھ رکھ کا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور دوبارہ مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں“، اُس نے غصے سے کہتے ہوئے میں موجود تمام بریانی اپنی پلیٹ میں نکالی تو زارون نے قہقہہ لگاتے پھر سے سوری بولا۔

”دفع ہوا اور دوبارہ کوئی کام ہو تو مجھ سے مت کہنا“، چچہ بھر کے منہ میں رکھتے عالیان نے اُس کے کان پکڑنے پر اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

”ہونہہ میں کسی اور سے کیوں کہوں تم میرے مینجر ہو اس لیے میرے تمام کام کرنا تم پر فرض ہے“، اُس کی بات سنتے ہی زارون نے اپنی ہی دھن میں جواب دیا۔

”میں مینجر کے ساتھ تمہارا دوست بھی ہوں جس کے بارے میں تم اکثر ہی بھول جاتے ہو تب ہی مجھے بھی تم انھی نوکروں کی طرح ٹریٹ کرتے ہو جو تمہارے انڈر کام کر رہے ہیں“، سنجیدگی سے کہتے وہ زارون کی مسکراہٹ غائب کر چکا تھا۔

”شرم کرو آج تک میں نے تمہیں کبھی اپنا نوکریا ملازم نہیں سمجھا ہمیشہ دوست سمجھ کر حق کے ساتھ ہر بات کہہ لیتا ہوں پر لگتا ہے میں غلط کرتا ہوں“، اُس کی بات سنتے ہی زارون نے افسردگی سے سرجھ کا۔

”غلط نہیں کرتے پر تمہارا طریقہ غلط ہوتا ہے“، رشیدہ کو برتن اٹھانے کا کہتے عالیان نے اُسے اُس

کی غلطی کا احساس دلایا۔

”اوے میں آئندہ خیال رکھوں گا اور مجھے نہیں پتا کہ ہم دونوں کی دوستی اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ ایک معمولی سے بات پر یوں بکھر جائے گی“، عالیان کی باتوں سے زیادہ زارون کو اُس کے روکھے پھیکے اور طنز بھرے لبھنے نے ہرٹ کیا تب ہی اُس نے مزید بات بڑھانے کے بجائے پھر سے معذرت کی اور بات بدلتے اُس سے احمد کی شادی کے متعلق پوچھنے لگا جو ایک ہفتے بعد تھی۔

☆☆☆

”سارہ میں تمہیں کب سے سمجھا رہی ہوں کہ ہر معاملے میں جلد بازی سے کام مت لیا کرو اور ہمیشہ ٹھیک وقت کا انتظار کیا کروتا کہ فیصلہ تمہارے حق میں ہو“، فریحہ بیگم جو بچھلے دو گھنٹے سے اُسے خصتی کے لیے رضامند کرنے میں لگی تھیں آخر تھک ہار کر غصے سے بولیں۔

”کون سا وقت اور کون سا فیصلہ؟ امی میں آپ کو بتا رہی ہوں میں اُس حارت سے کبھی بھی شادی نہیں کروں گی کیوں کہ میں عمر کو نہیں چھوڑ سکتی“، نکاح تو میں نے آپ کی ضد اور جائیداد کی خاطر کر لیا پر اب یہ خصتی، سوری مجھ سے اب یہ ڈرامہ اور نہیں ہو گا“، اُن کی بات سنتے ہی سارہ نے چیختنے ہوئے کہا تو فریحہ بیگم نے جلدی سے اٹھ کر اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھا۔

”آہستہ بولو، کوئی سُن لے گا اور ہمارا بنا بنا یا کھیل تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے چند سینکنڈز میں خراب ہو جائے گا“، اُسے آنکھیں دکھاتے فریحہ بیگم نے ایک نظر لاوٹخ میں نظر دوڑاتے کمرے کا دروازہ بند کیا۔

”امی میں آپ کو بتا رہی ہوں اگر آپ نے اس معاملے میں میرے ساتھ زبردستی کی تو میں وہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا اور آپ تو کہہ رہی تھیں کہ ہم یہ سب کچھ ملتے ہی یہاں سے نکل جائیں گے اور آپ حارت سے میری طلاق بھی کروادیں گی تو اب یہ سب کیا ہے؟“

”اُف یہاں آؤ سکون سے بیٹھو پھر میں تمہیں ساری بات سمجھاتی ہوں،“ سارہ کے غصے کو دیکھتے فریحہ بیگم نے اپنے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے کہا اور اس کا بازو پکڑتے صوفے پر بٹھایا۔

”جی بولیں اب کیا سازش سوچ رکھی ہے آپ نے میری زندگی بر باد کرنے کی؟“ ان کی آنکھوں میں دیکھتے سارہ نے طنز کیا تو فریحہ بیگم نے بیٹی کی طرف افسوس سے دیکھا جس کے لیے وہ یہ سب کچھ کر رہی تھیں۔

”میں یہ سازشیں تمہاری زندگی کی آسانی کے لیے کر رہی ہوں ورنہ اس میں میرا کوئی فائدہ نہیں اور رہی بات اس جائیداد کی تو مجھے کیا پتا تھا کہ یہ بڑھا اس بار بھی بازی لے جائے گا۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہے پر بھائی صاحب کا دماغ ہم سے کہیں زیادہ شااطر نکلا،“ دانت پیستے ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سکندر صاحب کا گلاد بادیتیں۔

”توا ب؟ آپ کچھ سوچیں اور اس حارث سے میری جان چھڑروا میں کیوں کہ میں اب عمر کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرو سکتی،“ ان کی بات سنتے ہی سارہ نے لاپرواںی سے کندھے اچکائے۔

”میں کیا کر سکتی ہوں تمام حالات تمہارے سامنے ہیں باقی اگر نور کا معاملہ درمیان میں نہ آتا تب بھی تو تمہاری خصتی ہونی ہی تھی ناتب تو تمہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا پر اب یہ عمر بیچ میں کہاں سے آگیا،“۔

”وہ نہیں بلکہ حارث آیا ہے ہمارے درمیان اور پہلے عمر نے اس طرح کی مجھے کوئی آس نہیں دلائی تھی اور نہ ہی میں نے اتنی توجہ دی حارث کے رویے پر، یہ ہر وقت کی نور نور کی گردان نے میرا دل بے زار کر دیا ہے۔ میں ایسے انسان کے ساتھ بالکل بھی زندگی نہیں گزار سکتی جو مجھ سے زیادہ اپنی بہن کو توجہ دے اور بہن بھی ایسی جس کے بد کرداری کے قصے ہر طرف مشہور ہوں،“۔

”بس کرو کیا ہو گیا ہے تمہیں، اگر پہلے مان گئیں تو اب بھی کچھ دن کے لیے ہی سہی پر یہ ڈرامہ تمہیں کرنا پڑے گا کیوں کہ اب میں منزل کے اتنے قریب جا کرو اپس نہیں آؤ گی اور نہ ہی تمہیں یوں

خالی ہاتھ واپس آنے دوں گی اور رہی بات بھائی صاحب کی؟ میں نے اُن کے دماغ میں اُن کی اولاد کے خلاف اتنا زہر بھردیا ہے کہ وہ کبھی چاہ کر بھی اُن کے قریب نہیں ہو سکیں گے، ہمسکراتے ہوئے انہوں نے زہر اُگلا تو سکندر صاحب (جو سارہ کوشان پنگ کے لیے کچھ رقم دینے آئے تھے) کے پاؤں وہیں زمین پر جم گئے۔

”افف امی مجھے نہیں پتا آپ کیا چاہتی ہیں پر میرا مشورہ ہے آپ ما موں کو زہر دے دیں تاکہ اُن کا پتہ تو صاف ہو اور جو کچھ انہوں نے ہمارے نام کیا ہے کم از کم وہ تو ہمیں مل جائے اور باقی رہی حارت کی بات وہ تو بہن کے غم میں ویسے ہی آدھا پاگل ہو چکا ہے“، سارہ نے تیوری چڑھاتے کہا تو فریجہ بیگم نے اُس کی بات پر قہقہہ لگاتے اُسے اپنے ساتھ لگایا اور آنے والے وقت کے لیے صبر کرنے کی تلقین کرتے جلد ہی سکندر صاحب اور حارت کا کوئی پکا انتظام کرنے کا وعدہ کرتے اُسے تسلی دی۔

فریجہ بیگم اور سارہ کی باتیں سننے کے بعد سکندر صاحب نے دیوار کا سہارا لیتے اپنے کمرے میں جانا چاہا مگر اپنی بہن اور بھانجی کے اس قدر زہر لیے الفاظ نے انہیں چند قدم چلنے کے بعد تھکا دیا تب ہی سہارا لے کر وہیں موجود چیسر پر بیٹھتے انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا اور آنکھیں بند کرتے خود کو پر سکون کرنے کی کوشش کی۔ پر پچھلے گزرے ہوئے پل ایک فلم کی طرح اُن کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگے اپنی ایک ایک زیادتی اور ہمیشہ اپنی اولاد کو پیچھے چھوڑ کر فریجہ بیگم اور سارہ کو ترجیح دینے کا انجام اتنے بھیانک طریقے سے اُن کے سامنے آیا کہ آج انہیں خود کو سنپھالنا مشکل لگاتا ہی سینے میں اٹھتی تیز درد کی لہر پر انہوں نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولتے گھر میں داخل ہوتے حاشر کو آواز دی جو انہیں چیسر پر ایک طرف لڑکھڑاتا دیکھ کر جلدی سے اُن کی جانب بڑھا۔



نور کا دل آج صحیح سے ہی گھبرا رہا تھا اور پر سے زارون بھی اُس دن یونیورسٹی سے آنے کے بعد سے

اُس سے بات نہیں کر رہا تھا اور دی جان بھی آج ہی دو دن کے لیے رشیدہ کو ساتھ لیے اپنے ایک رشتے دار کے ہاں گئی تھیں تب ہی وہ گھر پر اکیلی کل ہونے والے پیپر کی تیاری کرنے کی کوشش میں لگی تھی پر بار بار دروازے کی جانب دیکھتے ایک خوف کی لہر اُس کے اندر سراستہ کر رہی تھی جسے اچھی طرح بند کرنے کے بعد پیرونسی دروازہ بھی اندر سے لاک کر لیا اور اپنا موبائل اٹھاتے زارون کا نمبر ڈائیل کیا جو ایک ضروری کام کا بول کر گھر سے نکلا تھا۔

”کال کاٹ دی؟“ موبائل کان سے ہٹاتے نور نے اسکرین کو گھورا اور ایک بار پھر سے اُس کا نمبر ڈائیل کیا۔

”ٹھیک ہے بھاڑ میں جاؤ تم“، پھر سے کال کا ٹنے پر نور نے غصے سے موبائل اٹھا کر دیوار پہ مارا جس کی اسکرین کرچی کرچی ہو کر زمین پر بکھر گئی۔

”پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے اُس دن بھی مجھے ایسے ہی اکیلا چھوڑ کر گیا تھا اور آج بھی“، آنکھوں میں نمی لیے اُس نے سرگھنٹوں پر رکھتے خوف سے دروازے کی طرف دیکھا جس میں ابھی ابھی کسی نے چابی لگاتے ناب کو گھماتے کھولنے کی کوشش کی تھی۔

”نور دروازہ کھولو“، زارون نے اندر سے دروازے کو لاک دیکھ کر اُس پر ہاتھ مارتے پریشانی سے آواز لگائی تو اُس کی آواز سنتے ہی نور کی جان میں جان آئی۔

”کہاں تھے تم میں کب سے کال کر رہی ہوں“، ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑتے اُس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

”میں یہیں تھا پر تم نے دروازہ کیوں لاک کیا تھا؟“، اُس کی بات کا مختصر جواب دیتے زارون نے فکر مندی سے پوچھا۔

”مجھے ڈر لگ رہا تھا اس لیے لاک کیا تھا“، جواب دیتے اُس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے کچن

کارخ کیا تو زارون بھی دروازہ لاک کرتے اُس کے پچھے آیا۔

”کس بات کا ڈر؟ اور میں نے پہلے بھی تم سے کہا ہے کہ یہ ڈراپنے دل و دماغ سے نکال دو کیوں کہ میرے ہوتے ہوئے اب کوئی بھی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا“، اُس کے کانپتے ہاتھوں اور ماتھے پر پسینہ دیکھ کر زارون کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ وہ کیوں ایسے اُسے پھر سے اکیلا چھوڑ کر گیا۔

”میں ٹھیک ہوں اور تم نے اتنی دیر کیوں لگادی تم نے تو کہا تھا کہ ایک گھنٹے میں آ جاؤں گا“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے پانی کے دو گھونٹ پی اور اب غصے سے اُسے گھورتے پوچھنے لگی جو اپنے موبائل پر آنے والی کال پر اُسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے پانچ منٹ میں آنے کا بولتے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”ہونہہ پتا نہیں کس سہیلی کا فون تھا جو میرے سامنے نہیں سُن سکتا تھا“، اُس کے جاتے ہی نور نے خود کلامی کی اور مغرب کی اذان کی آواز پر زارون کی بعد میں خبر لینے کا سوچتے نماز پڑھنے کے لیے کمرے کا رخ کیا۔



حاشرا اور فریجہ بیگم سکندر صاحب کو لے کر ہسپتال پہنچ تو ڈاکٹر نے سیر لیں ہارت اٹیک کا بتاتے دعا کرنے کا کہا۔

”اللہ یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا بھائی صاحب کو، میں ابھی تو چائے دے کر آئی تھی تب تو بالکل ٹھیک تھے“، ڈاکٹر کے جاتے ہی فریجہ بیگم نے آنسو بہاتے حاشرا کو بتایا جو انھیں تسلی دیتے خود کو سنبھالنے کا کہتے حارت کو کال کرنے لگا۔

”اللہ میری زندگی بھی میرے بھائی کو لگادے“، ہاتھ اٹھائے وہ مسلسل روئے کے ساتھ دعائیں مانگ رہی تھیں۔

”پھوپھو پلیز حوصلہ کریں اور بس دعا کریں ان شاء اللہ ابو ٹھیک ہو جائیں گے“، حارث کو بتانے کے بعد حاشر نے انہیں روتا دیکھ کر اپنے ساتھ لگایا تو وہ اور زور سے رو نے لگیں۔

”کیسے حوصلہ کروں؟ میرا تو ہر رشتہ بھائی صاحب کے ساتھ جڑا ہے اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں بھی مر جاؤں گی“، سر اٹھاتے انہوں نے چادر منہ پر رکھتے آنسوؤں کے درمیان اپنی بات مکمل کی تو حاشر نے انہیں سکندر صاحب کے ٹھیک ہونے کا دلا سادیتے خود بھی ضبط کرتے آنسوؤں کو آنکھوں سے نکلنے سے روکا۔



نماز پڑھنے کے بعد نور نے کھانا لگایا اور زاروں کو بلانے اُس کے کمرے کی جانب بڑھی جو تب سے موبائل پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے بس تمہیں میں نے جیسا سمجھایا ہے ویسا کرو اور خبر ملتے ہی مجھے انفارم کرنا“، راحیل سے کہتے اُس نے نور کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر پھر بات کرنے کا بول کر کال کاٹ دی۔

”کھانا لگا دیا ہے، آ جاؤ“، اُس کے فوراً فون بند کرنے پر نور نے ایک شک بھری نظر اُس پر ڈالتے بتایا۔

”ٹھیک ہے میں بس دو منٹ میں منہ ہاتھ دھو کر آیا“، اُس کی بات سنتے ہی زاروں نے موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور واش روم کی جانب بڑھا تو نور نے بھی باہر کا رخ کیا اور چیئر پر بیٹھتے اُس کا انتظار کرنے لگی جو ٹھیک دو منٹ بعد وہاں موجود تھا۔

”کیا بنایا ہے آج؟“، چیئر پیچھے کر کے بیٹھتے ہی اُس نے نور سے پوچھا جس نے جواب دینے کے باجائے خاموشی سے ڈش اٹھا کر اُس کے سامنے رکھی۔

”ناراض ہو؟“، ڈھلن اٹھا کر اس میں موجود آلوگو بھی کاسالن دیکھ کر ماتھے پر بل ڈالتے اس نے ڈھلن واپس رکھا۔

”نہیں، مجھے کیا ضرورت پڑی ہے ناراض ہونے کی وہ بھی تم جیسے فضول انسان سے،“ کندھے اچکاتے نور نے لاپروائی سے کہا اور سالن اپنی پلیٹ میں نکالا۔

”ہم او کے،“ اس کے حقارت بھرے لبھ پر زارون نے ایک گہری سانس لیتے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالتے اپنی چیز پیچھے کی اور انٹھ کر کمرے کی جانب بڑھا۔

”کیا ہوا؟ کھانا نہیں کھانا؟“ نور نے اس طرح جاتا دیکھ کرنا سمجھی سے پوچھا۔

”نہیں، بھوک نہیں ہے تم کھاؤ،“ پلٹے بنائی جواب دیتے وہ کمرے میں چلا گیا تو نور نے اپنی بات پر غور کیا۔

”اُفف مجھے بھی کیا ضرورت تھی ایسی بات کرنے کی،“ ہاتھ میں پکڑی روٹی پلیٹ میں رکھتے اس نے خود کلامی کی اور کچھ دیر خود کو پر سکون کرنے کے بعد اس نے ہمت کرتے کمرے کا رخ کیا تاکہ زارون کو سوری بول سکے۔



سکندر صاحب کا سنتے ہی حارث آفس سے حاشر کے بتائے ہوئے ہسپتال پہنچا تو وہاں فریحہ بیگم اور حاشر پریشان کن حالت میں آئی سی یو کے باہر موجود تھے۔

”کیا ہوا ابو کو؟ ابھی صح تو بالکل ٹھیک تھے،“ حارث نے آتے ہی فریحہ بیگم کو اگنور کرتے حاشر سے پوچھا جو اسے دیکھتے ہی اٹھ کر اس کے گلے لگ چکا تھا۔

”کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ مجھے؟“ حاشر کو یوں پریشان دیکھ کر کسی انہوںی کے پیش نظر حارث کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں آنے والے وسوسوں کو جھٹلاتا ایک بار پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”پتا نہیں کیا ہوا ہے ڈاکٹر کچھ نہیں بتا رہے بس بار بار دعا کا کہہ رہے ہیں“، اُس سے الگ ہوتے حاشر نے اپنے آپ کو سنبھالتے حارت کو بتایا جو اُس کی بات سنتے ہی آئی سی یو کی جانب بڑھا جہاں سے ابھی ابھی ایک ڈاکٹر باہر آیا تھا۔

”سر کسی طبیعت ہے اب ابو کی؟“، حارت نے فکر مندی سے پوچھا۔

”جی، وہ اب وہ خطرے سے باہر ہیں پر اٹیک کے ساتھ انہیں فانچ کا شدید جھٹکا لگا ہے جس کی وجہ سے اُن کی زبان اور بایاں حصہ بالکل کام کرنا چھوڑ چکا ہے“، ڈاکٹر نے سکندر صاحب کی زندگی کی امید کے ساتھ ساتھ جو خبر سنائی وہ حارت اور حاشر کے ساتھ ساتھ فریجہ بیگم کے لیے بھی پریشان کن تھی۔ ”سر کوئی علاج اور ایسا ایک دم سے کیسے ہو سکتا ہے؟“ سب سے پہلے حارت نے خود کو سنبھالتے ڈاکٹر سے سوال کیا۔

”جی علاج تو ہے پر جس حد تک اُن کا جسم متاثر ہوا ہے انہیں ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا وہ بھی تب جب آپ لوگ انہیں میڈیسین کے ساتھ ساتھ پر اپرورزش کروائیں گے“، ڈاکٹر نے بتانے کے ساتھ حارت کو مزید کچھ ہدایات دیں اور اپنے ساتھ ہی کمرے میں آنے کا کہا تاکہ سکندر صاحب کے بارے میں تفصیل سے بات کر سکے۔



”آ جاؤ“، دروازے پر دستک کی آواز پر زارون نے رخ پھیرے بناہی اجازت دی کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ گھر میں نور کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔

”narash ہو مجھ سے؟“ اُس کے قریب آتے نور نے اُسے چاند کی طرف دیکھتا پا کر ہچکپا تے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، میں تم سے کبھی بھی ناراض نہیں ہو سکتا“، چاند سے نظر ہٹا کر اُس نے نور کے چہرے کو

دیکھا جہاں اب اُسے اپنے لیے فکر نظر آنے لگی تھی۔

”تو پھر کھانا کیوں نہیں کھایا؟ اور ٹیبل سے ایسے اٹھ کر کیوں آئے ہو؟“ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتے نور نے پھر سے سوال کیا۔

”محبھے آلو گوبھی پسند نہیں“، بہت آہستگی سے کہتے اُس نے نور کو شرمندگی سے نکالا جو یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اُس کی بات کی وجہ سے اٹھ کر گیا ہے۔

”اچھا تو محبھے بتا دیتے میں کچھ اور بنادیتی“، اُس کی بات سنتے ہی نور کو کچھ تسلی ہوئی تب ہی اُس نے دوستانہ انداز میں اپنی بات مکمل کی۔

”کیا کیا بنا لیتی ہوتی؟“ اُس کے سرخ گالوں کو فوکس کرتے زارون نے بلا مقصد ہی سوال کیا۔

”سب کچھ ہی بنا لیتی ہوں بلکہ روز میں ہی کھانا بناتی ہوں تمہیں نہیں پتا کیا؟“ اُس کے سوال پر نور نے تجسس سے آنکھیں سکیریٹریں۔

”پتا ہے بس ویسے ہی تمہارے منہ سے سننا چاہتا تھا“، بلکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائتے اُس نے اپنی نظروں کا رخ پھر سے اپنے جوبن پر چمکتے چاند کی جانب کیا۔

”ہونہہ تم ہو، ہی بد تمیز بلکہ تم کھڑوں ہو اور دنیا میں بس مجھے تنگ کرنے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہو“، اُس کی بات پر منہ پھلاتے نور نے ایک نظر اُس کے چہرے پر ڈالی جو کچھ دنوں سے بالکل مر جھاسا گیا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟ تم کچھ پر بیشان ہو؟“ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آنے پر نور نے اُس کے سامنے آتے پوچھا جو کچھ دنوں سے اُسے بالکل اگنور کیے ہوئے تھا۔

”نہیں، کچھ نہیں ہوا، بس ویسے ہی سر میں تھوڑا درد ہے“، اُس کے چہرے پر آتی لٹوں کو دیکھتے (جو ٹیرس کے کھلے دروازے سے آنے والی ہوا پر مسلسل اُس کے چہرے پر جھوم رہی تھیں) زارون نے

نرمی سے انھیں اُس کے کان کے پیچھے کیا۔

”تو پھر ایسے چپ چپ کیوں ہو؟ پہلے تو تم میری ہربات کا جواب دیتے تھے۔ ہر وقت مجھ سے لڑنے کے لیے تیار رہتے تھے پر اب میں کچھ دنوں سے محسوس کر رہی ہوں تم ایسا نہیں کرتے۔ میں بات بھی کروں تو جواب نہیں دیتے، پہلے مجھے لگا شاید دی جان کی وجہ سے تم ایسا کر رہے ہو پر آج تو وہ بھی نہیں تھیں پھر بھی تمہارا رویہ میرے ساتھ ویسا ہی ہے“، نور جب سے آئی تھی آج پہلی بار اُس نے زارون سے اس قسم کا شکوہ کیا تھا تب ہی اُس نے اپنی ساری ناراضی بھلاتے اُسے اپنے حصار میں لیا۔  
”سوری میں دوبارہ ایسا نہیں کروں گا“، اُس کے کان کے قریب سرگوشی کرتے زارون نے اُس کے گال کو اپنے ہونٹوں سے چھوا تو نور نے آنکھیں بند کرتے اُس کے لمس کو محسوس کیا۔

”جان ہوتم میری اور میں ناراض نہیں تھا بس مجھے لگا کہ تمہیں میرا یوں بات کرنا، پاس آنا پسند نہیں اسی لیے میں دور ہوا“، ہونٹ اُس کے دوسرے گال سے مس کرتے زارون نے وضاحت دی تو نور نے فٹ سے آنکھیں کھولے اُسے دیکھا۔

”میں نے کب کہا کہ مجھے تمہارا بات کرنا برا لگتا ہے؟ اور پاس آنا؟ ہاں پہلے لگتا تھا پر اب نہیں کیوں کہ میں سمجھ چکی ہوں کہ اب میرے لیے تم ہی سب کچھ ہو۔ دی جان نے مجھے بتایا ہے کہ شوہر کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے“، اُس کی گردن میں بازو حائل کرتے نور نے اپنی بھوری آنکھوں سے اُس کی کالی آنکھوں میں جھاناکا جس میں آج کچھ الگ ہی چمک تھی۔

”ہاہاہا شکر ہے دی جان نے میرا کچھ فائدہ کیا ورنہ جب سے آئی ہیں ایسے پھرے لگائے بیٹھی ہیں جیسے میں کوئی جن ہوں جوان کی شہزادی پر جادو کر کے اُس کو اپنے قبضے میں کر لوں گا“، نور کے ڈھکے چھپے اقرار نے آج زارون کی تمام تھکاوٹیں اور خدشات دور کر دیے تھے تب ہی کھل کر مسکراتے اُس نے نور کے اوپر جھکنا چاہا جو اُس کا ارادہ بھاپنیتے ہی جلدی سے نیچے سے اُس کے حصار سے نکلتے دروازے کی

جانب بھاگی۔

”نور کو“، زارون نے آواز لگائی پر وہ اُس سے پہلے ہی دوسرے کمرے میں جاتے دروازہ لاک کر چکی تھی۔



خالدہ بیگم کا زخم دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہاتھ پہ پھیل چکا تھا اور حیران کن بات یہ تھی کہ اُس کے اندر اب چھوٹے چھوٹے کیڑے نمودار ہونے لگے جس کی نہ تو کسی ڈاکٹر کو سمجھ آ رہی تھی اور نہ ہی کسی دم والے کوتب ہی اتنی دوائیاں کھانے اور لگانے کے باوجود بھی جب زخم کم ہونے کے بجائے بازو کی طرف بڑھنے لگا تو ڈاکٹر نے سلیم صاحب کو خالدہ بیگم کا ہاتھ کٹوانے کا مشورہ دیا تاکہ زخم مزید پھیل کر اذیت کا باعث نہ بنے۔

”میں ہاتھ نہیں کٹواؤں گی اور ڈاکٹر کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا جو اتنی آسانی سے یہ بات کہہ دی جسے میرا ہاتھ نہ ہو کوئی چیز ہو جسے کاٹ دیا جائے؟“ خالدہ بیگم کے کانوں تک جیسے ہی یہ بات پہنچی انہوں نے غصے اور ڈر کے ملے جملے تاثرات سے چیختنے ہوئے ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ سلیم صاحب کو بھی کوسا جو بڑے پر سکون انداز میں اُن کو یہ بات بتا رہے تھے۔

”اُس کا دماغ خراب نہیں ہوا بلکہ تمہارا ہو گیا ہے جو بات سننے اور سمجھنے سے پہلے ہی واویلا مچانا شروع کر دیتی ہو، اُن کے قریب بیٹھتے سلیم صاحب نے اُن کے مسلسل بولنے سے تنگ آ کر بے زاری سے کہا۔

”ہاں ہاں میرا ہی دماغ خراب ہو گیا ہے جو آپ کے منہ لگ رہی ہوں اور میں آپ کو بتا رہی ہوں سلیم صاحب میں اُس جعلی دونبر ڈاکٹر کی باتوں میں آ کر اپنا ہاتھ بالکل بھی نہیں کٹواؤں گی چاہے جو مرضی ہو جائے،“ آنکھوں میں بے بسی اور تکلیف کے باعث آنے والے آنسوؤں کو دائیں ہاتھ سے

صاف کرتے وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں تو سلیم صاحب نے ان کی حالت دیکھ کر اللہ پاک سے رحم کی دعا کی۔



ایک ہفتے بعد ڈاکٹر ز نے سکندر صاحب کی حالت سنچلنے کے بعد انھیں ڈسچارج کیا تو حاشر اور حارث انھیں لے کر گھر پہنچے جہاں پر فریحہ بیگم اور سارہ انھی کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

”ماموں یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ سارہ جو اس دن سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے ایک بار بھی سکندر صاحب کو ہسپتال دیکھنے نہیں گئی تھی اُس نے انھیں وہیل چیز پر بے بسی کی تصویر بنے دیکھ کر چہرے پر تکلیف کے جھوٹے تاثرات سمجھاتے ان کے قریب نیچے زمین پر بیٹھنے آنکھوں میں آنسو بھرتے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ جس پر سکندر صاحب نے کچھ بولنے کی کوشش میں اپنے لب ہلانے اور غصے سے اُس کا ہاتھ جھکلتے حارث کو اشارے سے اپنے کمرے میں جانے کا کہا تو سارہ کے ساتھ ساتھ فریحہ بیگم نے بھی کسی غیر معمولی احساس کے تحت ایک دوسرے کو دیکھا۔

”ابو اپنی طبیعت کی وجہ سے کافی چڑھتے ہو گئے ہیں اس لیے تم پریشان مت ہونا، ہمارے ساتھ بھی وہ کچھ دنوں سے ایسے ہی اکھڑے اکھڑے سے ہیں“، حارث کو سکندر صاحب کی وہیل چیز دھکیل کر کمرے کی طرف لے جاتا دیکھ کر حاشر نے سارہ کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر تسلی دی اور خود بھی ان کے پیچھے ہی کمرے کی جانب بڑھا۔

”یہ بدھے کو کیا ہوا؟ ایسے میرا ہاتھ کیوں جھٹکا؟“ ان کے جاتے ہی سارہ نے تاسف سے فریحہ بیگم کی طرف دیکھا جو خود بھی سکندر صاحب کی حرکت پر غور کرتے وجہ سمجھنے کی کوشش میں لگی سارہ کی بات پر نفی میں سر ہلا گئیں۔



نور کا آج آخری پیپر تھا تب ہی اُس نے خدیجہ کے کہنے پر زارون کو لیٹ آنے کا کہا تاکہ وہ دونوں ساتھ کچھ وقت گزار سکیں مگر پرچہ ختم ہوتے ہی خدیجہ نے اُس سے اصرار کیا کہ وہ اُس کے ساتھ اُس کے گھر چلے کیوں کہ اُس کی امی اُس سے ملنا چاہتی ہیں۔

”نہیں یار میں نہیں جاسکتی ویسے بھی دی جان میرا انتظار کر رہی ہوں گی اور زارون کی اجازت کے بغیر جاؤں گی تو وہ غصہ کرے گا اس لیے میں کسی اور وقت چکر لگا لوں گی،“ نور نے اُس کے بڑھتے اصرار پر ایک معقول سی وجہ بتاتے معذرت کی۔

”او تو یہ بات ہے اب تمہیں مجھ سے زیادہ زارون اور اُس کی دی جان عزیز ہو گئی ہیں،“ ٹھیک ہے بھئی یہاں تو ہر انسان ہی مطلب پرست ہے، طنز یہ ہنسی ہستے خدیجہ نے کندھے اچکائے تو نور نے لنگی میں سر ہلاتے وضاحت دی۔

”نہیں یار ایسی بات نہیں ہے اور تم کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو؟ ہماری دوستی کے نقچ کوئی نہیں آ سکتا پر۔۔۔“

”کیا پر؟ اور میں کون ساتھیں اغوا کرنے لگی ہوں جو تم اس طرح میرے ساتھ جانے سے ڈر رہی ہو اور تم پہلے بھی بہت بار انکار کر چکی ہو پر آج تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا کیوں کہ میں ماما کو بول کے آئی ہوں کہ آج نور میرے ساتھ آئے گی تو آپ کسی پارٹی میں مت جائیے گا بلکہ گھر پر رہیے گا اور اب تم خود سوچو کہ اگر تم نہ گئیں تو ماما کو کتنا برا لگے گا اور ساتھ مجھے بھی،“ نور کو بات کے درمیان رکناد لیکھ کر خدیجہ نے اپنی ناراضی برقرار رکھتے ایک اور پتہ پھینکا۔

”اُف خدیجہ یار ایسی بات نہیں ہے اور تم میری بات نہیں سمجھ رہی، اچھا ٹھیک ہے میں زارون سے فون کر کے پوچھ لیتی ہوں پھر چلتی ہوں تمہارے ساتھ،“ اُس کامنہ بناد لیکھ کر نور نے اپنا موبائل نکالا تو خدیجہ نے جلدی سے اُس کے ہاتھ سے اچک لیا۔

”شرم کرلو اور میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ اُس زارون کو اپنے سر پر اتنا سوارنہ کرو کہ بعد میں وہ تمہاری زندگی کے ہر کام اور فیصلے میں مداخلت کرے، یا رکھ فیصلے اپنی مرضی سے کرنا سیکھو اور اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے یا میرے ساتھ کہیں بھی جانے کے لیے تمہیں اپنے شوہر کی اجازت چاہیے تو پلیز رہنے دو۔ مجھے تمہیں کہیں نہیں لے کر جانا،“، موبائل واپس اُس کے بیگ میں ڈالتے اُس نے خفگی سے اپنی بات مکمل کی اور انٹھ کر جانے لگی کہ نور نے اُس کا ہاتھ پکڑتے روکا۔

”پلیز اب تم تو ناراض نہ ہو اور میں نے ساتھ جانے سے منع نہیں کیا میرا بھی دل ہے کہ میں آنٹ سے ملوں پر مجھے ایک بار زارون سے پوچھ لینے دوتا کہ وہ بعد میں غصہ نہ کرنے،“ نور نے اُس کے سامنے کھڑے ہوتے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی تو خدیجہ نے نفی میں سر ہلاتے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے نکالا۔

”سوری پر مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں کہیں بھی تمہارے ساتھ کسی کی بھی اجازت لیے بغیر چل جاتی ہوں کیوں کہ مجھے تم پر اعتبار ہے مگر تم نے آج یہ بات کر کے ثابت کر دیا ہے کہ تمہیں نہ تو مجھ پر یقین ہے اور نہ ہی تم اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر میرے ساتھ کہیں جاسکتی ہو،“ آنکھوں میں اداسی لیے اُس نے جس طرح سے نور کو اُس کی غلطی کا احساس دلایا اُس نے ہامی بھرنے میں ایک سینکڑ لگایا۔

”ٹھیک ہے میں چل رہی ہوں اب موڑ ٹھیک کرو اپنا،“ اُس کی آنکھوں میں نبی اور افسردگی دیکھ کر نور سے برداشت نہیں ہوا تب ہی اُس نے دل سے تمام خدشات کو دور کرتے خدیجہ کے ساتھ جانے کی ہامی بھری تو وہ خوشی سے چیختے اُس کے گلے لگ گئی۔



زارون گیارہ بجے تک ایک مینگ سے فارغ ہونے کے بعد دی جان کے کہنے پر انھیں ٹائم سے سکندر صاحب کے گھر لے گیا تا کہ وہاں سے واپسی پر نور کو یونیورسٹی سے لے سکے جس نے آج اُسے

چار بجے تک آنے کا کہا تھا۔

”دی جان میں آپ کو بتا رہا ہوں نا کہ یہاں آنے یا بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیوں کہ میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں یہ آپ کی کوئی بات نہیں سینیں گے،“ زارون نے گیٹ کے سامنے گاڑی روکتے اُنہیں ایک بار پھر سے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی درخواست کی۔

”بات کرنا اور مسئلے کو سلچانا میرا فرض ہے باقی جو اللہ کو منظور ہوا ہونا وہی ہے اس لیے تم زیادہ پریشان مت ہو اور چلو اندر،“ نرمی سے جواب دیتے اُنہوں نے اپنی طرف کا دروازہ ٹھوٹا تو ان کے ارادوں میں پختگی دیکھ کر زارون نے اپنے آپ کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھا اور اپنی طرف کا دروازہ ٹھوٹا کر دی جان کا ہاتھ پکڑ کر اُنہیں گاڑی سے نکالتے اندر کی جانب بڑھا جہاں راحیل (جو سکندر صاحب کا خاص ڈرائیور ہونے سے پہلے زارون کا وفادار ملازم تھا اور اُسی کے کہنے پر سکندر صاحب کے گھر پچھلے چار سال سے نوکری کرنے کے ساتھ ساتھ وہ وہاں کے تمام حالات کی خبر زارون کو دیتا، نور کے نکاح کا بھی اُسی نے زارون کو بتایا تھا تب ہی وہ عین وقت پر وہاں پہنچ گیا) نے زارون کو دیکھتے ہی چوکیدار سے اُنہیں اندر آنے دینے کا کہا۔

”کیسے ہو؟“ زارون نے اُس کے قریب رکتے ہوئے پوچھا۔

”جی سر میں ٹھیک ہوں اور آپ یہاں کیسے؟ سب خیریت ہے نا؟“ زارون کو اچانک وہاں دیکھ کر راحیل نے دی جان کو سلام کیا جو اسے وہاں دیکھ کر حیران تھیں۔

”ہاں خیریت ہی ہے بس دی جان کی ضد تھی کہ اپنی بہو کے گھروالوں سے ملنا چاہتی ہیں تب ہی لے آیا،“ ہلکی سے مسکراہٹ چہرے پر سجائتے اُس نے جواب دیا اور بیرونی دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے حارث عجلت میں نکل کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھا پر زارون پر نظر پڑتے ہی رک گیا۔

”تم یہاں کیسے؟“ گاڑی کا دروازہ بند کرتے وہ اُس کی جانب بڑھا جو اشارے سے راحیل کو

جانے کا کہہ چکا تھا۔

”دی جان یہ حارت ہے نور کا بڑا بھائی جس کا ذکر وہ اکثر آپ سے کرتی ہے، اُس کی بات کا جواب دینے کے بجائے زارون نے دی جان سے اُس کا تعارف کروایا جو اُس کا نام سنتے ہی ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ اُسے دیکھنے لگیں جو ابھی تک آنکھوں میں بے یقینی لیے اُن دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

”هم سکندر صاحب سے بات کرنے آئے ہیں بلکہ انہیں منانے، کیا وہ گھر پہ ہیں؟“ دی جان نے بہت اپنا سیت کے ساتھ سوال کیا تو حارت نے اثبات میں سر ہلاتے انہیں اپنے ساتھ اندر آنے کا اشارہ کیا۔

”آپ بیٹھیں اور جو بھی بات ہے مجھے بتا دیں کیوں کہ ابو کی طبیعت خراب ہے،“ ڈرائیگر روم میں آتے اُس نے انہیں بیٹھنے کا کہتے خود بھی سامنے والے صوف پر بیٹھتے اپنے دل کو نور کے بارے میں پوچھنے سے باز رکھتے کہا۔

”بات تو آپ کے ابو سے ہی کرنے والی تھی تو اگر ان کی طبیعت زیادہ خراب نہیں ہے تو آپ مہربانی کر کے ان ہی بلاد دیں،“ حارت کی بات سنتے ہی دی جان نے شاستہ لمحے میں درخواست کی۔

”اُن کو کچھ دن پہلے ہی فانج کا اٹیک ہوا جس کی وجہ سے اُن کا بایاں حصہ کام کرنا چھوڑ چکا ہے، زبان پہ بھی اثر ہے اس لیے آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دے پائیں گے،“ دی جان کی عمر کا لحاظ کرتے حارت نے نرمی سے جواب دیا۔

”اوواللہ پاک صحت دے،“ دی جان نے حارت کی بات سنتے ہی دعا دی اور اصل بات پر آتے اپنی بات کا آغاز کیا۔

”دیکھو بیٹا تم بھی جوان ہو پڑھے لکھے ہو سمجھ سکتے ہو کہ انسان خطا کا پتلا ہے اور بعض اوقات جذبات میں آکر بڑے بڑے فیصلے بناؤ پے سمجھے کر لیتا ہے جیسے زارون اور نور نے کیا مگر اس کا یہ

مطلوب نہیں ہے کہ ایک غلطی کے بعد انسان مزید غلطیاں کرے اسی لیے میں ان کی غلطی کو سدھارنے یہاں آئی ہوں تاکہ ہم دو خاندانوں کے درمیان اس وجہ سے جو خلش آچکی ہے وہ دور ہو سکے، دی جان نے بڑے تحمل کے ساتھ اپنی بات کی بنیاد رکھی اور حارت کی سوالیہ نظروں پر اپنی بات کو مزید آگے بڑھایا۔

”میں جانتی ہوں کہ ایک بار بیٹی کی عزت پر کوئی داغ لگ جائے تو ساری عمر نہیں مُتنا اور یہ بھی سمجھتی ہوں کہ زارون نے جو کچھ کیا وہ غلط تھا اُسے نور کو اس طرح اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہیے تھا پر شاید ان کی قسمت میں اسی طرح ایک ہونا لکھا تھا“، ڈرائیور میں کسی عورت کو داخل ہوتا دیکھ کر دی جان نے مزید کچھ کہنے سے پہلے نظر اٹھا کر دیکھا۔

”یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ اور تم؟ تم نے اسے اندر کیسے آنے دیا؟“ فریجہ بیگم نے زارون کو دیکھتے ہی حارت پر چلاتے ہوئے پوچھا جو ان کے آنے کا کوئی بھی نوٹس لیے بغیر دی جان کی بات پر غور کر رہا تھا۔

”یہ میرا گھر ہے اور یہاں سب میری مرضی کے مطابق ہو گا اس لیے آپ مزید کچھ بھی بولنے سے پہلے سوچ لجیے گا“، زارون کے کچھ بولنے سے پہلے ہی حارت نے اُن کی طرف دیکھے بغیر خبردار کیا۔

”کون سا گھر؟ یہ گھر بھائی صاحب میرے نام کر چکے ہیں اس لیے یہاں جو کچھ بھی ہو گا وہ سب میری مرضی سے ہو گا تو تمہارے لیے بہتر ہے کہ ان لوگوں کو یہاں سے دفع کرو اور دوبارہ مجھ سے اس لمحے میں بات کرنے سے پہلے ہزار بار سوچ لینا کہ اب تم اپنے نہیں بلکہ میرے گھر میں کھڑے ہو کر بات کر رہے ہو، ایک نظر دی جان پڑالتے (جو زارون کو کچھ بھی بولنے سے منع کر رہی تھیں) فریجہ بیگم نے زہرا گلا تو حارت کی ہمت جواب دے گئی جو قبضے سے اُن کی ساری باتیں برداشت کر رہا تھا۔

”یہ لوگ کہیں نہیں جائیں گے اور آپ کو جو کرنا ہے کر لیں میں بھی دیکھتا ہوں اس گھر سے مجھے

کون نکالتا ہے۔ یہ گھر ہمارا تھا ہمارا ہی رہے گا مجھیں آپ، حارت نے کسی کی بھی پرواکیے بننا چلاتے ہوئے کہا تو ڈرائیور میں شور کی آواز پر حاشر جو سکندر صاحب کو لاوٹھ میں لے کر جا رہا تھا اُس جانب بڑھا۔

”یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا،“ زارون کو دیکھتے ہی حاشر وہیل چیز چھوڑتے اُس کی جانب لپکا پر حارت نے اُسے زارون تک پہنچنے سے پہلے ہی پکڑا۔

”زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تم ابوکو لے کے باہر جاؤ میں بات کر رہا ہوں،“ حاشر کی آنکھوں میں غصے کی لہر دیکھتے حارت نے ٹوکا۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گا اور اسے بھی کہیں نہیں جانے دوں گا اس کی ہمت کیسے ہوئی یہاں قدم رکھنے کی،“ حارت کا ہاتھ جھکلتے حاشر نے خونخوار نظروں سے زارون کو دیکھا جواب اُن سب کی مسلسل بدتمیزیوں پر دانت پیستے بس دی جان کی وجہ سے خاموش کھڑا سب برداشت کر رہا تھا۔

”بیٹا تحمل سے بیٹھ کر ہماری بات سن لو ایسے غصے سے نہ تمہیں کچھ حاصل ہو گا نہ ہمیں بلکہ بات مزید بگڑ جائے گی،“ دی جان نے حاشر کے سامنے جاتے اُسے سمجھانے کی کوشش کی جو بار بار حارت سے ہاتھ چھڑواتے زارون کو مارنے کے لیے اُس کی جانب لپک رہا تھا۔

”بڑھیا تمہارے لیے اچھا ہے کہ یہاں سے چپ کر کے اپنے بیٹے کو لے کر چلی جاؤ، ورنہ اس عمر میں میرے بھتیجے نے تمہاری کوئی ہڈی وڈی تو ڈر جوڑنی بھی مشکل ہو جائے گی،“ حارت حاشر کی مسلسل بدتمیزیوں کو دیکھ کر دی جان کو کچھ دیر انتظار کرنے کا کہتے اُسے لے کر باہر کی جانب بڑھاتا کہ اُس کا غصہ ٹھنڈا کر سکے تو فریحہ بیگم نے موقع ملتے ہی ساجدہ بیگم کو مشورہ دیا جس پر زارون نے تمام باتیں فراموش کرتے فریحہ بیگم کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے اُن کا راستہ روکا جواپی بات کہہ کر واپس جا رہی تھیں۔

”کیا بکواس کی ہے تم نے ابھی؟“ آنکھوں میں بلا کاغصہ لیے زارون نے اپنے جبڑوں کو مضبوطی سے بند کرتے پوچھا تو فریجہ بیگم دو قدم پیچھے ہوئیں۔

”زارون چھوڑ و بس گھر چلو مجھے لگتا ہے ہم نے یہاں آ کر غلطی کر لی،“ دی جان نے اُسے آگ بگولہ ہوتے دیکھ کر مداخلت کی اور اُس کا بازو پکڑ کر اپنے ساتھ باہر کی جانب دھکیلا تا کہ مزید کوئی تماشا نہ بنے۔

”دی جان پلیز مجھے چھوڑ دیں میں اس عورت کو اس کی اوقات یاددا کر رہی یہاں سے جاؤں گا،“ زارون نے اُن کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا اور واپس فریجہ بیگم کی جانب بڑھا جو زارون کے غصے سے سہم چکی تھیں۔

”زارون میں کہہ رہی ہوں نا یہاں سے چلو تو بس چلو،“ دی جان نے اب کی بارغصے سے حکم دیا تو وہ فریجہ بیگم کی بعد میں خبر لینے کا ارادہ کرتے دی جان کے پیچھے ہی باہر کی جانب بڑھا۔



وہ خدیجہ کے ساتھ اُس کے گھر پہنچی تو اُس کی امی نے ہی اُن کا استقبال کیا جو نور کو کہیں سے بھی خدیجہ کی والدہ نہیں لگیں۔

”ماشاء اللہ آپ کی دوست تو بہت پیاری ہے آپ کی باتوں اور تعریفوں سے بھی زیادہ،“ نور کے شفاف چہرے کو دیکھتے تھیں بیگم نے اپنا سارا ٹھیک کیا تو نور نے اُن کا تفصیلی جائزہ لیا جو سرخ رنگ کی سارا ٹھیک میں چہرے پر میک اپ کی تھہ چڑھائے اور بھاری زیورات کے ساتھ بالوں میں سفید موتیوں کے گجرے لگائے نور کو کسی طرف سے معزز یا عام خاتون نہیں لگیں تب ہی اُس نے کچھ منٹ بیٹھنے کے بعد خدیجہ سے جانے کا کہا جو بڑی بے تکلفی کے ساتھ اپنی ماں کو نور کے بارے میں بتا رہی تھی۔

”اتی جلدی ابھی تو ہمیں دس منٹ بھی نہیں ہوئے یہاں آئے ہوئے،“ اُس کی بات سننے ہی

خدیجہ نے کلاک کی جانب دیکھا۔

”ہاں بس دی جان میرا انتظار کر رہی ہوں گی اور زاروں بھی شاید اب تک مجھے لینے آچکا ہو تو پلیز تم مجھے یونیورسٹی ڈریپ کر دو،“ نور نے وہاں کے ماحول سے کچھ اجنبیت سی محسوس کرتے خدیجہ سے کہا جو اُس کو پریشان دیکھ کر تسلی دیتے کچھ دری میں چلنے کا کہتے اپنی ملازمہ کو آواز لگانے لگی۔

”مجھے لگ رہا ہے آپ کی دوست کو ہم سے مل کر زیادہ خوشی نہیں ہوئی،“ نور کے چہرے پر ہوائیاں اڑی دیکھ تھیں بیگم نے اندازہ لگایا۔

”نہیں، آنٹی ایسی کوئی بات نہیں ہے بس میرے شوہر مجھے لینے آگئے ہوں گے، اس لیے جانے کا بول رہی ہوں،“ مروتاً نور نے مسکراتے ہوئے انہیں مطمئن کیا تو ملازمہ خدیجہ کی ہدایت کے مطابق جوس لے کر لا ونچ میں داخل ہوئی۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی،“ نور نے خود کو پسکون کرنے کی کوشش کرتے جوس کا گلاس اٹھایا۔

”کیوں ضرورت نہیں تھی بھائی تم ہماری مہمان ہو اور ہم اپنے مہمانوں کی بہت عزت کرتے ہیں،“ نور کے کانپتے ہاتھوں کو دیکھ کر خدیجہ نے تھیں بیگم کو چپکے سے آنکھ ماری تو وہ اپنی مسکراہٹ سکیڑتے گلاس لبوں سے لگا گئیں۔



”دی جان میں نے آپ سے کہا تھا ان لوگوں سے بات کرنا بے کار ہے اور آپ نے مجھے کیوں روکا؟ میں اُس عورت کو زندہ نہیں چھوڑوں گا اُس کی ہمت کیسے ہوئی آپ سے بد تیزی کرنے کی،“ زاروں نے گاڑی یونیورسٹی کے راستے میں ڈالتے کوئی دس بار ایک ہی بات دوہرائی تو دی جان کو بھی اپنے فیصلے پر تھوڑا افسوس ہوا۔

”ہم بات کرنا تو بے کار تھا پر میں نے اپنا فرض پورا کیا تاکہ کل کونور کو یہ نہ لگے کہ ہم نے اُس کے گھروالوں کو منانے کی ایک بھی کوشش نہیں کی،“ دی جان نے زارون کے غصے کی وجہ اپنے لبج کو ہموار رکھتے اُسے یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ انہیں حاشر کی یا فریجہ بیگم کی کوئی بات بُری لگی ہے۔

”نور کو کچھ نہیں لگے گا کیوں کہ وہ خود بھی اپنے گھروالوں کی اصلیت اچھی طرح جانتی ہے اس لیے آپ بے فکر ہیں اور گھر پہنچتے ہی حولی جانے کی تیاری کریں۔ میں آج شام میں ہی آپ لوگوں کو سائیں کی حولی چھوڑ آؤں گا،“ زارون نے بات کو مزید طول دینے کے بجائے دی جان سے کہا جو خود بھی نور کے گھروالوں کے رویے سے کافی افسردہ ہوئیں تھیں تب ہی زارون کی بات سنتے ہی اثبات میں سر ہلا گئیں۔



یونیورسٹی کے سامنے گاڑی روکتے زارون نے دی جان کو دو منٹ کا بولتے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور گیٹ کے پاس نور کی تلاش میں نظر دوڑائی۔

”کہاں رہ گئی ہے یہ لڑکی؟“ کچھ منٹ انتظار کرنے کے بعد اُس نے اپنے موبائل سے اُس کا نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف موبائل بند دیکھ کر یونیورسٹی کے اندر کی جانب بڑھا۔

”اُف اب یہ موبائل پتا نہیں کیوں آف کیا ہوا ہے؟“ دو تین بار ٹرائی کرنے کے بعد زارون نے کچھ سوچتے ہوئے اُس کے ڈیپارٹمنٹ کا رخ کیا پر وہاں پہنچ کر اُس کی کلاس اور ہر جگہ دیکھنے کے بعد بھی جب وہ اُسے نہیں ملی تو اُس نے پھر سے موبائل سے اُس کا نمبر ڈائل کیا۔

”پھر بند، اتنی بار کہا ہے کہ موبائل یاد سے چارج کر لیا کرو پر میری تو کسی بات کی سمجھ نہیں آتی،“ اسے دو سے تین جگہ مزید دیکھتے جہاں جہاں اُس کے ملنے کی امید تھی زارون نے اُس کی کلاس کی لڑکی (جس سے نور نے اُس دن نوٹس لیے تھے) کو پاس سے گزرتا دیکھ کر مخاطب کیا۔

”ایکسکیو زمی سسٹر؟ کیا آپ نور میرا مطلب نور اعین کی کلاس فیلو ہیں؟“  
”جی اور آپ اُس کے شوہر ہیں ناجو اُس دن اُس کے ساتھ نوٹس بnar ہے تھے؟“ نمرہ نے زارون کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔

”جی جی میں وہی ہوں وہ مجھے پوچھنا تھا کیا آپ نے نور کو کہیں دیکھا ہے؟ ایکچھوں لی وہ مجھے مل نہیں رہی اور اُس کا موبائل بھی بند ہے،“ زارون نے ادھر ادھر کی کوئی بات کرنے کے بجائے سیدھا اپنے مسئلے پر آتے اُس سے پوچھا جو شاید زارون کے اس طرح مخاطب کرنے پر کچھ زیادہ ہی پر جوش ہو چکی تھی۔

”نہیں، میں نے ابھی تو نہیں دیکھا پر اب سے تقریباً دو گھنٹے پہلے میں نے اُسے خدیجہ کے ساتھ لان میں بیٹھے دیکھا تھا،“ نمرہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا تو آپ پلیز خدیجہ سے پوچھ سکتی ہیں کہ نور اس وقت کہاں ہے یا آپ مجھے ہی نمبر دے دیں میں خود ہی پوچھ لیتا ہوں،“ ہچکھاتے ہوئے زارون نے اُس سے اپنی بات کہی کیوں کہ اس طرح کسی لڑکی کا نمبر مانگتے اُسے خود بھی عجیب لگ رہا تھا۔

”جی میں ویسے بھی اُس ٹائپ کی لڑکیوں سے بات نہیں کرتی اور نہ ہی میرے پاس اُس کا نمبر ہے پر میں آپ کو اپنے سی آر سے لے کر دے دیتی ہوں،“ زارون کی بات سنتے ہی نمرہ نے اُسے پریشان دیکھ کر اُس کا مسئلہ حل کیا اور اپنے موبائل سے کسی کا نمبر ڈال کرنے لگی تو زارون نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔

”ہیلو احمد کیا تم مجھے خدیجہ کا نمبر سینڈ کر سکتے ہو؟ مجھے اُس سے کام تھا،“ نمرہ نے سلام کرتے ہی دوسری طرف موجود لڑکے سے کہا۔

”اچھا تھیں کیوں پلیز ابھی سینڈ کر دو،“ اُس کی بات سنتے ہی نمرہ نے زارون کی طرف دیکھا جو اُس

کی مسکراہٹ سے سمجھ چکا تھا کہ اُس کا کام ہو چکا ہے۔

”کر رہا ہے سینڈ“، موبائل کان سے ہٹاتے اُس نے زارون کو بتایا اور ساتھ ہی احمد کا میسح دیکھتے اُسے نمبر نوٹ کروانے لگی جس کی فکر مندی اب پریشانی میں بدل چکی تھی۔

”بہت شکر یہ آپ کا“، زارون نے ایک بار پھر سے اُس کا شکر یہ ادا کیا اور اپنے موبائل سے نمبر ڈائل کرتے کینٹین سے باہر آیا پر دوسری طرف نمبر بند ملنے پر اب اُسے صحیح معنوں میں پریشانی ہوئی تب ہی اُس نے دی جان کا خیال آتے ہی باہر کا رخ کیا تاکہ انھیں کسی طرح گھر بھج کر خود نور کو تلاش کر سکے جو پتا نہیں اچانک کہاں غائب ہو گئی تھی۔

یونیورسٹی سے باہر نکلتے ہی زارون نے عالیان کو کال کر کے ساری بات بتاتے دس منٹ میں یونیورسٹی پہنچنے کا بولا۔

”کہاں ہے نور؟ ابھی فری نہیں ہوئی کیا؟“، آدھے گھنٹے بعد بھی اُسے اپنی طرف اکیلے ہی آتے دیکھ کر ساجدہ بیگم نے سوال کیا۔

”جی، دی جان بس اُس کا ابھی تھوڑا کام رہتا ہے، ٹائم لگے گا اُسے“، زارون نے اصل بات بتا کر انھیں پریشان کرنے کے بجائے جھوٹ کا سہارا لیا۔

”اچھا ٹھیک ہے آ جاؤ تم بھی اندر ہم انتظار کر لیتے ہیں“، اُسے گاڑی سے باہر کھڑا دیکھ کر انہوں نے کہا تو زارون نے لنگی میں سر ہلا کیا۔

”نہیں آپ گھر جائیں میں نے عالیان کو بُلا یا ہے اور میں کچھ دیر میں نور کو ساتھ لے کر ہی آؤں گا“، عالیان کی گاڑی اپنے قریب رکتی دیکھ کر جو دس منٹ سے بھی پہلے وہاں پہنچ چکا تھا زارون نے کہتے ساتھ ہی اُن کی طرف کا دروازہ کھولا۔

”زیادہ وقت لگے گا کیا جو تم نے عالیان کو بلوالیا“، اُس کے چہرے کے اُڑے ہوئے رنگ دیکھ

کر ساجدہ بیگم کو کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا تب ہی انہوں نے پھر سے سوال کیا۔

”جی ایک گھنٹہ لگے گا ابھی اور شام بھی ہو رہی ہے تو مجھے ایسے اُسے اکیلا چھوڑنا کچھ مناسب نہیں لگا تب ہی عالیان کو بُلا یا کہ وہ آپ کو گھر چھوڑ دے تاکہ میں پھر تسلی سے نور کو لے کر ہی گھر آؤں،“ زارون نے پوری بات تفصیل سے بتاتے ساجدہ بیگم کو مطمئن کیا اور عالیان کو وہیں رکنے کا اشارہ کرتے اُن کی طرف کا دروازہ کھولتے انہیں ہاتھ کا سہارا دے کر نیچے اتارا۔

”ٹھیک ہے جلدی آ جانا،“ گاڑی کے پاس جاتے اُنہوں نے عالیان کے سلام کا جواب دیتے زارون کو تلقین کی جوابات میں سر ہلاتے انہیں عالیان کی گاڑی میں بٹھا چکا تھا۔

”کیا ہوا اور کہاں گئی ہیں بھا بھی؟“ عالیان نے دی جان کے بیٹھتے ہی تھوڑا سا سائیڈ پر ہوتے زارون سے پوچھا۔

”پتا نہیں یا رہ جگہ دیکھ چکا ہوں کہیں نہیں مل رہی اور اوپر سے موبائل بھی بند ہے۔“

”لڑائی ہوئی تھی کیا تمہاری؟“ عالیان کو لگا شاید ابھی بھی اُن کے درمیان سب ویسا ہی ہے تب ہی اُس نے اندازہ لگایا۔

”نہیں یا رہنا کیوں ہے اور لڑنے سے نور کے غائب ہونے کا کیا تعلق؟“ سوالیہ نظر وہ اُس کی جانب دیکھتے وہ کچھ الجھا۔

”اچھا پریشان نہ ہو، یہیں ہوں گی تم دیکھو میں بس کچھ دیر میں دی جان کو چھوڑ کر آتا ہوں،“ ساجدہ بیگم کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر عالیان نے اُسے تسلی دی اور دوسری طرف ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھتے گاڑی اسٹارٹ کرتے سڑک پر ڈالی تو زارون اُن کے جاتے ہی واپس یونیورسٹی کی جانب بڑھا۔

نور کو تلاش کرتے شام کے سات نج چکے تھے اور دھیرے دھیرے یونیورسٹی خالی ہونے لگی تو

زارون کو اپنادل بند ہوتا محسوس ہوا۔

”یاراب کیا کریں میری تو بس ہو گئی ہے چل چل کے پر بھا بھی تو مل ہی نہیں رہیں“، عالیان جو دی جان کو چھوڑ کر پندرہ منٹ میں واپس آگیا تھا اور تب سے ہی زارون کے ساتھ مختلف لوگوں سے پوچھتے اور یونیورسٹی کا ہر حصہ دیکھنے کے بعد اُس نے پھولی ہوئی سانس کو ہموار کرنے کے لیے ایک بیٹھ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو لگ رہا ہے وہ یہاں ہیں ہی نہیں“، زارون کو خاموش دیکھ کر عالیان نے ایک بار پھر سے اپنا اندازہ لگایا تو اُس کی بات سنتے ہی زارون نے اپنا موبائل نکالا اور ڈی ایس پی (جو احتشام صاحب کی وجہ سے زارون کو بھی بہت اچھی طرح جانتا تھا) کو کال کرتے تمام صورت حال سے آگاہ کرتے یونیورسٹی آنے کا کہا تاکہ وہاں کی ایڈمنیسٹریشن سے بات کر کے آج کی سی سی ٹی کیمروں کی ویڈیو زد دیکھ سکیں۔

”ٹھیک ہے زارون تم انتظار کرو میں بس کچھ ہی دری میں خود وہاں آتا ہوں“، ڈی ایس پی نے اُسے تسلی دی تو زارون نے انہیں جلدی آنے کی تلقین کرتے کال کاٹ دی۔

”یار پولیس کو انفارم کرنے کی کیا ضرورت تھی ہم خود ہی جا کر ایڈمنیسٹریشن سے بات کر لیتے“، اُس کے فون بند کرتے ہی عالیان نے اُس کے قریب آتے کہا تو زارون نے جواب دینے کے بجائے اُسے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

”اُف ایک تو یہ لڑکا کسی کی نہیں سنتا“، اُس کی پشت کو دیکھتے عالیان نے خود کلامی کی اور اُس کے پیچھے ہی یونیورسٹی کی دوسری جانب بڑھا جہاں انفارمیشن آفس کے ساتھ کنٹرول روم بھی موجود تھا (جہاں گارڈ کی انفارمیشن کے مطابق اُسے تمام سی سی ٹی وی کیمروں کی ویڈیو کاریکار ڈیل سکتا تھا)۔

نور کی آنکھ کھلی تو اُس نے سر اٹھانے کی کوشش کی جو کافی بھاری تھا، ”یہ میں کہاں ہوں؟“ خود کو ایک انجан جگہ پر دیکھتے اُس نے آنکھیں جھپکتے سوچا اور ذہن پر زور ڈالتے ہی اُسے یاد آیا کہ وہ خدیجہ کے ساتھ اُس کے گھر آئی تھی جہاں جوں پینے کے بعد وہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔

”خدیجہ؟“ با مشکل سر اٹھاتے وہ اٹھ کر بیٹھی اور کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی جو خالی تھا۔

”خدیجہ کہاں ہوتم؟“ دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپیوں کو مسلتے اُس نے درد کو کم کرنے کی کوشش کی

جو سر اٹھانے سے شدید ہو چکا تھا۔

”کہاں ہوں میں؟ زارون؟“ ابھی بھی نشے اور درد کی وجہ سے اُسے سمجھنہیں آئی کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا ہے، تب ہی لڑکھراتے الفاظ کے ساتھ اُس نے اپنی آنکھوں کو کھلا رکھنے کی کوشش کی جو پھر سے بند ہو رہی تھیں۔

”خدیجہ کہاں ہوتم یا رآ جاؤ مجھے گھر چھوڑ دو زارون میرا نظردار کر رہا ہو گا،“ ہمت کر کے کھڑے ہوتے اُس نے آواز لگائی پر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتی یا آگے بڑھتی ایک دم سے اُس کی آنکھوں کے سامنے اندر ہرا آیا اور وہ پھر سے بیڈ پر گرتے بے ہوش ہو گئی۔

☆☆☆

ڈی ایس پی کے آتے ہی پرنسپل کی اجازت سے زارون نے تمام ویڈیو زدیکھیں جس میں ایک بچے کے قریب نور اسے نمرہ کی بتائی ہوئی جگہ پر خدیجہ کے ساتھ بیٹھی با تیں کرتی نظر آئی اور پھر ایک تیس پر وہ اُسے خدیجہ ہی کے ساتھ گیٹ کی طرف جاتے ہوئے نظر آئی تو زارون کا شک یقین میں بدل گیا۔ وہ جس دن خدیجہ سے ملا تھا اُسے اُسی دن وہ خود اور اُس کی با تیں کچھ عجیب لگی تھیں پر زارون نے یہ سوچ کے اگنور کر دیا کہ ہو سکتا ہے اُس کی غلط فہمی ہو۔

”یہ لڑکی کون ہے اور بھا بھی اس کے ساتھ باہر کیوں گئیں؟“ عالیان نے خدیجہ کو دیکھتے ہی

حیرت سے سوال کیا تو زارون نے خدیجہ کی تصویر پر ویڈیو کو اسٹاپ کرواتے ڈی ایس پی صاحب کو اس لڑکی کو جلد از جلد تلاش کرنے کا کہا اور خود انفارمیشن روم کی جانب بڑھتے انہیں خدیجہ سے متعلق تمام معاملات نکالنے کا آرڈر دیا جو پولیس کی وجہ سے اور اپنی یونیورسٹی سے ایک لڑکی کی گمشدگی پر خاموشی سے زارون کو خدیجہ کا تمام ریکارڈ نکال کر بتانے لگے۔

یونیورسٹی سے ملنے والی انفارمیشن کے بعد زارون نے اکرم کو کال کرتے وہاں جا کر خدیجہ کے بارے میں پتا کرنے کا کہا اور ساتھ اُس کی تصویر بھی سینڈکی تاکہ کسی قسم کی کوئی مشکل نہ ہو پر ایک گھنٹے بعد اکرم کی طرف سے جوخبر اُس سے ملی اُس نے زارون کو طیش دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تب ہی وہ عالیان کے روکنے کے باوجود انفارمیشن روم کی جانب بڑھا۔

”زارون میری بات سنو کہاں جا رہے ہو؟“ اُس کے خطرناک ارادے دیکھتے عالیان اُس کے پیچے بھاگا جو وہاں داخل ہوتے ہی وہاں موجود شخص کو گریبان سے پکڑ چکا تھا۔

”اندھے ہوتم لوگ؟“ ایک زوردار تھپٹر اُس شخص کے گال پر جڑتے اُس نے پھر سے ہاتھ اٹھایا تو عالیان نے اُس کا ہاتھ پکڑا۔

”کیا کر رہے ہو یا رس بے چارے کا کیا قصور ہے اور وہ لڑکی کافی شاطر تھی اور شاید وہ اسی مقصد کے تحت یہاں آئی تھی،“ عالیان جو خدیجہ کے نہ ملنے کی خبر سن چکا تھا اُس نے آتے ہی زارون کو سن بھا جا واب آپ سے باہر ہوتے ہر چیز کو آگ لگانے کے لیے بے تاب تھا۔

”سر پلیز اپنی لمب میں رہیں اور آپ کی بیوی خود گئی ہیں یہ بات آپ ریکارڈ نگ میں دیکھو چکے ہیں۔ اس میں ہمارا یا یونیورسٹی کے کسی بھی شخص کا کوئی عمل دخل نہیں،“ زارون کو مسلسل چیختا دیکھ کر پرنسپل نے آگے بڑھتے وضاحت دی تو زارون اپنا ہاتھ چھپڑواتے اُس کی جانب لپکا۔

”قصور آپ کا یہ ہے کہ ایک اسٹوڈنٹ پچھلے چھ مہینے سے یہاں پڑھ رہی ہے وہ بھی جعلی کاغذات

پا اور آپ کو خبر تک نہیں ہوئی اگر میری نور کو کچھ ہوانا تو آپ سب سُن لیں زارون علی یہاں کی ہر چیز تباہ کر دے گا اور ساتھ آپ لوگوں کو بھی، ”زور سے ہاتھ پیبل پر مارتے اُس نے دھمکی دی اور ڈی الیس پی کے آتے ہی اُن سب سے پوچھ گچھ کا کہتے باہر کی جانب بڑھاتا کہ خود جا کر خدیجہ کے بارے میں معلوم کر سکے۔



ساری رات گزر چکی تھی پرنہ تو خدیجہ کا کچھ پتا چل رہا تھا اور نہ ہی نور کی کچھ خبر تھی دی جان الگ سے گھر میں اُن دونوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے پریشان تھیں اور رشیدہ سے پانچ بار زارون کو فون کرو اچکی تھیں جو ہر بار کچھ دیر میں آنے کا بولتے انہیں تسلی دے دیتا۔

”اللہ خیر کرے پتا نہیں کیا بات ہے جو یہ لڑکا ہمیں بتا نہیں رہا“، رشیدہ نے آخری بار فون کرتے دی جان کو بتایا تو دی جان نے پریشانی سے اُسے دوبارہ نمبر ملانے کا کہا تا کہ خود زارون سے بات کر کے پوچھ سکیں۔

”دی جان، مصروف ہے نمبر چھوٹے صاحب کا“، رشیدہ نے دوبارہ رائی کرنے کے بعد انہیں بتایا تو کلاک پر صحیح کے چار بجتے دیکھا انہوں نے اپنی تسبیح اٹھائی اور زارون اور نور کے خیریت سے ہونے کی دعا کرنے لگیں۔



نور کی دوبارہ آنکھ منہ پر پڑنے والے ٹھنڈے پانی سے کھلی، ”زا۔۔ رون“، ایک دم سے ٹھنڈے پانی پر وہ چلاتے ہوئے اٹھی تو اپنے سامنے زارون کے بجائے تمہینہ بیگم کو دیکھ کر اُس کا ذہن مکمل طور پر بیدار ہوا۔

”میں کہاں ہوں؟ کیا ٹائم ہو گیا ہے؟ آنٹی پلیز خدیجہ کو بلا لیں مجھے گھر چھوڑ آئے زارون بہت

پریشان ہوگا، نور نے کلاک پر وقت دیکھتے سمجھا کہ شاید شام ہو گئی ہے تب ہی جلدی سے اٹھتے اُس نے باہر کی جانب بڑھنا چاہا مگر اُس سے پہلے ہی ایک لمبے قد کے ہٹے کٹے شخص نے اُس کا راستہ روکا جس کی حد سے زیادہ کالی رنگت اور سامنے چمکتے پیلے دانت دیکھ کر نور کو وحشت ہوئی۔

”کیا مسئلہ ہے تمہیں میرا راستہ چھوڑ واور آنٹی پلیز خدیجہ کو بُلا کیں مجھے گھر جانا ہے، آنکھوں میں بے خوف لیے اُس نے اُس شخص کو دیکھتے تھیں بیگم سے کہا جو اُس کی بات سنتے ہی ایک زوردار قہقہہ لگاتے تالی بجانے لگیں۔

”اُف خدیجہ نے ٹھیک کہا تھا تم اول درجے کی احمدی اڑکی ہو مطلب کہ تم مجھے دیکھ کر بھی نہیں سمجھیں کہ وہ تمہیں کہاں لائی ہے؟“ تھیں بیگم جواب نامناسب سے لباس میں دوپہر کی ہی طرح ڈھیر سارے زیور اور بالوں میں گھرے لگائے تھی سنوری سی تھیں انہوں نے نور کی بات سنتے قدم اُس کی جانب بڑھائے جوا بھی بھی نا سمجھی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”مطلب کہاں لائی ہے مجھے؟ اور آپ یہ کیا پہلیاں بچھوارہی ہیں پلیز آنٹی خدیجہ سے بولیں مجھے گھر چھوڑ دے زارون پریشان ہوگا۔“

”تو ہونے دو پریشان اور بھول جاؤ اسے کیوں کہ تمہاری دوست میرا مطلب خدیجہ جو کہ میرے گینگ کا حصہ ہے اور میں اُس کی ماں نہیں بلکہ اُس کی بات ہوں وہ تمہیں یہاں میرے پاس اس کو ٹھے پہ چھوڑ گئی ہے، تھیں بیگم نے مسکراتے ہوئے جتنی آسانی سے اپنی بات کہی نور نے اتنی ہی بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

”نہیں، وہ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی پلیز مجھے جانے دیں اور آپ کو جتنے پیسے چاہیے ہوں گے زارون آپ کو دے دے گا پر پلیز مجھے جانے دیں،“ اُس کی بات سنتے ہی نور کے حواس جواب دے چکے تھے اور آنسو خود بخود اپنی بے وقوفی پر گالوں پہ بہنے لگے جسے ہاتھ کی پشت سے رگڑتے اُس نے تھیں

بیگم کی منت کی۔

”اووسوری میری تسلی میں تمہیں اب یہاں سے جانے نہیں دے سکتی کیوں کہ تمہاری طرح کی خوبصورت پریاں تو کبھی کبھی ہی ہمارے ہاتھ آتی ہیں اور تمہارا شوہر ہمیں کیا دے گا ہونہہ بس چند لاکھ مگر تم سے کروڑوں کیسے کمانے ہیں یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں اس لیے زیادہ شور کرنے کی ضرورت نہیں اب یہ جگہ ہی تمہارا گھر ہے اور تم زندگی بھر یہیں رہو گی“، اُس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے تمہینہ بیگم نے جتنی نرمی سے کہانور نے اتنے ہی غصے سے ان کا ہاتھ جھٹکتے پیچھے کی جانب دھکا دیا۔

”تم میرے شوہر کو جانتی نہیں وہ تم لوگوں کا حشر کر دے گا اور ساتھ خدیجہ کا بھی جس نے دوستی کی آڑ میں مجھ سے اتنا بڑا کھیل کھیلا“، ہمت ہارنے کے بجائے نور نے نذر ہوتے جواب دیا اور وہاں پڑا گلدان اٹھا کر تمہینہ بیگم کی طرف پوری طاقت سے پھینکا جو لگنے سے پہلے ہی اُس دیونما شخص نے ہاتھ مارتے توڑ دیا۔

”یہ بس چہرے سے ہی معصوم ہے اس لیے اس کا خاص دھیان رکھنا اور جتنا جلدی ممکن ہو سکے اس کی ساری اکڑ نکال دو“، اُس شخص کو ہدایت دیتے تمہینہ بیگم نے ایک اچھتی نگاہ نور پر پڑا لی اور اُس کے چینخنے کی پرواکیے بنا کمرے سے باہر نکلی تو اُس شخص نے اندر سے دروازہ لاک کرتے قدم نور کی جانب بڑھائے جواب اُس کے چہرے پر تھی مکروہ مسکراہٹ پراندر تک دہل چکی تھی تب ہی آنکھوں میں خوف لیے اُس نے زور سے اللہ کو اپنی مدد کے لیے پکارا کیوں کہ اب وہی تھا جو اس شخص کے ناپاک ارادوں سے بچا سکتا تھا۔

وہ دیونما شخص جیسے جیسے اُس کے قریب آرہا تھا ویسے ہی نور کے دل کی دھڑکن سست ہو رہی تھی مگر پھر بھی اُس نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی عزت کو خطرے میں دیکھ کر جلدی سے پاس پڑاپانی کا جگ اٹھایا اور اسے دیوار میں مارتے قدر نوک دار حصہ اٹھا کر اُس شخص کے سامنے کیا جسے کچھ دیر پہلے تمہینہ بیگم

نے جانی کے نام سے پکارا تھا۔

”میرے قریب مت آنا ورنہ میں تمہاری جان لے لوں گی“، کانپتے ہاتھوں سے بامشکل شیشے کو سنبھالتے اُس نے اُس مضبوط جسم اور اوپنچے قد کاٹ کے شخص کو دھمکی دی جو اُس لڑکی پر پورے زور سے قہقہہ لگاتے ہنسا۔

”تو منع کس نے کیا ہے، میری تسلی، آؤ مارو مجھے“، جانی نے اُس کی بہادری پر جی جان سے متاثر ہوتے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کی تو نور نے اُس کی شکل سے کوفت محسوس کرتے اپنے ہاتھ میں کپڑا شیشے کا نوک دار کٹکڑا اُس کے بجائے اپنی طرف کیا۔

”دور رہو مجھ سے ورنہ میں اپنی جان لے لوں گی“، اپنے گلے پر رکھتے اُس نے ایک بے جان سی دھمکی دی جس پر جانی نے مزید اُس کی کوئی بھی بات سنے بغیر اُس کی جانب جھپٹا اور ایک ہی حملے میں شیشے کا کٹکڑا اپنے ہاتھ میں لے کر زمین پر پھینکا۔

”بہت اکٹھ ہے تم میں پر آج میں تمہاری خوب صورتی کو خراج تحسین پیش کرتے تمہاری ساری اکٹھ نکال دوں گا میری بلبل“، اُس کے بالوں کو سختی سے اپنی مٹھی میں دبوچے اُس نے نور کا چہرہ اپنے قریب کیا تو اُس نے جلدی سے اُس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

”پلیز تمہیں اللہ کا واسطہ مجھے چھوڑ دو“، آنکھوں میں ابلتنے گرم سیال کو بہاتے (جو اُس کے چہرے کو ترکر چکا تھا) اُس نے جانی کو ایک انسان سمجھ کر اُس کی منت کی پروہ اس بات سے ناواقف تھی کہ اس جگہ بسنے والے لوگ یہاں آتے ہی حیوان بن جاتے ہیں۔

”زیادہ بک کرنے کی ضرورت نہیں ہے میرے سامنے“، بالوں سے کپڑے اُس نے اُسے بیڈ پر اچھالا تو وہ منہ کے بل بیڈ پر جا گری اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر سیدھی ہوتی وہ شخص اُس کے اوپر کسی جانور کی مانند جھپٹا۔

”میں تمہارا منہ توڑ دوں گی غلیظ انسان، اللہ میری مدد کر،“ زور زور سے چیختے اور روتے ہوئے اُس نے فریاد کی تو اُس کی چیختے چلانے کی آواز سنتے تہمینہ بیگم کسی خطرے کا احساس دل میں لیے اور آئیں اور دروازے کو اندر سے بند کیجھ ان کے حواس خطا ہونے لگے۔

”جانی منہوس مارے دروازہ کھول میں نے تجھے اس طرح اکٹ رکھنے کا نہیں کہا تھا،“ تہمینہ بیگم نے دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارتے ساتھ ہی اُسے پکارا جو اس وقت وحشی بنانور پر جھپٹا پر اُسی وقت تہمینہ بیگم نے اپنے دوسرے دو ملازموں کو آواز دیتے دروازے کا لاک توڑنے کا کہا۔

”منہوس انسان پیچھے ہٹ، کیا تو زین صاحب کو نہیں جانتا؟ جو اس طرح ان کے حق پر ڈال کا ڈالنے لگا تھا،“ اندر داخل ہوتے ہی اُس نے جانی پر جھٹپٹے اُسے نور کے اوپر سے ہٹایا جو کسی شیر کی مانند اسے نوج رو ہاتھا۔

”پرے ہٹ منہوس انسان،“ نور کو سیدھا کرتے اُس نے جانی کے ایک ٹانگ رسید کی جو ہوش میں آتے ہی جلدی سے بیڈ سے اٹھا۔

”کیا ہوا باجی اور تو نے خود ہی تو کہا تھا کہ اس کی اکٹ رکال دے،“ جانی نے اُس عورت کے سامنے ہاتھ باندھے تابعداری کا مظاہرہ کیا تو نور کو خوف سے کانپتا دیکھ کر اُس نے غصے سے جانی کے گال پر ڈوچھڑ جڑے۔

”مرجا تو منہوس مارے تجھے نہیں پتا تھا کہ یہ زین صاحب کی ملکیت ہے اور جب تک وہ اسے خود استعمال نہیں کریں گے کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیں گے اور اب اگر انھیں پتا چل گیا کہ تو نے ان کی تتنی کو ان سے پہلے چھو نے کی کوشش کی ہے تو خود سوچ لے کہ وہ تیرا کیا حشر کریں گے،“ ایک کے بعد ایک تھپڑ مارتے وہ ساتھ ساتھ اسے کوستے باہر کی جانب لے گئیں اور ان کے ساتھ ہی دوسرے دو مرد بھی ایک لپچاتی نظر نور پر ڈالتے (جو اٹھ کر بیٹھتے اپنا اس کارف اپنے اوپر لے چکلی تھی) تہمینہ بیگم کے ڈر سے فوراً ان

کے پیچھے باہر کی جانب بڑھے تو نور نے ہوش میں آتے اپنی ٹانکیں سمیٹنے سرگھٹنوں پر رکھا۔

”یا اللہ مجھے اس دلدل سے نکال اب تو ہی ہے جو میری مدد کر سکتا ہے، آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر لیے اُس نے دل میں پوری شدت سے اپنے رب کو پکارا۔

”مجھے کبھی ذلت مت دینا اللہ پاک کیا میں اس قابل ہوں کہ تو مجھے اتنی ذلت دے، کیا ساری زندگی میں نے کوئی ایک نیکی بھی ایسی نہیں کی جس کے بد لے تو مجھے یہاں سے نکال دے۔ میں تجھ سے اپنی عزت کی حفاظت کی دعا کرتی ہوں مجھ پر حرم کر مولا،“ اتنے خوفناک منظر کے بعد نور نے پوری شدت سے ز میں پھٹ جانے کی دعا کی تاکہ وہ مزید کسی آفت سے پہلے اُس میں دفن ہو سکے۔

جانی کی اچھی خاصی دھلائی کے بعد تہمینہ بیگم نے اُسے وہاں سے دفع کیا تو وہ اتنا اچھا شکار ہاتھ سے نکل جانے پر افسوس سے سر جھکتے اپنا دل بہلانے کے لیے تہمینہ بیگم سے نظر بچا کر شمع کے کمرے کی جانب بڑھا۔

”اس منحوس کا دماغ بہت اوپھی چھلانگیں مارنے لگا ہے اس لیے اس کو کچھ دن کے لیے سلطان کے پاس بھیج دوتا کہ وہ اچھی طرح اس کا دماغ ٹھیک کر سکے،“ جانی کی ہوشیاری پر اُس پر لعنت بھجتے تہمینہ بیگم نے شیرے کو ہدایت دی اور پان دان سے پان نکال کر اپنے منہ میں رکھتے اُن دونوں کور کنے کا اشارہ کرتے اپنی بات کو جاری رکھا۔

”تم دونوں بھی کان کھول کر سُن لو اگر کسی نے زین صاحب کے آنے سے پہلے اُس لڑکی کو ہاتھ لگایا ایسا کے کمرے میں گئے تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا، میں تم لوگوں کا وہ حشر کروں گی کہ ساری عمر یاد رکھو گے،“ تہمینہ بیگم نے نور کو دیکھ کر ان کی راں ٹیکتے دیکھتی سے تنبیہ کی تو وہ زین کا نام سنتے ہی تابعداری سے سر ہلانے لگے۔

”جی با جی ٹھیک ہے پر زین صاحب کے بعد تو ہمیں چانس ملے گانا؟“ شیرے نے اُس کی بات

ستے ہی دانت دکھائے۔

”ہاں مل جائے گا اگر زین صاحب نے اُسے زندہ چھوڑا تو اور اب یہاں کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو، جاؤ یہاں سے اور آج دو پھر کے پروگرام کی تیاری کرو“، اُن دونوں کو وہیں جماد لیکھ کر تہمینہ بیگم نے غصے سے کہا اور اپنی نو کرانی کو آواز لگائی جو پلک جھکتے ہی اُس کے سامنے حاضر ہوئی۔

”جی باجی بولیں کیا حکم ہے چنیلی کے لیے؟“، ہاتھ باندھے اُس نے اپنے بالوں کو ایک ادا سے پیچھے کیا۔

”میرے لیے گرم گرما اور کٹک سی چائے بنانا کر لاء، تو بے صحیح ہی دماغ کی دہی کر دی اس منحوس مارے جانی نے“، چنیلی کو حکم دیتے تہمینہ بیگم نے اپنی پیشانی کو مسلا تو وہ ”جی ابھی لائی“ کہتے گنگنا تے ہوئے کچن کی جانب بڑھی۔



زارون اور ساجدہ بیگم کے جانے کے بعد سکندر صاحب کی طبیعت کافی خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ سے حارت نے حاشر یا فریحہ بیگم کو کچھ کہنے سے اپنے آپ کو باز رکھا پر اب سکندر صاحب کی طبیعت سنبھلتے ہی اُس نے حاشر کو جا گھیرا جو اس وقت اپنے کمرے میں فیکٹری جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

”آ جائیں“، بالوں میں برش پھیرتے اُس نے دستک کی آواز پر اجازت دیتے منتظر نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

”بھائی آپ؟ خیریت ہے، ابو ٹھیک ہیں؟“، حارت جورات سکندر صاحب کی طبیعت کی وجہ سے اُن کے پاس ہی سویا تھا اُسے صحیح اپنے کمرے میں دیکھ کر حاشر کو لگا کہ شاید سکندر صاحب کی طبیعت خراب ہے تب ہی اُس نے فلکر مندری سے پوچھا اور برش رکھتے اُس کے قریب آیا۔

”ہاں ابو ٹھیک ہیں پر مجھے تمہارا دماغ ٹھیک نہیں لگ رہا تب ہی تم سے بات کرنے آیا ہوں“،

، صوفے پر بیٹھتے اُس نے اُسے اپنے ساتھ ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا تو حاشرنا سمجھی سے اُس کی طرف دیکھتے بیٹھ گیا۔

”میرے دماغ کو کیا ہوا ہے؟ اور کس بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟“ حاشر نے ابرو اچکاتے سوال کیا تو حارث نے اپنے لبھ کو نرم کیا۔

”میں نور کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں اور پلیز میری پوری بات سننے کے بعد کچھ کہنا،“ اُسے بولنے کے لیے منہ کھولتا دیکھ کر حارث نے ٹوکا تو حاشر نے خاموشی اختیار کی۔

”ٹھیک ہے بولیں میں سُن رہا ہوں،“ ہتھیار ڈالتے اُس نے سوالیہ نظر وہ سے اُسے دیکھا جوبات کے آغاز کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا۔

”دیکھو حاشر جو ہوا اُس میں نہ ہی ہمارا بس تھا اور نہ نور کا اگر ہمارے ساتھ دھوکا ہوا تو دھوکا تو اُس نے بھی کھایا، تم نے سُنا تھا کہ زارون نے خود اپنی زبان سے بتایا تھا کہ اُس نے نور کے ساتھ زبردستی نکاح کیا اُس میں اُس کی مرضی شامل نہیں تھی،“

”تو مر جاتی پر اُس شخص کی زبردستی پر کبھی لبیک نہ کہتی اور کون سی زبردستی بھائی؟ نکاح پر دستخط تو نور نے اپنے ہاتھوں سے کیے تھے نا؟ کون سا کسی نے ہاتھ پکڑ کر خود سے کروالیے اور وہ کیا چھوٹی پچھی تھی جس نے ہم میں سے کسی کو بھی اس بات کی بھنک تک نہیں پڑنے دی اور اوپر سے غصب یہ کہ دوسرے نکاح کے لیے بھی تیار ہو گئی،“ حاشر نے اُس کی بات سنتے ہی اپنے غصے کو ضبط کرتے طنز کیا۔

”ہم بچی نہیں تھی پر کیا ہم نے اُسے بڑا ہونے دیا؟ کیا ہم نے اُسے دنیا کے ساتھ چلنے سکھایا؟ کیا ہم نے اُسے یہ سمجھایا کہ اس دنیا میں انسانوں کے علاوہ کچھ حیوان بھی بستے ہیں؟ کیا ہم نے کبھی اُسے خود سے اتنا قریب ہونے دیا کہ وہ بلا جھجھک ہمیں یہ بات بتا دیتی اور کیا حاشر کبھی ہم نے اُسے اتنی ہمت دی کہ وہ اس طرح کے حالات کا مقابلہ کر سکتی یا کوئی تیزی دکھاتے وہاں سے نکل آتی یا پھر ڈٹ کر اُس شخص

کا مقابلہ کرتی۔ افسوس ہم ان میں سے کچھ بھی اپنی بہن کو نہ دے سکے بچپن سے لے کر اب تک ہم نے اُسے بس دنیا سے ڈرنا، رونا یا پھر سہم کر گھر کے کسی کو نے میں بیٹھ جانا ہی سکھایا جو آج اس صورت میں ہمارے سامنے آیا تو ہم اپنی انا کا مسئلہ بنانے کا بول رہے ہیں کہ نور انکار کر دیتی، مر جاتی تو بتاؤ اپنی بیٹی کے لیے بھی یہی الفاظ استعمال کرو گے اگر زندگی میں کبھی اُس سے اس طرح کی غلطی ہو گئی تو؟، اپنی بات مکمل کرتے اُس نے حاشر کو خاموش چھوڑتے باہر کا رخ کیا تو ایک نامحسوس سی بے چینی نے حاشر کا احاطہ کیا جس کی وجہ سے وہیں بیٹھا حارث کی باتوں پر غور کرنے لگا جس نے ایک لفظ بھی غلط نہیں کہا تھا۔



بہت منتوں اور ڈاکٹر کے سمجھانے کے بعد خالدہ بیگم اپنا ہاتھ کٹوانے کے لیے تیار ہو گئیں کیوں کہ بازو کی طرف پھیلتے زخم اور اُس میں بڑھتے کیڑوں کی تعداد نے انہیں کوفت میں بنتا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے وجود سے نفرت پر مجبور کر دیا تھا وہ اب ہر وقت خاموش رہتیں اور سلیم صاحب اور جنید سے چھپ چھپ کر رو تیں اور ہر وقت اللہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگتے اپنی اذیت کو کم کرنے کی دعا کرتیں۔ ڈاکٹر نے آج کا وقت دیا تھا تب ہی سلیم صاحب، جنید اور دعا انہیں لے کر ہسپتال پہنچے تو وہاں ڈاکٹر ز اور نرسرز نے اُن کے زخم کو دیکھتے کانوں کو ہاتھ لگائے اور سب ہی اُن کے حالت پر توبہ کرتے کسی گناہ کی سزا ملنے کا کہتے پاس سے گزر جاتے کوئی بھی نرس اُن کو ہاتھ لگانے کے لیے تیار نہ تھی تب ہی دعا نے خود ہی سرجی کے وقت تک اُن کو سنبھالا اور ساتھ اُن کو سب ٹھیک ہو جانے کی تسلی دیتے حوصلہ دیا جو لوگوں کی نفرت آمیز رویے اور باتوں سے کافی دلبڑا شتہ ہو چکی تھیں۔

”امی پلیز روئیں مت لوگوں کو تو موقع چاہیے با تیں کرنے کا اور آپ فکر مت کریں دیکھیے گا اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا“، دعا نے انہیں آنسو بہاتا دیکھ کر تسلی دی تو خالدہ بیگم نے بیٹی کا ہاتھ پکڑتے ہمت کی اور دکھ میں آ کر اپنے اندر چھپے راز سے اُسے آگاہ کیا کہ کیسے انہوں نے سلنڈر کا وال

کھولا اور ملائکہ کو کس طرح ایک سازش کے تحت اپنی جلن اور غصے کا نشانہ بناتے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

”امی---، اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھڑواتے دعاء نے بے یقینی کی سی کیفیت میں خالدہ بیگم کی جانب دیکھا جو آج بستر مرگ پر قابل رحم حالت میں لیٹی اُسے اپنے گناہ کے بارے میں بتا کر ساتھ اللہ سے دعا کرنے کا کہہ رہی تھیں۔

”آپ اتنی سگندل ہو سکتی ہیں اور اس حد تک گرسکتی ہیں کہ اپنی جلن اور غصہ نکالنے کے لیے آپ نے ملائکہ کی جان لے لی جو آپ کے بیٹے کی جان تھی۔ امی کیوں کیا آپ نے ایسا؟ کیا کمی تھی ملائکہ میں اور آپ کا دل نہیں کانپا اُس معصوم کے ساتھ اتنا گھنا و ناکھیل کھلتے ہوئے؟“ دعاء ان کی حالت کی پرواکیے بغیر دکھ اور غصے کے ملے جلے تاثرات سے آنکھوں میں رحمدی کی کوئی بھی رقم ظاہر کیے بنا کھا تو خالدہ بیگم نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے جس پر نفرت سے ایک نگاہ ڈالتے وہ انہیں وہیں بلکتا، سکتنا ہوا چھوڑ کر باہر آگئی۔

اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اُس کی ماں اس قدر سگندل اور ظالم ہے کہ اپنے انتقام کے لیے کسی کی جان تک لے لی ”نہیں، میری امی ایسا نہیں کر سکتیں،“ آنکھوں میں آنسو لیے اُس نے وہیں دیوار کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ جو کچھ خالدہ بیگم نے اُس سے کہا وہ سب جھوٹ تھا۔



تمہینہ بیگم نے چائے پینے کے بعد چنبلی کے ہاتھ ہی نور کے لیے کھانا بھجوایا جو اُس نے کھانے کے بجائے غصے سے زمین پر پھینک دیا۔

”باجی وہ لڑکی تو بڑی نک چڑھی ہے اور آپ کیوں اُس کی اتنے نخرے برداشت کر رہی ہیں؟ میں

تو کہتی ہوں اچھا تھا کہ جانی اُس کی اکٹر نکال دیتا، چنیلی جونور کے چیخنے اور بد تمیزی کرنے پر کافی خفاظتی  
اُس نے آتے ہی تہمینہ بیگم کو مشورہ دیا جو اپنے تخت پر لیٹی تھیں۔

”ہاں اکٹر تو کافی ہے پر کیا کریں زین صاحب کی امانت ہے لائی (خدیجہ) انہی کے کہنے پر  
اسے یہاں تک لاٹی ہے اور اب جب تک اُن کی طرف سے کوئی نیا آرڈر نہیں ملتا میں اس تسلی کا کوئی  
علاج نہیں کرسکتی حالانکہ کل سے یہ جتنا اچھل رہی ہے نا اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو اب تک تہمینہ بیگم کے  
شرکی نظر ہو چکی ہوتی، اپنے پاؤں کی طرف اشارہ کرتے اُس نے دانت پیستے ہوئے اپنی بات مکمل کی  
تو چنیلی نے نرمی سے اُن کے پاؤں پر ہاتھ رکھتے دبانا شروع کیا۔

”پرباجی کچھ تو کریں تاکہ اس کی زبان تو تھوڑی بند ہو، دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارنے  
اور چلانے کی آواز پر کانوں پر ہاتھ رکھتے چنیلی نے کہا تو تہمینہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر  
ہلاایا۔

”ٹھیک ہے کرتی ہوں اس کا کچھ بندوبست، جاؤ ٹھہ میرا موبائل لا۔ میں زین صاحب کو فون کر  
کے پوچھوں، پاس پڑی باسکٹ میں تھوکتے اُس نے چنیلی کی بات پر غور کرتے حکم دیا جو پھر تی سے اُٹھ  
کر اُن کے کمرے کی جانب بڑھی۔



ساری رات نور کو ڈھونڈنے اور پولیس کے ساتھ شہر کا چپہ چپہ چھاننے کے بعد بھی جب کوئی ثبت  
سر ہاتھ نہ آیا تو زارون نے دی جان کے مسلسل فون کرنے پر تقریباً دو پھر تین بجے کے قریب گھر کا رخ  
کیا اور عالیاں بھی اُس کی حالت کے پیش نظر اُس کے ساتھ ہی اپارٹمنٹ آگیا جہاں ساجدہ بیگم فکر مندی  
سے اُن کے ہی انتظار میں پیٹھی تھیں۔

”زارون کیا ہوا ہے اور یہ تم نے اپنی کیا حالت بنائی ہوئی ہے؟“ اُسے بیرونی دروازے سے اندر

داخل ہوتا دیکھ کر ساجدہ بیگم نے چھٹری کے سہارے اُس کے قریب آتے پوچھا جس کے زرد پڑتے رنگ اور اجڑی ہوئی حالت نے انہیں مزید پریشان کیا۔

”نور کہاں ہے تم تو اُسے لینے گئے تھے؟“ اُس کے چہرے پر ہاتھ رکھتے جو بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا ساجدہ بیگم نے پھر سے سوال کیا۔

”چلی گئی ہے وہ مجھے دھوکا دے کر مجھے چھوڑ کر، دی جان وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی تو مجھ سے کہتی میں خوشی سے اُسے خود سے الگ کر دیتا مگر مجھے اتنی بڑی اذیت کیوں دی؟ کیوں کیا اُس نے میرے ساتھ ایسا؟“ زارون نے نور کے نام پر ایک دم سے چلاتے ان کا ہاتھ پکڑا اور نیچے زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

”مطلوب چلی گئی، کہاں چلی گئی؟“ بے یقینی سے اُس کی بات پر آنکھوں میں الجھن لیے انہوں نے سامنے کھڑے عالیان کی طرف دیکھا۔

”پتا نہیں دی جان، یونیورسٹی سے وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ گئی تھیں اور تب سے اب تک ان کا کچھ پتا نہیں موبائل بھی آف ہے،“ عالیان نے تفصیل سے ساری بات دی جان کو بتائی تو لڑکھڑا کے تھوڑا پچھے ہوئیں اور خود کو کھڑا رکھنے کے لیے صوف کا سہارا لیا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ نور بہت اچھی ہے مجھے لگتا ہے اُس کے ساتھ کوئی گیم کھیلا گیا ہے وہ ایسے کیسے کسی کے ساتھ جا سکتی ہے؟“ ساجدہ بیگم کا دل نور کے حق میں گواہی دینے لگا تو انہوں نے آگے بڑھتے زارون کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”گیم تو میرے ساتھ کھیلا گیا، میری زندگی کے ساتھ، میرے جذبات سے، مجھے کیوں نہیں سمجھ آئی کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے وہ مجھ سے کبھی محبت کیسے کر سکتی ہے؟ تو کیوں میں نے اُس کی محبت بھری با توں کا یقین کیا؟ کیوں میں نہیں سمجھا کہ وہ مجھ سے میری غلطی کا بدلہ لے گئی۔ وہ کیسے مجھے اتنی آسانی

سے معاف کر سکتی ہے؟ دی جان اُس نے مجھ سے بدلہ لے لیا اُس نے مجھے ایسی سزا دی کہ نہ ہی میرے پاس زندہ رہنے کی کوئی وجہ بچی ہے اور نہ ہی موت مجھے قبول کرے گی۔ دی جان کیوں کیا اُس نے ایسا؟ کیا قصور تھا میرا؟ میں تو اُس سے محبت کرتا تھا نا، آنکھوں میں ڈھیروں آنسو لیے اُس نے اپنے اندر کی تکلیف کو ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ذریعے باہر نکالا تو ساجدہ بیگم نے اپنے لخت جگر کی خوشیوں کو یوں منٹوں میں بر باد ہوتا دیکھ کر آہ بھری اور اسے سنبھالنے کی کوشش کی جو مسلسل چیختے ان کے اور عالیاں کے ہاتھوں میں بے قابو ہوتے خود اذیت کی انتہا پر پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

خالدہ بیگم کا ہاتھ کاٹ دیا گیا تھا اور دعا آپریشن ختم ہوتے ہی اپنی طبیعت خرابی کا بہانہ کرتے وہاں سے جا چکی تھی جو جنید اور سلیم صاحب دونوں کے لیے ہی حیران کن تھا مگر انہوں نے خالدہ بیگم کی حالت کے پیش نظر کسی بھی قسم کی کوئی بات کرنے سے گریز بر تھے خود کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ شاید ماں کی تکلیف کی وجہ سے دلبرداشتہ ہے اور ان کی بے بسی اور تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتی تب ہی یہاں سے چلی گئی۔ خالدہ بیگم کو ہوش آیا تو اپنے جسم کے ایک اہم حصے کو اپنے ساتھ نہ پا کر ان کے اندر اذیت کا ایک طوفان اٹھا تو گناہ کے احساس کو مزید شدید کرتے انہیں شرمندگی کی اتھا گہرا سیوں میں دھکلینے کے لیے کافی تھا۔

”کاش میں نے وہ سب نہ کیا ہوتا تو آج مجھے اتنی بڑی سزانہ ملتی، آنکھوں میں ندامت کے آنسو لیے انہوں نے جنید کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا جو دو دن سے دن رات ان کی خدمت میں لگا تھا۔

”میں نے اپنے بیٹے کی خوشیاں، اُس کی زندگی خود اپنے ہاتھوں سے بر باد کر دی پر ملائکہ نے تو مر کے بھی مجھ سے بازی لے لی۔ میں نے اُسے بس چند پل کی اذیت دی پر اللہ نے مجھے میرے گناہ کی سزا

کے طور پر پوری زندگی کی اذیت سے دو چار کر دیا ہے تاکہ میں ساری زندگی سک سک کر بھی اپنی موت کی دعا مانگوں اور دن رات اُسی اذیت کا مزہ چکھوں جس کا انتخاب میں نے ملائکہ کے لیے کیا تھا، آنکھیں بند کرتے آنسوؤں کو بہنے سے روکتے انہوں نے دل ہی دل میں کہا تو جنید نے اُن کے پاس آتے نرمی سے اُن کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔

”امی آپ ٹھیک ہیں نا؟ کہیں درد ہے تو بتائیں میں ڈاکٹر سے بول دیتا ہوں“، لمحے میں اُن کے لیے درد اور فکر مندی لیے اُس نے پوچھا تو خالدہ بیگم نے آنکھیں کھولتے نفی میں سر ہلا�ا۔

”مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے جنید اور نہ ہی میرے درد کا علاج اب کسی ڈاکٹر کے پاس ہے، اُس کے ہاتھ کو اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ میں لیتے خالدہ بیگم نے اجرٹی ہوئی بے جان سی آواز میں کہا۔

”امی آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا“، جنید کو لوگا کہ شاید وہ ہاتھ کی وجہ سے دلبڑا شتہ ہو رہی ہیں۔

”اللہ مجھے معاف نہیں کرے گا جنید وہ مجھے کیسے معاف کر سکتا ہے؟ وہ مجھے میرے کیے کی سزادے چکا ہے اور اس سے بدتر سزا کیا ہو گی کہ میں اپنی بقیہ زندگی ناصرف دوسروں کی محتاج رہوں گہ بلکہ لوگوں کی باتوں اور نفرتوں کا نشانہ بنتے یہ سنوں گی کہ اس عورت کو اپنے کسی گناہ کی سزا ملی ہے اور تمہیں پتا ہے؟ لوگ غلط نہیں کہتے، مجھے سچ میں اپنے گناہ کی سزا ملی ہے۔ مجھے تو اس سے بھی بدتر سزا ملنی چاہیے تھی کیوں کہ میں نے ایک بے گناہ معمصوم لڑکی کی جان لی ہے۔ ہاں میں نے قتل کیا ہے۔ تمہیں پتا ہے سلیم میں نے اپنے اسی ہاتھ سے سلنڈر کھولا تھا، میں نے اسی ہاتھ سے ملائکہ کے لیے موت کا گڑھا کھودا۔ میں نے سوچا میرا گناہ چھپ جائے گا کیوں کہ مجھے کسی انسان نے یہ سب کرتے ہوئے نہیں دیکھا پر میرا گناہ نہیں چھپا سلیم، کیوں کہ میں ایک بات بھول گئی تھی کہ مجھے تو وہ سب سے بڑی اور اعلیٰ ذات دیکھ رہی

ہے میرے ہر عمل پر نظر رکھے ہوئے ہے اور دیکھو آج اُس نے مجھے اس موڑ پر لاکھڑا کیا کہ میں نے اپنی زبان سے اپنے ظلم کا اعتراض کیا ہے۔ میں نے ملائکہ کو مارا اُسے وہ اذیت دینا چاہی جو آج میرے ہی نصیب میں لکھ دی گئی ہے، ان دونوں کو بے یقین اور ساکت کھڑا دیکھ کرو وہ زار و قطار رو نے لگیں تو جنید نے اپنا ہاتھ ہٹاتے

بے جان نظروں سے روتی بلکتی معافیاں مانگتی عورت کو دیکھا جو بد قسمتی سے اُس کی ماں تھی اور اُس کی مجرم بھی جسے وہ چاہ کر بھی سزا نہیں دے سکتا تھا۔

”اللہ نے مجھے سزادی ہے اُس نے مجھے میرے اُسی ہاتھ سے محروم کیا جس سے میں نے وہ گناہ کیا اور زندگی بھر کی اذیت میرے نام لکھ دی تاکہ میں پل پل سسکوں اپنی موت کی دعا کرو۔ سلیم اُس نے کیوں مجھے ایک ہاتھ سے محروم کیا؟ وہ مجھے میرے دونوں ہاتھوں، میری زبان اور آنکھوں سے بھی محروم کر دیتا، پھر مجھے ایک زندہ لاش کی مانند اس دنیا میں چھوڑتا تاکہ میرے جیسی بہت سی عورتیں جو اپنی بہوؤں کو آگ لگا دیتی ہیں اپنی جلن اور غصے میں کسی معصوم کی جان لے لیتی ہیں، مجھے دیکھ کر عبرت حاصل کرتیں، سیکھتیں کہ یہ دنیا مکافات عمل ہے جس نے جو کیا اُس نے بھر کر ہی قبر میں جانا ہے، کیوں اُس نے مجھے اتنی چھوٹی سزادی؟ کیوں اللہ نے مجھے عبرت کا نشان نہیں بنایا؟ کیوں اُس نے مجھے بس معمولی سی اذیت دی؟ وہ مجھے معاف نہیں کرے گا جنید میں نے خون کیا ہے، بلکہ قتل کیا ہے، میں نے تمہاری ملائکہ کو مار دیا۔ میں نے اپنے ان ہاتھوں سے تمہاری زندگی تباہ کی ہے، مسلسل چیختے جہاں وہ اللہ کے عذاب سے ڈر کر سب کچھ اگل رہی تھیں وہیں اُن کی باتیں سنتے سلیم صاحب نے جنید کو سنبھالا جو زرد پڑتے بس گرنے کے قریب تھا۔

”امی۔۔۔ آپ ک۔۔۔ کیا۔۔۔ بول۔۔۔ رہی۔۔۔ ہیں؟ آپ نے کیوں ملائکہ۔۔۔؟“ جنید کا دماغ درد سے پھٹنے لگا تو اُس نے سلیم صاحب کا ہاتھ جھٹکتے، خالدہ بیگم کو دونوں بازوؤں سے پکڑتے

چھنچھوڑا جوا پنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو رہی تھیں۔

”ہاں میں ۔۔۔ سچ ۔۔۔ بو ۔۔۔ ل رہی ہوں، ہا۔۔۔ ل میں ۔۔۔ نے ل ۔۔۔ ی ہے جان ۔۔۔ ہاہاہا میں نے ل ۔۔۔ ی ہے میں نے ۔۔۔ ملائکہ کو ۔۔۔ مار دیا“، رونے کے بجائے اب ہنسنے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر سے اپنے جرم کا اعتراف کیا تو جنید نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بالوں کو جکڑا اور وہیں زمین پر بیٹھتا چلا گیا ایک بے یقینی اور دکھ کی کیفیت اُس کے دل و دماغ پر حاوی ہونے لگی جو سلیم صاحب کے چیخنے اور پکارنے سے بھی نہ ٹوٹی جو خالدہ بیگم کے ناک، منہ اور کانوں سے خون نکلتا دیکھ کر مسلسل اُسے آوازیں لگاتے ڈاکٹر کو بلا نے کے لیے دوڑے۔

☆☆☆

زاروں کی حالت سنبھلی تو وہ ساجدہ بیگم کے کہنے پر اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔

”دی جان میں کچھ دیر میں آتا ہوں آپ پلیز زاروں کا خیال رکھیے گا“، عالیان نے اپنے موبائل پر مسلسل آتی کال کو تیسری بار بند کرتے کہا تو ساجدہ بیگم نے اثبات میں سر ہلاتے اُسے جلد واپس آنے کی تلقین کی۔

”جی بس میں کچھ دیر میں آتا ہوں، آپ اپنا اور زاروں کا خیال رکھیے گا“، انہیں تسلی دیتے وہ بیرونی دروازے سے باہر نکلا تو دی جان نے رشیدہ کو آواز لگاتے دروازہ بند کرنے کا کہا اور زاروں کے کمرے کی جانب بڑھیں جہاں وہ زمین پر ہی بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

”زاروں“، دی جان نے اُس کے قریب بیٹھتے نرمی سے مخاطب کیا تو اُس نے سر اٹھاتے بے جان نظر وہ سے انہیں دیکھا اور کسی بچے کی مانند اپنا سر اُن کی گود میں رکھتے اپنی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کی۔

”دی جان کیا میں اتنا برا تھا کہ اُس نے میرے لیے اتنی بڑی سزا کا انتخاب کیا؟ وہ مجھے زہر دے

دیتی، جان سے مار دیتی تو شاید مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اُس کے نظروں سے اوچھل ہونے سے ہو رہی ہے، سرخ آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو ایک بار پھر سے روکتے اُس نے شکوہ کیا تو دی جان نے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے اُس کے سر پر بوسہ دیا۔

”زارون تمہیں پتا ہے بعض دفعہ انسان کی آنکھیں دھوکا کھا جاتی ہیں اُسے جو نظر آتا ہے حقیقت اُس کے بر عکس ہوتی ہے، ہو سکتا ہے اس بار تمہاری آنکھیں تمہیں دھوکا دے گئی ہوں اور کہانی کا جو پہلو تمہیں دکھایا گیا وہ غلط ہوا اور جو تمہاری نظروں سے اوچھل رکھا گیا وہ صحیح ہو، اس لیے اپنے دماغ کے بہکاوے میں آ کر کوئی ایسی بات خود سے اخذ مت کرنا جس پر ساری عمر تمہیں پچھتنا پڑے اور کیا تمہیں لگتا ہے کہ نور ایسا کرسکتی ہے وہ تمہیں چھوڑ سکتی ہے؟“ اُس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنے سامنے کرتے انہوں نے تصدیق چاہی تو زارون نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”وہ کرسکتی ہے دی جان کیوں کہ میں نے اُس سے اُس کے اپنوں کو دور کیا۔ وہ کہتی تھی کہ وہ مجھے معاف نہیں کرے گی مجھ سے بدلہ ضرور لے گی اور دی جان اُس نے ویسا ہی کیا اُس نے مجھے اُس وقت منہ کے بلگرا یا جب مجھے اعتبار ہو گیا کہ اب وہ میری ہے، ان کا ہاتھ پکڑتے اُس نے اپنی آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں کو بہنے دیا۔

”کیوں تمہیں معاف نہیں کرے گی تم دونوں نے تو مرضی سے نکاح کیا تھا ناپھر یہ شکوہ کیسا؟“

”مرضی میری تھی نور کی نہیں میں نے یونیورسٹی میں اُس سے گن پوائنٹ پر نکاح کیا تھا کیوں کہ میں اُسے کھونا نہیں چاہتا تھا“، ان سے نظریں ملائے بغیر زارون نے ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پوری بات تفصیل سے بتائی (کہ کیسے اُس نے نور سے نکاح کیا اور عین نکاح کے وقت جا کر اُسے سارے گھروالوں کی نظروں میں گرا کر یہاں اپنے ساتھ لایا) تو دی جان نے پلک جھکتے اُس کی جانب دیکھا جواب تک ان سے اتنی بڑی بات چھپائے ہوئے جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا تھا۔

”ہم تو پھر تو اُس کی نفرت لازم ہے کیوں کہ تم نے اُس کے جذبات کے ساتھ ساتھ اُس کا بھروسہ اعتبار اور سالوں سے بنی عزت کو خاک میں ملا دیا۔ بے شک اُس کے والد اُس سے محبت نہیں کرتے تھے اُسے وہ مان، وہ حق نہیں دیتے تھے جو ایک بیٹی کو ملتا ہے پر کم از کم نور کی ان کی نظر وہ میں کوئی تھی جواب تک اُسے اپنے ساتھ اپنے سامنے گھر میں رکھے ہوئے تھے۔ بے شک وہ بات نہیں کرتے تھے پر ایک بیٹی کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ اُس کا باپ اُس کے سامنے ہے وہ اُسے دیکھ سکتی ہے۔ تم نے بہت بُرا کیا زارون بہت زیادہ، اگر تمہیں نور پسند تھی تو میرے لعل مجھ سے کہتے میں ان لوگوں کے پاؤں پکڑ لیتی منت کر لیتی، تمہیں پتا ہے نا تمہاری دی جان تمہارے لیے اپنی جان بھی دے سکتی ہیں تو کیوں تم نے ایک لڑکی کی زندگی بر باد کی؟“ ساجدہ بیگم نے زارون کی بات سنی تو انہیں سمجھ آیا کہ کیوں وہ یہ سب کہہ رہا ہے۔

”میں مانتا ہوں میں نے غلطی کی پردی جان اُس وقت میں اپنی ضد اورانا کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا مجھے لگا کہ وہ صرف میری ہے اور میں اُسے چھین کے حاصل کروں یا زبردستی اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں خود غرض ہو گیا تھا یا اپنے دل کے ہاتھوں مجبور جوانجام کا سوچے بغیر ہی اتنا کچھ کر گیا“، زارون نے ندامت سے نظریں جھکائیں تو دی جان نے اُس کی حالت دیکھتے اپنے لہجے کو نرم کیا کیوں کہ یہ وقت غصے کا نہیں تھا۔

”انسان غلطی کا پتلا ہے اگر وہ غلطیاں نہ کرے تو فرشتہ کھلانے اور اگر غلطی کر کے سبق نہ سیکھے تو جیوان، اس لیے تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا یہی بڑی بات ہے بس اللہ سے بھی معافی مانگو کہ تم نے ایک انسان کا دل دکھایا اور نور کو ڈھونڈنے کی کوشش کرو کیوں کہ مجھے نہیں لگتا کہ وہ تمہیں چھوڑ کر جا سکتی ہے اور اگر گئی بھی ہے تو تم اُس کے محروم ہو تمہیں اُسے اکیلے نہیں چھوڑنا، جب تک وہ تمہارے نکاح میں وہ تمہاری ذمے داری ہے اس لیے ہمت کرو اور ہو سکتا ہے جو تم سوچ رہے ہو ایسا کچھ ہو ہی نہ اور تم دونوں

کی اسی کمزوری کا کسی نے فائدہ اٹھایا ہو، دی جان نے بہت گہرائی میں جاتے زارون کو سمجھانے کی کوشش کی جس کا ذہن ان کی بات سنتے ہی فوراً سے اُس شام کی طرف گیا جب نور کو کسی نے اُس کے ہی گھر میں گھس کر نقصان پہنچایا تھا۔

”زارون میرا دل نہیں مانتا کہ نور تمہیں چھوڑ سکتی ہے۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں تمہارے لیے پیار دیکھا ہے۔ بے شک تم نے جو بھی کیا تھا پر مجھے وہ ایسی لڑکی نہیں لگتی کہ اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور جائے اور جاتا وہ ہے جس کا کوئی آسرا اور سہارا ہو جسے پتا ہو کہ وہ ایک ٹھکانے سے نکل کر آسانی سے کسی دوسری جگہ جا بسے گا پر نور کی واپسی کے تمام دروازے تو تم نے اپنے ہی ہاتھوں سے بند کر دیے تو اب یہ بے اعتباری کیسی؟ یہ سوچ کیوں؟ کیا تمہاری محبت اتنی کمزور تھی زارون جو تم نے اتنی جلدی ہار مان لی تھم نے اتنی جلدی یقین کر لیا کہ وہ تمہیں چھوڑ سکتی ہے؟“ دی جان نے بہت نرمی کے ساتھ اُس کے دماغ کے بند درپچوں کو کھولا جس پر کچھ دیر پہلے دکھا اور بے اعتباری کی کیفیت حاوی ہو چکی تھی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، پتا نہیں کیوں میرے دماغ میں یہ سوچ آئی،“ ان کی باتوں کو توجہ سے سنتے زارون نے اپنی آنکھوں کو رگڑا اور پھر سے باہر کی جانب بڑھا تو ساجدہ بیگم نے اُسے مخاطب کیا۔

”اب کہاں جا رہے ہو؟“

”نور کو ڈھونڈنے اگر وہ مجھ سے ناراض ہو کر یا بدله لینے کے لیے بھی کہیں گئی ہے تو مجھے اُسے ڈھونڈنا چاہیے کیوں کہ میری نہ تو محبت کمزور ہے اور نہ میں خود،“ پلٹے بغیر ہی جواب دیتے وہ بیرونی دروازہ کھولتے باہر نکل گیا تو دی جان نے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے زارون کے ذہن کو جلد ہی ان خدشات سے پاک کر دیا۔



رات کا اندر ہیرا پھر سے چھانے لگا تو اس غلیظ جگہ پر ایک اور رات کا تصور نور کی روح فنا کرنے

لگا اور آنسو ایک بار پھر سے اپنی بے بسی پر آنکھوں کے بند توڑتے بہہ نکلے۔

”یا اللہ میری مدد کر، میں کچھ دیر مزید یہاں رہی تو شاید زارون بھی مجھے بھی قبول نہ کرے، میرے پاس تو پہلے ہی کوئی رشتہ، کوئی اپنا نہیں بچا ایک آخری امید وہ انسان ہے وہ بھی مجھ سے بدگمان ہو گیا تو میں کہاں جاؤں گی؟“، دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپاتے وہ پھر سے سکنے لگی تو کسی نے دھڑام سے دروازہ کھولا اور ساتھ ہی تہمینہ بیگم اندر داخل ہوئیں۔

”یہ کیا تم بار بار خرے دکھار ہی ہوا اور کھانا کیوں نہیں کھایا؟“، چنیلی کوڑے سائیڈ ٹیبل پر رکھنے کا اشارہ کرتے اُس نے نور سے پوچھا جواب آنکھوں میں غصہ لیے تہمینہ بیگم کو گھور رہی تھی۔

”میں حرام طریقے سے کمایا ہوا رزق نہیں کھاتی“، حقارت سے جواب دیتے نور نے نظریں پھیریں تو تہمینہ بیگم کو توجیسے پنگے لگ گئے وہ کسی شکاری کی طرح اُس کے اوپر چھپٹی اور اُس کے بالوں کو اپنی گرفت میں قید کرتے چہرہ اپنے سامنے کیا۔

”کیا بکواس کی تم نے ابھی؟“، دانت پیسیتے اُس نے سختی سے نور کے بالوں کو دبوچا تو اُس نے بے خوف ہوتے اپنے الفاظ دوہرائے جس کو سنتے ہی تہمینہ بیگم نے ایک زور دار تھپٹر اُس کے گال پر رسید کیا اور ساتھ ہی اُس کے منہ کو اپنے سخت ہاتھ میں دبوچا۔

”یہ بکواس آج کردی ہے دوبارہ مست کرنا ورنہ میں تمہارا وہ حشر کروں گی کہ تم ساری زندگی میرے شر سے پناہ مانگو گی؟“، اپنے جبڑوں کو مضبوطی سے بند کرتے اُس نے نور کو دھمکی دی جوڑرے بغیر بے خوفی سے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے اُس کا ہاتھ جھٹک چکی تھی۔

”کھانا اٹھاؤ اور یہ پانی بھی، جب تک میں نہ کہوں اسے کچھ نہیں دینا“، زمین پر تھوکتے تہمینہ بیگم نے ایک حقارت بھری نظر نور پر ڈالی اور چنیلی کو حکم دیا جو فوراً سے سب سامان اٹھاتے اُن کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گئی۔

تہمینہ بیگم غصے سے بھری اپنے کمرے میں آئی تو ان کا موبائل نج رہا تھا جس پر زین کا نام دیکھتے ہی اُس نے چنیلی کو چپ رہنے کا اشارہ کرتے کال رسیو کی۔

”ہاں بولو کیا بات ہے کیوں بار بار فون کر رہی تھی تم؟“ زین نے دوسری طرف ہیلو کی آواز سننے ہی سختی سے پوچھا۔

”صاحب جی وہ لڑکی تو بڑی ڈھیٹ ہے جب سے آئی ہے مجھ سمتی سب لوگوں کی ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ چنیلی صح سے دوبار کھانا لے کر گئی پر ہاتھ مار کر سارا کھانا فرش پر گردادیا۔ کسی کی کوئی بات ہی نہیں سُن رہی،“ تہمینہ بیگم جو پہلے ہی بھری ہوئی تھیں انہوں نے ایک ہی سانس میں پوری بات بتائی۔

”وہ جو کرتی ہے اُسے کرنے دو اور کھانا کمرے میں رکھ دو اگر کھانا ہوا تو کھا لے گی باقی ابھی میں دو تین دن نہیں آسکوں گا اس لیے تمہیں اُسے کچھ اور دن اپنے پاس رکھنا پڑے گا جس کی منہ مانگی قیمت تمہیں مل جائے گی بس ایک بات کا خیال رکھنا اگر میرے آنے تک اُسے کچھ ہوا یا تم لوگوں میں سے کسی نے بھی زین کی امانت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا،“ دھمکی دیتے اُس نے تہمینہ بیگم کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کال کاٹ دی۔

”بیڑا غرق ہواں منہوس کا، کیسے بک بک کر کے اگلے بندے کی بات سنے بغیر ہی فون کاٹ دیتا ہے،“ موبائل بیڈ پر اچھا لئے تہمینہ بیگم نے زین کو ایک گالی دی تو چنیلی نے گلاس میں پانی ڈالتے اُسے تھما یا۔

”باجی غصہ نہ کریں آپ کو پتا ہے ناکل رات کا پروگرام ہمارے لیے کتنا اہم ہے اور اگر آپ کی طبیعت خراب ہو گئی تو سارا مزہ خراب ہو جائے گا،“ چنیلی نے آنکھوں میں فکر لیے تہمینہ بیگم کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جو پانی کے گھونٹ بھرتے زین کے آنے سے پہلے نور سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا ارادہ کر چکی تھی۔

”تو فکر نہ کر چنیلی کل کا دن ایسا ہو گا کہ اس نور کے ساتھ ساتھ زین صاحب بھی دنگ رہ جائیں گے، چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ سجاتے اُنہوں نے چنیلی کو آنکھ ماری جس نے ناجھی سے اُن کی جانب دیکھا۔ جو اسے اپنے پاس بٹھاتے دماغ میں چلتے پلان سے آگاہ کرنے لگیں تو اُن کے خوفناک ارادوں کو سُن کر چنیلی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”باجی اگر زین صاحب کو پتا چل گیا تو؟“ اُس کی پوری بات سنتے ہی چنیلی نے آنکھوں میں خوف لیے پوچھا۔

”تہمینہ بیگم نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھلیں، میں سب سے شاطر کھلاڑی ہوں اس کھیل کی جس میں زین صاحب ابھی نئے نئے داخل ہوئے ہیں۔ بس تم نے اپنا منہ بند رکھنا ہے، اُٹھ کر ڈریسینگ ٹیبل کے سامنے جاتے اپنی سرخ لپ اسٹک کو مزید گھرا کرتے اُس نے چنیلی کو تنبیہ کی جواب کسی گھری سوچ میں گم تھی۔



بی پی ہائی ہونے سے خالدہ بیگم کے دماغ کی نس پھٹ چکی تھی۔ ڈاکٹر زانہیں بچانے کی اپنی پوری کوشش کر رہے تھے پرجنید کے ساتھ ساتھ سلیم صاحب کے دل میں اب اُن کی زندگی کو لے کر کوئی خواہش باقی نہیں رہی تب ہی وہ اُن کی زندگی کے لیے فکر مند ہونے کے بجائے جنید کے قریب آبیٹھے جو تب سے خاموش بیٹھا خالدہ بیگم کے الفاظ پر غور کر رہا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے سلیم صاحب نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”یہی کہ اگر امی کو ملانکہ پسند نہیں تھی تو مجھے بول دیتیں۔ میں اُسے لے کر کہیں چلا جاتا اتنا بڑا ظلم کرنے کی کیا ضرورت تھی پر نہیں ابوغلطی ہماری ہے۔ ہم نے امی کی رائے کو فوکیت نہیں دی ہم نے اُن کو

پس پشت کرتے اپنی مرضی سے تمام فنصلے کر لیے کاش! ہم ایسا نہ کرتے، میں نے کیوں ملائکہ کو جانتے بوجھتے اس دلدل میں دھکیل دیا؟ کیوں میں اُس کی حفاظت نہیں کر پایا مگر میں حفاظت کرتا بھی تو کس سے اپنی ماں سے؟، سوالیہ نظروں سے اُن کی جانب دیکھتے وہ اُن کے جواب کا منتظر تھا۔

”صبر کرو بیٹا کیوں کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے اور ظالم کو اپنے کیے کی سزا ہر حال میں مل کر رہتی ہے۔ تمہاری ماں نے جو کچھ ملائکہ کے لیے سوچا آج اُس سے دگنی اذیت اُسے اپنی جان پر برداشت کرنی پڑ رہی ہے، پتا نہیں اُس کے پاس کچھ لمبھوں کا وقت ہے بھی یا نہیں اس لیے اُسے معاف کر دو بیٹا کیوں کہ اللہ پاک اُسے اپنے طریقے سے سزادے چکا ہے، سلیم صاحب نے کہتے ہوئے جنید کے آگے ہاتھ جوڑے۔

”ابو پلیز کیا کر رہے ہیں آپ، اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں اور امی نے جو بھی کیا اُس کا خمیازہ بھگلت چکی ہیں اس لیے میرے معاف کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور اگر پڑے گا تو میں نے انہیں معاف کیا، اُن کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو نیچے کرتے جنید نے بہت آہستگی سے اپنی بات مکمل کی اور اٹھ کر وہاں سے باہر نکل گیا۔



ساری رات اور اگلا دن پولیس کے ساتھ شہر کا کونا کونا چھاننے کے بعد بھی جب نور کا کوئی سراغ نہ ملا تو عالیان (جسے زارون نے فون کر کے بلا یا تھا) نے زارون سے گھر چلنے کا کہا مگر وہ کسی کی بھی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھا۔

”زارون میری بات مانو تو ہم گھر چلتے ہیں تم کچھ کھا پی لینا اور تھوڑی دری آرام بھی کر لینا مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی،“ عالیان نے کمزور سی مزاحمت کی۔

”مجھے کہیں نہیں جانا جب تک نور مل نہیں جاتی میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا،“ غصے سے اُس

کا ہاتھ جھکتے وہ پولیس والے کے بُلا نے پراؤں کی جانب بڑھا۔

”سر اگر آپ چاہیں تو ہم سر دخانوں میں۔۔۔“، اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا زارون نے اُس کا گریبان پکڑتے چھنجھوڑا۔

”دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟“، آنکھوں میں سختی لیے وہ چینا توڈی ایس پی صاحب جوتب سے اُن کے ساتھ تھے انہوں نے آگے بڑھتے زارون کو اُس سے الگ کرتے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”کیا ہوا؟“، سوالیہ نظرؤں سے امجد کی طرف دیکھتے انہوں نے معاملہ سمجھنے کی کوشش کی۔

”کچھ نہیں سر میں نے بس اتنا کہا کہ سر ہم سر دخانوں میں ایک بار دیکھ لیتے ہیں“، اپنی شرٹ ٹھیک کرتے امجد نے آہستگی سے اپنی بات دوہرائی۔ جس پر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے وہ زارون کی جانب بڑھے جو بار بار عالیان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر امجد کو مارنے کے لیے اُس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

”زارون پلیز ہوش سے کام لو اور امجد نے صرف ایک بات کہی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں باقی اگر تم نہیں دیکھنا چاہتے تو تمہاری مرضی ہے مگر میری اطلاع کے مطابق کچھ دیر پہلے ویرانے سے ایک لڑکی کی لاش ملی ہے اور بد قسمتی سے جو تم حلیہ بتا رہے وہ۔۔۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا میری نور زندہ ہے اُسے کچھ نہیں ہو سکتا آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی“، اب کی بار غصے کے بجائے بے یقینی کی سی کیفیت میں چلاتے زارون نے اُن کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹوکا۔

”مجھے امید ہے ایسا کچھ نہیں ہو گا مگر اس کے لیے تمہیں ہمارے ساتھ چلانا پڑے گا کیوں کہ لاش کو تیزاب ڈال کر جلا دیا گیا ہے اور پہچان کرنا مشکل ہے اس لیے ڈی این اے سیمپل کے ذریعے ہی پتا چلے گا کہ وہ لاش نور کی ہے یا نہیں“، بڑے تحمل کے ساتھ انہوں نے زارون کو سمجھایا جس کا وجود بالکل بے

جان ہو چکا تھا اور دل سے بس یہ دعا نکل رہی تھی کہ وہ نور نہ ہو۔

☆☆☆

”ڈاکٹر احمد آپ فری ہیں تو میں اندر آ جاؤں؟“ ڈاکٹر سہیل (احمد کا دوست اور کولیگ) نے دروازہ ناک کرتے دروازے سے سرنگا لتے اجازت طلب کی تو احمد نے اُسے گھور کر دیکھا۔

”شرم کریا رہ، تجھے کب سے میرے کمرے میں آنے کے لیے اجازت کی ضرورت پڑ گئی؟“ احمد جو کے کسی پیشہ کی فائل دیکھنے میں مصروف تھا اُس نے سہیل کو دیکھتے ہی خفگی سے کہا۔

”جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے قسم سے یار بیگانے سے لگنے لگے ہو؟“ سہیل نے اندر داخل ہوتے سامنے والی چیسر سنبھالتے اعتراض کیا۔

”ہونہہ بس کرو یا میں نے کوئی اپنی مرضی سے نہیں کی مجھ غریب پر تو ظلم ہوا وہ بھی اتنا شدید کہ میری آزادی کے ساتھ ساتھ مجھ سے میری مرضی بھی چھین لی گئی۔ میں نے امی سے اتنا کہا کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی پڑا تو میرا سکون راس ہی نہ آیا، کہتی بیٹا میری زندگی میں میری بہو گھر لے آؤ اور پھر ہونا کیا تھا یہ میں نے ہامی بھری ساتھ ہی امی نے ایک ہی مہینے میں لڑکی تلاش کرتے دوسرے مہینے میرے سر پر سہرا سجادیا،“ احمد جو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا سہیل کو دیکھتے ہی ایک ہی سانس میں اپنی پوری رو داد مرچ مسالہ لگاتے سنائی۔

”ہونہہ بس کرو یہ ڈرامے اور میرے سامنے زیادہ ناٹک کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے جھٹکتے سہیل نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔

”میں کہاں ناٹک کر رہا ہوں یار سچ میں پتا نہیں امی کے کس نے کان بھرے کہ انہوں نے میری شادی کرو کے ہی دم لیا اور نہ تو میں نے کبھی بھی تم سے پہلے شادی نہیں کرنی تھی،“ دونوں ہاتھ اپنے سر کے نیچے رکھتے وہ چیسر پر سکون ہو کر بیٹھا تو سہیل نے ٹیبل پر پڑی پنسل اٹھاتے اُس کا نشانہ لیا۔

”یار کیا ہے کیوں مجھ مسکین کو مار رہے ہو اب تمہاری شادی نہیں ہو رہی تو اس میں میرا کیا قصور،“  
احمد نے آنکھوں میں معصومیت سجا تے کہا تو سہیل نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”میں اس لیے ناراض نہیں ہوں،“ -

”تو؟“

”میں نے تمہیں پرسوں کال کی کہ میرے ساتھ چلو پرتم نے انکار کر دیا۔ کل کہا پھر بھی تم نے انکار کیا پر آج میں تمہیں ہر صورت اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا،“ سہیل نے کہنے کے ساتھ ہی اُس کی چیز کے قریب آتے اُس کا ہاتھ پکڑا۔

”جانا کہاں ہے؟“ احمد نے کھڑے ہوتے ہوئے ناجھی سے سوال کیا تو سہیل نے اُسے آنکھ ماری۔

”یار شرم کر اب میری شادی ہو گئی ہے اگر میری بیوی کو پتا چل گیا نا تو وہ مجھے جان سے مار دے گی،“ اُس کی مسکراہٹ سے اندازہ لگاتے احمد دوبارہ سے بیٹھ گیا۔

”شادی ہو گئی ہے تو کیا تم دنیا کی رنگینیاں دیکھنا چھوڑ دو گے اور یار بھا بھی کو کون بتائے گا، نہ ادھر ہمیں کوئی جانتا ہے نہ ہم کسی کو، تو بس بات ختم اب اُنھوں تمہیں پتا ہے نا مجھے تمہارے بغیر کوئی بھی پروگرام دیکھنے کا مزہ نہیں آتا،“ سہیل نے منت بھرے لہجے میں کہا تو اُس کا دل رکھنے کے لیے احمد نے ہامی بھری۔

”ٹھیک ہے چلوں گا پر ایک شرط پہ،“ احمد نے اُنھنے سے پہلے اُس کے خطرناک ارادوں پر لگام ڈالنا ضروری سمجھا۔

”کیسی شرط؟“ سہیل نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”یہی کہ ہم وہاں زیادہ دری نہیں رکیں گے اور اس بار نو ڈرنک، نوبتیزی،“ احمد نے اپنی شرط بتائی۔

تو سہیل نے بد مزہ ہوتے اُس کی جانب دیکھا۔

”اچھا ٹھیک ہے مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے بس تم میرے ساتھ چلو“، دوبارہ سے اُس کا ہاتھ پکڑتے سہیل نے کہا تو احمد نے اُسے دو منٹ رکنے کا کہتے اپنی گاڑی کی چابی اور موبائل انٹھایا اور اُس کے ساتھ ہی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا جس کا انتخاب آج سہیل نے کیا تھا۔

☆☆☆

زارون، ڈی ایس پی صاحب اور عالیان جب ہسپتال پہنچے تو اُس لاش کی شناخت ہو چکی تھی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا ناکہ یہ میری نور نہیں ہو سکتی۔ وہ یوں مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ وہ زندہ ہے“، زارون نے گھری سانس لیتے خود کو پر سکون کیا اور اپنے کانپتے ہوئے وجود کے ساتھ وہیں موجود چیز پر بیٹھ گیا تو عالیان نے اُس کے قریب آتے تسلی دی۔

”یار پلیز خود کو سن بھالو اور اٹھو گھر چلیں رشیدہ کا فون آیا تھا دی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے“، عالیان نے اُسے بتایا جو اُس کی بات سنتے ہی ہوش میں آیا۔

”کیا ہوا دی جان کو اور میرے نمبر پر کال کیوں نہیں کی؟“، زارون نے جلدی سے اپنا موبائل نکالتے سوال کیا۔

”اوہ یہ تو بند ہے لگتا ہے بیٹری لو ہے“، عالیان کے جواب سے پہلے ہی زارون نے موبائل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں اسی لیے رشیدہ نے میرے نمبر پر فون کیا بس اب چلو پولیس اپنا کام کر رہی ہے نا ان شاء اللہ بھا بھی جلد ہی مل جائیں گی“، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے عالیان نے یقین دہانی کروائی تو زارون نے نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی بات پر اثبات میں سر ہلا کیا اور دی جان کی طبیعت کی وجہ سے اُس کے ساتھ گھر کے لیے روانہ ہوا۔

کچھ دیر بعد وہ گھر پہنچے تو ساجدہ بیگم کی طبیعت کافی خراب تھی تب ہی عالیان نے احمد کو کال کی پر اُس نے اپنی شہر میں غیر موجودگی کا بتاتے اپنے کولیگ کو بھیجنے کا بولا۔

”ہاں یار بس اُسے کہو ذرا جلدی آجائے“، عالیان نے ایک بار پھر سے درخواست کی تو احمد نے اُسے تسلی دیتے فون بند کیا۔

”احمد تو یہاں نہیں ہے پر اُس کا کولیگ آرہا ہے وہ چیک کر لے گا“، زارون کو احمد سے ہونے والی بات کے متعلق آگاہ کرتے وہ خود بھی ساجدہ بیگم کے قریب بیٹھ گیا۔ اُن کے پاؤں رگڑتے گرم کرنے کی کوشش کرنے لگا جو شاید بی پی لو ہونے کی وجہ سے تختہ ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

”ہاں بس آرہا ہے“، عالیان نے اُسے تسلی دی اور رشیدہ سے کوئی کپڑا لانے کا کہا جو فکر مندی سے اُن کے قریب ہی کھڑی تھی۔

ٹھیک دس منٹ بعد ڈاکٹر پہنچا تو اُس نے ساجدہ بیگم کا تفصیلی چیک اپ کرتے اُن کا بی پی خطرناک حد تک گرنے کے متعلق بتاتے انہیں کچھ ضروری ٹریمنٹ دیا جس سے کچھ دیر میں ہی اُن کی طبیعت سن بھل گئی تھی۔

”دی جان اب کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ؟“، زارون جو تب سے اُن کے قریب ہی بیٹھا تھا اُس نے نرمی سے اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”ہم ٹھیک ہوں اب“، ساجدہ بیگم نے آنکھیں کھولتے اُسے مطمئن کیا جو پہلے ہی نور کے نہ ملنے سے کافی پریشان تھا۔

”لبس اب آپ انہیں آرام کرنے دیں اور بار بار مخاطب مت کریں“، ڈاکٹر نے ساجدہ بیگم کو انجیکشن لگانے کے بعد زارون کو ٹوکو جومز یہد کچھ پوچھنے والا تھا۔

”اگر دوبارہ ضرورت ہو تو یہ میڈ لیسن دے دیجیے گا اور اُن کے کھانے پینے اور آرام کا خاص خیال“

رکھیں کیوں کہ اس عمر میں بے احتیاطی انسان کو کسی بڑے مسئلے سے دوچار کر سکتی ہے، کچھ میدیڈ لیسن پپر پر لکھنے کے بعد عالیاں کی طرف بڑھاتے اُس نے ہدایت دی اور اجازت طلب کرتے وہاں سے چلا گیا۔ ”میں ابھی میدیڈ لیسن لے کر آتا ہوں،“ ڈاکٹر کے جاتے ہی عالیاں نے زارون سے کہا جس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”دنہیں تم رہنے دو میں اکرم سے منگوالوں گاتم جاؤ گھر جا کر آرام کرو کل سے میرے ساتھ ذلیل ہو رہے ہو،“ پپر اُس کے ہاتھ سے لیتے زارون نے رسیدہ کو دی جان کے پاس بیٹھنے کا کہتے باہر کا رخ کیا تو عالیاں بھی اُس کے پیچھے ہی کمرے سے نکلا۔

”خیر ہے یار میں ٹھیک ہوں اور دس منٹ لگیں گے میدیڈ لیسن لانے میں تو میں لے آتا ہوں،“ عالیاں نے ایک بار پھر سے مزاحمت کی۔

”دنہیں، بس تم جاؤ آرام کرو۔ صبح پھر سے تمہیں میرے ساتھ جانا ہے اور یہ میں اکرم سے منگوالیتا ہوں وہ نیچے ہی ہے،“ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے زارون نے نرمی سے کہا تو عالیاں نے اُسے کھانا کھانے کے ساتھ اپنا اور دی جان کا خیال رکھنے کا کہتے نور کے جلد مل جانے کی تسلی دی اور صبح جلد آنے کی یقین دہانی کرواتے وہاں سے چلا گیا۔ عالیاں کے جاتے ہی زارون نے گھر کے نمبر سے اکرم کو کال کر کے اوپر بلا یا جو اُس کا حکم ملتے ہی دو منٹ میں اپارٹمنٹ کے سامنے تھا۔

”جی سر آپ نے بُلا یا تھا؟“ احتراماً ہاتھ باندھے اُس نے زارون سے پوچھا۔

”ہاں یہ کچھ میدیڈ لیسن ہیں لے آؤ،“ پپر اُس کی طرف بڑھاتے زارون نے چند ہزار کے نوٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھائے جسے تھامتے وہ سر ہلاتے نیچے کی جانب بڑھا۔

”چھوٹے صاحب کھانالگا دوں آپ کے لیے؟“ رسیدہ جو اُس کے پیچھے کھڑی اکرم کے جانے کا انتظار کر رہی تھی اُس نے زارون کے پلٹنے ہیں سوال کیا۔

”نہیں مجھے بھوک نہیں ہے آپ بس دی جان کے پاس رہیں مجھے کچھ چاہیے ہوا میں خود لے لوں گا“، انکار کرتے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھاتا کہ موبائل چارج پر لگا سکتے تو رشیدہ بھی دی جان کے پاس ان کے کمرے میں آگئی جوان بھیکشن میں نشے کے زیر اثر سوچکی تھیں۔



حاشر کل سے ہی حارت کی باتوں پر غور کر رہا تھا اور آج بھی پورا دن سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ حارت کی تمام باتیں ٹھیک تھیں اگر نور کی جگہ اُس کی اپنی بیٹی ہوتی تو وہ اُسے بھی معاف کر دیتا تو پھر نور کو کیوں نہیں۔ ”بس میں آج ہی حارت سے کہوں گا کہ ہم نور سے ملنے جائیں گے اور تمام گلے شکوے دور کرتے اپنی بہن کو معاف کرتے اپنے ساتھ گھر لے آئیں گے تاکہ اپنے گھر سے اُسے پھر سے اُسی مان کے ساتھ رخصت کریں جس کی وہ حق دار ہے“، حاشر نے فیصلہ کن انداز میں خود کلامی کی اور اب اُسے انتظار تھا تو بس حارت کے والپس آنے کا۔ انہی سوچوں میں گم وہ ایک فالکھول کر اُسے دیکھنے لگا تو اُس کا موبائل نج اٹھا۔

”لوشیطان کو یاد کیا اور شیطان حاضر“، اسکرین پر حارت کا نام چمکتا ہوا دیکھ کر اُس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کال ریسیو کی۔

”حاشر کہاں ہوتا؟“، حارت نے سلام دعا کے بغیر ہی سوال کیا۔

”آفس ہوں، کیوں خیریت؟“

”ہاں خیریت ہی ہے میں نے صحیح تم سے کہا تھا کہ آج ابو کا چیک اپ ہونا ہے تو انہیں ٹائم سے ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑا بھی میں نے گھر فون کیا تو راحیل نے بتایا کہ تم تو ابھی تک گھر ہی نہیں آئے“، حارت نے اُسے یاد دہانی کروائی۔

”اُفف بھائی میں بھول گیا تھا بس میں ابھی نکلتا ہوں آپ فکر نہ کریں“، گاڑی کی چابی اٹھاتے

ساتھ اُس نے حارث کو تسلی دی جس نے اُسے جلدی گھر پہنچنے اور سکندر صاحب کا ٹھیک سے چیک اپ کروانے کی ہدایت کرتے اپنی واپسی کے متعلق بتایا جو کل تک متوقع تھی۔

”ٹھیک ہے میں دیکھ لوں گا آپ پریشان نہ ہوں،“ حاشر نے اُس کی ہدایت سننے کے بعد گاڑی میں بیٹھتے ایک بار بھر سے اُسے مطمئن کیا جو اُس کی لاپروا طبیعت کی وجہ سے اچھا خاص اتنگ تھا۔

☆☆☆

”باجی میں کب سے اُس لڑکی کو تیار کرنے کی کوشش میں لگی ہوں پرمجال ہے کہ وہ میری کوئی بات مانے،“ شبنم نے نور کے کمرے سے نکلتے خفا ہوتے تہمینہ بیگم کو بتایا جو آج کے پروگرام کے لیے بالکل تیار اپنے تخت پر بیٹھی چینیلی سے نیل پالش لگوانے میں مصروف تھیں۔

”ہاں تو میں نے تجھے کہا تھا کہ نصیبو کو اپنے ساتھ لے کر جانا پر تجھے ہی تھا کہ نہیں میں اکیلی ہی کافی ہوں،“ تہمینہ بیگم نے زمین پر تھوکتے شبنم کو آڑ رے ہاتھوں لیا جو کچھ ہی دیر پہلے بڑی تیزی دکھار ہی تھی۔

”باجی مجھے کیا پتا تھا کہ یہ لڑکی نہیں چڑیل ہے قسم سے دیکھیں کیسے ناخن مارے ہیں میرے،“ اپنا بازو سامنے کرتے شبنم نے دکھی ہوتے ہوئے کہا تو چینیلی اُس کی مسکین صورت دیکھ کر ہنسی۔

”اچھا ہی ہوا تیرے ساتھ بڑا پھیل رہی تھی ناکہ میں اکیلی سب کرلوں گی اور باجی کی بات سے انکار کرو گی تو اُس کا نتیجہ براہی نکلے گا،“ اپنے دانتوں کی نمائش کرتے چینیلی نے تہمینہ بیگم کو مزید تپایا۔

”تو زیادہ بک بک نہ کر،“ شبنم نے آنکھیں مٹکائیں تو تہمینہ بیگم نے اُن دونوں کو غصے سے گھورا۔

”تم دونوں ہی اپنی بکواس بند کرو اور جا کر اُس لڑکی کو تیار کرو کیوں کہ آج تہمینہ بیگم اُسے پورے شہر کے امراء کے سامنے پیش کرنے کے علاوہ اُس کی بولی لگوانے کا بھی ارادہ رکھتی ہیں اسی لیے میں نے کچھ خاص مہمانوں کو بھی آج کے پروگرام میں مدعو کیا ہے تاکہ اس کی بد تمیزیاں برداشت کرنے کا ہمیں کوئی توفائدہ ہو،“ آنکھوں میں انتقام کی جلن لیے تہمینہ بیگم نے اُن دونوں کو جانے کا اشارہ کیا جو اثبات

میں سر ہلاتے پھرتی سے اوپر کی جانب بڑھیں تاکہ تمہینہ بیگم کا مود خراب ہونے سے پہلے نور کو تیار کر سکیں۔



”اُف ایک تو یہ حارت اگلے بندے کے پیچھے ہی پڑ جاتا ہے، سارے راستے اُس کا لیکھر سننے کے بعد حاشر نے گاڑی گیٹ سے باہر ہی کھڑی کر دی تاکہ دوبارہ سے باہر نکالنے میں ٹائم ضائع نہ ہوا اور خود سکندر صاحب کو لینے بیرونی دروازے سے گزرتے اُن کے کمرے کی جانب بڑھا پر اُس سے پہلے ہی فریجہ بیگم حال بے حال دوڑتی ہوئی اُس کے قریب آئیں۔

”کیا ہوا پھوپھو سب خیریت ہے نا؟“ حاشر کو اُن کی حالت دیکھ کر کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا پر فریجہ بیگم کے چیخنے اور رونے سے وہ احساس یقین میں بدل گیا۔

”پھوپھو کیا ہوا ہے؟ ابو ٹھیک ہیں نا؟“ انہیں چھوڑتے وہ جلدی سے سکندر صاحب کے کمرے کی جانب بڑھا تو فریجہ بیگم زمین پر بیٹھتے سارہ کو پکارنے لگیں۔

”حاشر میری سارہ کو بچا لو پلیز حاشر میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں میری سارہ کو بچا لو،“ فریجہ بیگم نے باقاعدہ دونوں ہاتھ اُس کے سامنے جوڑتے تو حاشر کے سکندر صاحب کے کمرے کی جانب بڑھتے قدم رک گئے۔

”سارہ،“ اُس نے زیریب اُس کا نام دو ہرایا اور حیرت سے فریجہ بیگم کی جانب دیکھا جواب زارو قطار رورہی تھیں۔

”پھوپھو کیا ہوا سارہ کو؟ کہاں ہے وہ؟“ واپس پلٹتے اُس نے فریجہ بیگم کے قریب بیٹھتے انہیں سنبھالنے کی کوشش کی جن کے رونے کی آواز پورے گھر کے درود یوار ہلا چکی تھی۔

”پتا نہیں مجھ سے بات کر رہی تھی کہ اچانک اُس کے چیخنے کی آواز آئی اور پھر میں آوازیں دیتی

رہی پر مجھے سارہ کی آواز نہیں آئی، ایک لڑکے نے بتایا کہ اُس کا ایکسٹرینٹ ہو گیا ہے۔ حاشر میری بچی میرے جگر کا ٹکڑا خدا کے لیے میری بیٹی کو بچالو، دونوں ہاتھ اُس کے سامنے جوڑتے فریجہ بیگم کی ساری اکٹنکل چکی تھی اور اب وہ بس ایک بے بس اور لا چار ماں کی طرح اُس سے فریاد کر رہی تھیں جوان کی بات سنتے ہی انہیں تسلی دے کر چپ کرواتے ہسپتال کا نام پوچھ کر (جو اُس لڑکے نے بھی بتایا تھا) باہر کی جانب بھاگا۔



احمد اور سہیل دو گھنٹے کا المباسفر طے کرنے کے بعد ایک نئی گلہ پہنچ تو وہاں کی رنگینیاں دیکھ کر سہیل کے ساتھ ساتھ احمد کا دل بھی باغ ہو گیا وہ جو سہیل سے جلدی واپس جانے کی شرط رکھ کر آیا تھا وہاں پہنچتے ہی سب بھول گیا۔

”یار پہلے تو تم نے کبھی اس گلہ کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی کبھی دیدار کروا یا، للحاقی ہوئی نظر وہ سے اپنے ارد گرد منڈلاتی تیلیوں کو دیکھ کر احمد نے اعتراض کیا۔

”میں تو خود پہلی بار آیا ہوں یہاں،“ سہیل نے کہنی مار کر اُسے ایک اور تیلی کی جانب متوجہ کرتے بتایا۔

”یار کیا مست آئٹم ہے نا؟“ آنکھوں میں خمار لیے اُس نے احمد سے تصدیق چاہی تو اُس نے اُس کی نظر وہ کے تعاقب میں دیکھا جہاں ایک لڑکی نامناسب سے لباس میں ڈالس کرتی بھر پور طریقے سے اپنے جسم کی نمائش کرنے میں مصروف تھی۔

”ہاں یار بہت مست ہے،“ آنکھوں میں ستائش لیے وہ آگے بڑھا پر سامنے سے آتی ایک بھدری سی عورت سے ٹکراتے جہاں وہ گرنے سے بچا وہیں اُس کی ساری شرط اُس مرد نما عورت کے ہاتھ میں پکڑی شراب سے بھر گئی۔

”اندھے ہو گئے ہو کیا؟“ احمد کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ اپنے سامنے کھڑی مخلوق کو کیا کہہ کر ڈالنے تب ہی اُس نے اُسے غصے سے گھورتے خود کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھا۔

”سوری بابو جی مجھ سے غلطی ہو گئی“، اُس مرد نما عورت نے تالی بجائے معذرت کی تو سہیل کے ساتھ ساتھ احمد کی آواز پر ایک اور عورت بھی اٹھ کر ان کے قریب آئی۔

”معاف کیجیے گا صاحب یہ تھوڑی پاگل سی ہے“، اُس عورت نے لبھ میں مخصوص پیشہ ورانہ طوائفوں کی مٹھاس سمونے کہا تو سہیل نے احمد کو ٹھنڈا کیا جو غصے سے لال ہو رہا تھا۔

”ٹھیک ہے کوئی بات نہیں آپ پر یشان نہ ہوں“، احمد کے بجائے سہیل نے اُس عورت کو تسلی دی جو بار بار احمد سے معذرت کر رہی تھی۔

”صاحب آپ پلیز اندر جائیں وہاں اوپر ہی سڑھیاں چڑھتے دائیں ہاتھ کی طرف واش روم ہے وہاں جا کر اپنی شرط صاف کر لیں یا پھر مجھے دے دیں میں کسی سے کہہ کر صاف کروادیتی ہوں“، اُس عورت نے شاستہ لبھ میں پیشکش کی تو احمد نے نفی میں سر ہلا کیا۔

”نہیں میں خود صاف کر لوں گا“، سہیل کو وہیں رکنے کا اشارہ کرتے وہ اندر کی جانب بڑھا جہاں پر ہر طرف خاموشی تھی۔

”پتا نہیں کہاں سے آ جاتے ہیں ایسے بے وقوف لوگ“، سارا مزہ خراب کر دیا بولنے کے ساتھ ہی وہ سڑھیاں چڑھتے اوپر آیا اور اندازے سے ہی آگے بڑھتے اُس نے دروازے کو دھکا مارا جو بند تھا۔

”اُف واش روم کے دروازے کو بھی باہر سے لاک لگایا ہے حد ہے“، خود کلامی کرتے اُس نے باہر لگی کنڈی کو کھولا اور اندر داخل ہوتے ہی جو چہرہ اُسے نظر آیا وہ اُس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ چکا تھا۔

حاشر ہسپتال پہنچا تو سارہ کو ہوش آچکا تھا، اُس کے سر پر چوت لگی تھی جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ اور معمولی چوٹیں آئی تھیں جس پر ڈاکٹر نے انہیں مطمئن کرتے ڈرپ ختم ہوتے ہی ڈسچارج کرنے کا بولا۔

”شکر ہے تم مجھ کیں ورنہ حارت بھائی نے میری جان لے لیتی تھی،“ حاشر نے اُسے پریشان دیکھ کر شریروں سے انداز میں مسکراتے ہوئے چھپرا۔

”اب اتنی بھی اہم نہیں میں تمہارے بھائی کے لیے کہ میری خاطر وہ تمہیں کچھ کہے اور تمہیں میرے یہاں ہونے کا کس نے بتایا؟“ حارت کے نام پر ہی سارہ کا دل اندر تک افسردہ ہو گیا مگر اُس نے حاشر پر ظاہر کرنے کے بجائے بات بدلتی۔

”پھوپھو نے بتایا اور تمہیں اس وقت اکیلے جانے کی کیا ضرورت تھی ڈرائیور کو ساتھ لے جاتیں،“ حاشر نے بتانے کے ساتھ ہی اُس کی کلاس لی۔

”اب میں کوئی چھوٹی پچھی نہیں ہوں جو ہر جگہ ڈرائیور کو ساتھ لے پھروں اور تم کیا یہاں مجھے ڈالنٹنے آئے ہو؟“ ہلکی سے مسکراہٹ چہرے پر سجائتے سارہ نے شکوہ کیا تو حاشر کو اُس کا انداز بالکل نیسا لگا۔

”لگتا ہے ایکسیڈنٹ نے دماغ پر گہرا اثر کیا ہے جو مجھ سے اتنے پیار سے بات کر رہی ہو، کہیں کوئی اندر ونی چوت تو نہیں آئی؟“ حاشر نے سنجیدگی سے اُس کی جانب دیکھتے ہوئے آنکھوں میں فکر مندی لیے سوال کیا تو سارہ نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اگر میں مسکرا کر بات کروں تب بھی تمہیں مسئلہ ہے غصے سے کروں تب بھی۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم اس وقت میرے منہ نہ لگو،“ زیریں اُسے مسکرا تا دیکھ کر سارہ نے آنکھوں میں ناراضی لیے کہا تو حاشر کو اُس کا یہ انداز بہت اچھا لگا کیوں کہ زندگی میں پہلی بار اُس نے اُسے اپنا سمجھ کر

بات کی تھی۔

”ہاں مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تمہارے منہ لگنے کا“، اپنی انا برقرار رکھتے اُس نے سارہ کو جواب دیا جس کی آنکھیں ایک دم ہی آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”کیا ہوا؟ کہیں درد ہے تو ڈاکٹر کو بلاؤ؟“ حاشر نے اُسے روتا دیکھ کر پوچھا۔

”دنہیں، بس مجھے گھر لے جاؤ۔ میرے گھر جہاں ماموں ہیں، امی ہیں، تم ہو، حارت ہے“، اپنی آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے رکڑتے اُس نے کہا تو حاشر کو اُس کا ایک دم سے بدلا ہوا رویہ کچھ سمجھنہیں آیا پر پھر بھی اُس نے کوئی سوال پوچھنے سے خود کو باز رکھتے اُسے تسلی دی جواب پھوٹ پھوٹ کر روتے اُسے مزید پریشان کر گئی تھی۔

”اچھا بس تم اب چپ کرو۔ میں ڈاکٹر سے بات کر کے آتا ہوں، پھر گھر چلتے ہیں“، اُسے چپ کروانے کی کوشش کرتے حاشر نے کہا اور اُسی کشمکش کی کیفیت میں باہر کی جانب بڑھا۔

”یا اللہ، تیر لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے میری بروقت آنکھیں کھول دیں ورنہ اُس عمر کے پیچھے میں جہاں اپنی زندگی بر باد کرتی وہیں اپنے سگے دشمنوں کو بھی ہمیشہ کے لیے گنو بیٹھتی۔ ٹھیک کہتے ہیں یہ دنیا مكافات عمل ہے کہاں میں اور امی دولت کی ہوس میں ماموں کو مارنے اُن کو تکلیف پہنچانے کے چکر میں تھے اور کہاں عمر میری زندگی میں شامل ہونے سے پہلے ہی میری ساری جائیداد ہڑپ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دشمنوں سے میرا سودا بھی طے کر چکا تھا۔ افف اللہ اگر میں اور امی وہ سب کچھ کر دیتیں جو ہم نے سوچا تھا تو پوری زندگی کے لیے اپنی عزت سے بھی ہاتھ دھوپیٹھتی، شکر ہے پروردگار تو نے ہماری عزت ہماری جان کو اُس شخص سے محفوظ رکھا جسے میں اپنا محسن سمجھ بیٹھی تھی، خود کلامی کرتے سارہ نے آنکھیں بند کیں اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ آج وہ عمر کو بتائے بغیر اُس کے اپارٹمنٹ گئی تو اُس کے ذہن میں چلنے والے تمام ارادوں سے واقف ہو گئی ورنہ ساری زندگی پچھتانا نے کے علاوہ اُن کے ہاتھ کچھ نہ آتا۔

☆☆☆

نور کو وہاں اُس ناپاک جگہ پر دیکھ کر احمد کو اپنی آنکھوں پہ شبہ ہوا تب ہی اُس نے انہیں مسلتے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا جو خود بھی آنکھوں میں حیرت لیے اُسے دیکھ رہی تھی۔

”انہیں، یہ کوئی ہم شکل ہے اور نور بھائی کا یہاں کیا کام؟ وہ یہاں کیسے آسکتی ہیں؟“ نظریں اُس کے چہرے پر جمائے جہاں میک اپ کی تھہ لگائی گئی تھی احمد نے سوچا اور پلٹ کر واپس جانے لگا تو نور نے جلدی سے ہوش میں آتے اُسے آواز دی۔

”احمد بھائی، کسی اپنے کی وہاں موجودگی جہاں نور کو حیرت میں مبتلا کر گئی وہیں اس دلدل سے نکلنے کی امید نے اُسے پھر سے زندگی بخشی تباہی اُس نے احمد کو پلٹتے دیکھ کر جلدی سے اُس کے سامنے آتے روکا۔

”بھائی آپ یہاں؟ مطلب کیسے؟“ احمد کو سمجھنے ہیں آیا کہ وہ اُس سے کیا پوچھے کیوں کہ اُس کے نام پکارنے سے یہ بات کنفرم ہو گئی تھی کہ وہ نور ہی ہے پر یہاں اس جگہ اس سوچ نے احمد کا دماغ ہلاکر رکھ دیا۔

”پلیز مجھے بچالیں، میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ پلیز کسی طرح مجھے یہاں سے نکال دیں یا آپ زارون کو کال کریں اُسے بتائیں کہ میں یہاں ہوں، پلیز احمد بھائی آپ کو اللہ کا واسطہ ہے مجھے یہاں سے بچالیں“، نور نے دونوں ہاتھ اُس کے سامنے جوڑے زارو قطار روتے ہوئے فریاد کی تو احمد نے کسی کے قدموں کی آہٹ سنتے اُسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور واپس آنے کا بولتے کمرے سے نکل کر کنڈی لگاتے سیڑھیوں کی طرف آیا جہاں وہی مرد نما عورت اُسے دیکھنے سیڑھیاں چڑھتے اوپر آرہی تھی۔

”صاحب جی آپ کو واش روم ملایا نہیں؟“ خوشبو جو تہینہ بیگم کے کہنے پر احمد کے پچھے آئی تھی پر

لاکھ شکر کہ اُس نے شراب کے نشے کے زیر اثر احمد کو نور کے کمرے سے نکلتا دیکھ کر بھی کوئی تاثر نہیں دیا۔

”ہاں مل گیا، پروہاں صابن نہیں ہے آپ کو تکلیف نہ ہو تو آپ مجھے لا کر دے سکتی ہیں؟“، احمد اُس کے منہ سے آنے والی بو اور لبھ کی لڑکھڑاہٹ سے سمجھ چکا تھا کہ وہ نشے میں ہے تب ہی اُس نے غفلتی کا مظاہرہ کرتے اُس سے نیچے بھیجا تاکہ نور سے بات کر سکے۔

”جی صاحب جی میں لاتی ہوں“، دانتوں کی نمائش کرتے اُس نے کہا اور ویسے ہی لڑکھڑا تے قدموں سے نیچے کی جانب بڑھی تو احمد نے شکر ادا کرتے ایک نظر نیچے ہال میں ڈالی جہاں ابھی کوئی نہیں تھا اور واپس اُس کمرے کی جانب بڑھا جہاں نور موجود تھی۔

”آپ یہاں کیسے؟ میرا مطلب کہ کون لایا ہے آپ کو یہاں اور یہ بات زارون کو پتا ہے؟“، کمرے میں آتے ہی اُس نے نور سے مناسب الفاظ میں سوال کیا جوا بھی بھی رو رہی تھی۔

”میری دوست خدیجہ لائی ہے وہ مجھے دھوکے سے یہاں لائی، زارون کو نہیں پتا بس آپ پلیز مجھے یہاں سے نکال دیں یا پھر زارون کو کال کر دیں وہ مجھے لے جائے گا“، نور نے کسی کے آجائے کے ڈر سے ایک ہی سانس میں احمد کو سب بتایا جو اُس کی پوری بات سنتے ہی اُسے جلد ہی پکھ کرنے کی تسلی دیتے اور خاموشی اختیار کرنے کا کہتے واپس دروازہ بند کرتے نیچے آگیا تاکہ اُس کی غیر موجودگی سے کسی کوشک نہ ہو۔



زارون اپنا موبائل چارج پر لگانے کے بعد دی جان کے پاس ہی آگیا جو تب سے سوئی ہوئی تھیں تو وہ بھی وہاں موجود صوف پر کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔ اُسے لیٹے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ بیرونی دروازے کی بیل بجھنے لگی۔ ”اس وقت کون آگیا؟“، کلاک پر رات کے گیارہ بجھتے دیکھ کر اُس نے خود کلامی کی اور رشیدہ کو اٹھتا دیکھ کر اشارے سے روکتے خود اٹھ کر باہر کی جانب

بڑھا۔

”کون؟“ آواز لگاتے اُس نے دروازہ کھولا اور وہاں موجود شخص کو دیکھ کر چند ثانیے کو اُس کی زبان ساکت ہوئی۔

”ابو آپ یہاں اس وقت سب خیریت ہے نا؟“ احتشام صاحب کو دیکھ کر جہاں زارون کو حیرت ہوئی وہیں پچھے کھڑی شہنماز بیگم کو دیکھ کر اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”ہاں، کیوں میرے یہاں آنے پر پابندی ہے یا میں یہاں نہیں آ سکتا؟“ آگے بڑھتے انہوں نے زارون کو اپنے ساتھ لگاتے شکوہ کیا۔

”نہیں، میں نے ایسا تو نہیں کہا پر آپ اس وقت آئے وہ بھی بغیر بتائے تو میں تھوڑا پریشان ہو گیا“، زارون نے اپنی بات کی وضاحت دی اور شہنماز بیگم کے سلام کا جواب دیتے دروازہ بند کیا۔

”ہاں یہ تو ہے مجھے بتا کر آنا چاہیے تھا مگر کس کو بتا تانہ تو تم میرافون اٹھانا ضروری سمجھتے ہو اور پر سے امی جان بھی جب سے یہاں آئیں ہیں ایک فون تک نہیں کیا میں فون کرتا ہوں تب بھی بس تھوڑی بہت بات کر کے بند کر دیتی ہیں“، زارون کے اشارہ کرنے پر صوفی پر بیٹھتے انہوں نے اعتراض کیا تو رشیدہ بھی اُن کی آواز سننے باہر آگئی۔

”سلام بڑے صاحب“، احتشام صاحب کو دیکھتے ہی رشیدہ نے خوشدی سے کہا۔

”وعلیکم السلام رشیدہ کیسی ہوتم؟“ اُس کے سلام کا جواب دیتے انہوں نے سوال کیا جواب شہنماز بیگم کو سلام کر رہی تھی۔

”جی بڑے صاحب میں ٹھیک ہوں“، احتراماً نظریں جھکائے اُس نے جواب دیا اور زارون کے کہنے پر اُن کے لیے پانی لینے چلی گئی۔

”امی جان کہاں ہیں اور ہماری بہو؟“ رشیدہ کے جاتے ہی احتشام صاحب نے سوال کیا۔

”دی جان کی شام میں تھوڑی طبیعت خراب ہو گئی تھی، ڈاکٹر نے چیک کیا تھا، میڈیسین دی تھیں اُن کے زیر اثر سورہ ہی ہیں اور نورا پنے گھر گئی ہے“، زارون کو نور کے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں لگا تب ہی اُس نے جھوٹ بولا۔

”کیا ہوا امی کو؟ زیادہ طبیعت خراب ہے کیا؟“، احتشام صاحب نے پریشانی سے سوال کیا تو زارون نے نفی میں سر ہلاتے انہیں مطمئن کیا۔

”میں اب ٹھیک ہیں آپ پریشان نہ ہوں اور پانی پیئں“، ایک اچھتی نظر شہناز بیگم پر ڈالتے جو نظریں نیچی کیے بیٹھی تب سے اپنے ہاتھوں کو آپس میں مسلسل رہی تھیں۔

”اچھا ٹھیک ہے آرام کرنے دو ہم ویسے بھی یہاں تم سے بات کرنے آئے ہیں بلکہ تمہیں منانے“، احتشام صاحب نے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو زارون نے نسبجھی سے اُن کی جانب دیکھا۔

”مطلوب؟ مجھے کیوں منانا ہے اور میں کب ناراض ہوا آپ سے؟“، کچھ الجھے سے انداز میں جہاں وہ پہلے شہناز بیگم کی خاموشی پر ہکا کا سا بیٹھا تھا اب احتشام صاحب کے انکشاف پر مزید فکر مندر ہوا۔

”میں نہیں بلکہ شہناز تم سے معافی مانگنا چاہتی ہے اور اسی نے مجھے یہاں آنے کے لیے کہا اور میں اسی کے کہنے پر یہاں آیا ہوں“، احتشام صاحب نے ایک اور انکشاف کیا جسے سُن کر جہاں زارون کو حیرت ہوئی وہیں شک بھی کہ یہ شہناز بیگم کی کوئی نئی چال نہ ہو۔

”میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا، مجھے اپنے کیے کا احساس ہو گیا ہے جب سے ڈاکٹر نے مجھے بتایا ہے کہ میں بانجھ ہوں ایک پھانس سی میرے دل میں اٹک گئی ہے کہ میں نے دولت کے لاچ میں آکر تمہیں تمہاری ماں سے دور کیا احتشام کو اپنابنانے کے لیے، میں نے یہ تک نہیں سوچا کہ اللہ پاک مجھے اُسی نعمت سے محروم کر دے گا جس کی مجھے زندگی میں سب سے زیادہ خواہش تھی“، آنکھوں میں آنسو لیے

اُنہوں زارون کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

”پلیز زارون مجھے معاف کر دو، میں نے ضد اور جلن میں آکر سب کیا پر میرا مقصد تمہاری ماں کو مارنا یا اُسے تکلیف پہنچانا نہیں تھا مجھے تو احتشام سے، اُس کی دولت سے پیار تھا جس کے لیے میں اس حد تک چلی گئی کہ میں نے تم سے تمہاری ساری خوشیاں چھین لیں،“، زارو قطار روتے وہ زارون سے اپنے ہر گناہ کی معافی مانگ رہی تھیں۔

”اچھا بس زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے آپ مت روئیں۔ آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا یہی کافی ہے باقی اپنی زندگی کو حسد اور جلن کی نظر کر کے نہ ہی آپ کو کچھ ملے گا نہ مجھے اس لیے بہتر ہے کہ ہم دونوں ہی اپنے رویے ٹھیک کر لیں۔ جہاں تک جائیداد کی بات ہے تو جتنا میرا حق ہے اتنا آپ کا بھی ہے اور آپ مجھے پیار سے کہتیں تو میں شاید سب کچھ ہی آپ کے نام کر دیتا مگر آپ نے مجھے کسی کا نٹے کی طرح اپنی زندگی سے نکالنا چاہا اسی لیے وہ سب میری انا کا مسئلہ بن گیا۔ اپنی انا میں آکرنے تو میں امی کی روح کو سکون دے سکا اور نہ ہی ابو کو خوش رکھ سکا۔ غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے آپ دونوں سے بھی ہوئی جس کی وجہ سے میری ماں کی جان چلی گئی اور یہ بات اتنی بڑی تھی کہ میں وقت طور پر سنجل نہیں پایا پر اب مجھے سمجھ آگئی ہے کہ موت کے صرف وجوہات اور اسباب پیدا ہوتے ہیں تاکہ ہم انسان یہ کہہ سکیں ایسا نہ ہوتا تو وہ نہ مرتے یا اس وجہ سے اُس انسان کو موت آئی پر ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ موت کا وقت طے ہے اور وہ اپنے مقررہ وقت پر ہر ذی روح کو آنی ہی ہے۔ امی کی موت کا وقت بھی طے تھا اس میں آپ کا یا ابو کا کوئی قصور نہیں،“، اُن کے دونوں ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیتے زارون نے اُن کی شرمندگی کو کم کرنے کی کوشش کی تو شہناز بیگم کی آنکھوں سے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔

”میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی،“، آنکھوں میں ندامت کی جگہ خوشی کے آنسو لیے اُنہوں نے زارون کو اپنے ساتھ لگایا تو اُس نے بھی اپنے اتنے اہم رشتؤں سے تمام گلے شکوے پل بھر

میں دور کر دیے۔

”اب ماں بیٹا ہی لگے رہو گے یا مجھے بھی موقع دو گے؟“، احتشام صاحب نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ زارون کے دل سے بھی نفرت ختم ہوئی اور نرم گوشہ پیدا ہوا، ان کو فخر ہوا ان کے بیٹے نے آج ان کی لاج رکھ لی۔

”دلیں دے دیا آپ کو بھی موقع“، زارون نے نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے احتشام صاحب کے سینے پر سر کھاتا تو آج اتنے عرصہ بعد بیٹے کا پیار بھر امس ان کو اندر تک سرشار کر گیا۔



”کہاں رہ گئے تھے یا رتم اتنی دیر کہاں لگا کر آئے ہو؟“، سہیل نے احمد کو آتا دیکھ کر پوچھا۔

”کہیں نہیں تم پروگرام انجوانے کرو میں بس ایک کال کر کے آیا“، احمد نے چاروں طرف نظر دوڑاتے کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ نہ پا کر کہا اور سہیل کے روکنے کے باوجود بھی لان کے قدرے خاموش حصے کی جانب بڑھا۔

”یہ صاحب کہاں گئے لگتا ہے ناراض ہو گئے ہیں؟“، تھینہ بیگم نے احمد کو جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا تب ہی اپنے مہمانوں سے فارغ ہوتے ہی سہیل کی جانب آئیں جو حیران پریشان احمد کے رویے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں اُسے کوئی ضروری کال کرنی تھی اس لیے گیا ہے ابھی آجائے گا“، سہیل نے اُس کے نامناسب سے لباس میں سے نمایاں ہوتے جسم پر نظر ڈالتے چہرے پر ایک جانداری مسکراہٹ سجائے تھا۔

”ٹھیک ہے وہ آ جائیں گے مگر آپ تو آئیں یہاں اکیلے بیٹھ کر محفل کا کیا مزہ؟“، ایک ادا سے کہتے اُس نے سہیل کو کار سے پکڑا اور لان کے اُس حصے میں لگئی جہاں اس وقت محفل اپنے عروج پر تھی اور

بہت سی حسینائیں اپنے حُسن کے جلوے بکھیرتے حاضرین کا دل جتنے میں مصروف تھیں۔

☆☆☆

حاشر سارہ کو لے کر گھر پہنچا تو فریجہ بیگم (جنہیں حاشر پہلے ہی فون پر سارہ کے ٹھیک ہونے اور گھر آنے کے بارے میں بتا چکا تھا) انہی کے انتظار میں لان میں ٹھیک رہی تھیں۔

”میری بیٹی میری جان، تم ٹھیک ہونا؟“ حاشر کی گاڑی رُکی تو فریجہ بیگم نے جلدی سے آگے بڑھتے دروازہ کھول کر سارہ کو گاڑی سے اترنے میں مدد کرتے والہانہ انداز میں اُسے بوسہ دیتے دیکھنے لگیں جس کے سر پر پٹی بندھی تھی۔

”جی امی میں ٹھیک ہوں آپ کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہیں بس معمولی سی چوٹ ہے جلد ٹھیک ہو جائے گی“، بلکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائتے اُس نے فریجہ بیگم کو تسلی دی اور انہیں ساتھ لیے اندر کی جانب بڑھی جہاں سکندر صاحب بھی لاڈنخ میں اپنی وہیل چیئر پر بیٹھے اُسی کا انتظار کر رہے تھے۔ سارہ کو دیکھتے ہی اشارے سے اپنے پاس بُلانے لگے۔

”میں ٹھیک ہوں آپ پریشان نہ ہوں“، ان کا لرزتا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے سارہ کو دکھا کر وہ اور اُس کی ماں ان کے ساتھ کیا کچھ کرتی رہی ہیں مگر آج اُس کی تکلیف میں اُس کے یہ اپنے ہی اُس کے ساتھ کھڑے تھے۔

”ماموں میں ٹھیک ہوں آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟“ سکندر صاحب کی آنکھوں سے بہتا پانی دیکھ کر سارہ نے انہیں بہت پیار سے تسلی دی جو ان کی باتوں اور اتنی نفرتوں کے باوجود بھی اُس کے ایکسیڈنٹ کا سنتے ہی تب سے بیٹھے حاشر کے لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔

”راجیل تم ابو کو کمرے میں لے جاؤ“، حاشر نے انہیں سارہ کی طرف سے دلبڑا شتہ ہوتا دیکھ کر راجیل سے کہا جو سکندر صاحب کو حارت اور حاشر کی غیر موجودگی میں سنبھالتا تھا۔

”جی سر“، اُس کی بات سنتے ہی راحیل وہیل چیز کو کمرے کی طرف لے گیا تو حاشر نے سارہ کو بھی آرام کرنے کا کہا تو فریحہ بیگم اسے سہارا دیتے اُس کے کمرے میں لے گئیں۔

”یہاں بیٹھو اور مجھے یہ بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟ تم تو عمر سے ملنے کئی تھیں نا تو پھر یہ سب؟“ بیڈ کی بیک پر تکیہ رکھتے انہوں نے سارہ کو بٹھایا۔

”آنکھیں کھل گئی تھیں میری پراللہ کا انصاف دیکھ کر دماغ بند ہو گیا اس لیے گڑی سنبھلی ہی نہیں مجھ سے“، سارہ نے آنکھوں میں نبی لیے کہا تو فریحہ بیگم نے اتنی گہری بات پر بیٹی کے چہرے کی جانب دیکھا جہاں آج پہلی والی سارہ کا کوئی عکس نہیں تھا۔

”مطلوب کیسا انصاف؟“ ناجھی سے کہتے وہ اُس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

”وہ سب جو ہم ماموں اور حارث، حاشر کے ساتھ کرنے والے تھے نا، عمر بھی یہی سب کرنے کا ارادہ کیے بیٹھا تھا۔ امی اُسے مجھ سے محبت نہیں تھی بلکہ وہ یہ سب اس لیے کر رہا تھا کہ میں نے اُسے بتا دیا تھا کہ ماموں نے مجھے اور آپ کو بھی جائیداد میں سے کروڑوں کا حصے دار بنایا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میں نے وہ سب عمر کو بتایا تو اُس کی اصلیت میرے سامنے آگئی ورنہ وہ تو اپنے دوستوں سے مجھے ایک بار استعمال کرنے کے بعد ان کو سونپنے کا سودا کر چکا تھا“، آنکھوں میں اذیت لیے سارہ نے اپنی بات مکمل کی تو فریحہ بیگم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”مطلوب عمر نے یہ سب تم سے خود کہا؟“

”نہیں مجھ سے یہ سب کیوں کہنا تھا آج میں اُس کو بتائے بغیر گئی کہ اُسے سر پر ائزدوں گی پر وہاں پہنچتے ہی مجھے یہ سب سننے کو ملا وہ اپنے کسی دوست سے فون پر بات کر رہا تھا“، سارہ نے مزید وضاحت کی تو فریحہ بیگم نے اُسے اپنے ساتھ لگایا۔

”شکر ہے اللہ نے ہمیں بچالیا اور نہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہونے والا تھا میرے تو سُن کر ہی رو نکلے“

کھڑے ہو گئے ہیں، اپنے بازو پر ہاتھ پھیرتے انہوں نے خوف سے جھر جھری لی۔

”ہم پر ہمارے یہ سب کرتے ہوئے رو نگٹے کھڑے نہیں ہوئے کیوں کہ اُس وقت ہم دونوں یہ بھول گئے تھے کہ آج جو کچھ ہم بورے ہیں آگے جا کر اُس کی فصل ہمیں خود ہی کاٹنی پڑے گی اور امی آپ نے میرے دل میں ہمیشہ ما موں کے خلاف نفرت کیوں بھری؟ کیوں آپ نے مجھے یہ نہیں سمجھایا کہ باہر کی دنیا اتنی خوفناک ہے؟“ سارہ نے نظروں میں خنگی لیے پوچھا تو فریجہ بیگم نے بیٹی کے الزام پر نظریں چرا نہیں۔

”سوچیں اگر میں یہ سب نہ سنتی تو ہمارا کیا ہوتا ہم نے تو خالدہ آنٹی کا انجام دیکھ کر بھی سبق نہیں سیکھا کیوں کہ ہماری آنکھوں پر بس دولت اور پیسے کی پٹی بندھ گئی تھی جس کے آگے ہمیں سب کچھ ہی صحیح لگا، آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے رگڑتے وہ آج فریجہ بیگم کو آئینہ دکھارہی تھی اُن کی اپنی بیٹی جس کے ذہن میں انہوں نے پورے پچیس سال زہر بھرا تھا۔

”آپ کو پتا ہے ابو نے آپ کو طلاق اسی وجہ سے دی کیوں کہ آپ آستین کے سانپ کی ماندر ہیں، جن لوگوں نے پوری زندگی ہمیں سنبھالا، ہمیں سہارا دیا اچھا کھانے اور پہننے اور ہڑھنے کو دیا، ہم اُن ہی کے خلاف ہو گئے کس کے لیے؟ ان آسائشوں کے لیے جو ہمیں ابو بھی نہیں دے سکتے اور ما موں نے بن مانگے ہی ہماری جھوٹی میں ڈال دیں۔ کبھی اپنی اولاد کا نہیں سوچا بس ہمیشہ مجھے اور آپ کو ترجیح دیتا کہ ہمیں احساس کمتری نہ ہو پر ہم نے کیا کیا؟ میں تو نا سمجھ تھی پرمی آپ نے بھی مجھے نہیں سمجھایا اگر میں عمر کے پیچھے لگ بھی گئی تھی تو آپ نے مجھے کیوں نہیں روکا؟ کیوں نہیں سمجھایا کہ اب جو بھی ہے حارث میرا محروم ہے۔ آپ نے کیوں مجھے شہ دی اپنی زندگی بر باد کرنے کی؟“ سارہ نے ترپتے ہوئے ماں سے وہ تمام سوال کر ڈالے جن کا اُن کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”آپ سوچیں ابھی تو ہمارے پاس ما موں تھے جنہوں نے ہمیں سنبھال لیا پر آگے ہمارے پاس

کون ہوگا؟ اس دولت کے سہارے ہم کب تک زندگی گزار لیں گے جب ہمارے پاس کوئی رشتہ ہی نہیں بچے گا، اپنے دل کی ساری بھڑاس نکالتے وہ فریجہ بیگم کو پریشان چھوڑے بیڈ کا سہارا لیتے اٹھی اور دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔

”میں بُری بیوی تو تھی ہی کا شف (سارہ کے ابو) آج بُری ماں بھی بن گئی، آنکھوں سے گرتے قطار درقطار آنسو ان کی شرمندگی کی علامت تھے جو پوری زندگی چاہنے کے باوجود بھی کم نہیں ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

”افف یہ زارون فون کیوں نہیں اٹھا رہا،“ احمد پچھلے آدھے گھنٹے سے مسلسل اُسے فون کر رہا تھا جس کا موبائل کمرے میں موجود چارچین پر لگا تھا اور وہ خود دی جان کے اٹھ جانے کی وجہ سے اختشام صاحب اور شہنماز بیگم کے ساتھ ہی اُن کے کمرے میں موجود تھا۔

”اللہ.. پتا نہیں کہاں ہے یہ، میں گھر کے نمبر پرفون کرتا ہوں،“ ایک نظر چاروں طرف دیکھتے اُس نے زارون کے اپارٹمنٹ کا نمبر ملا یا جو دوسرا بیل پر شیدہ نے اٹھا لیا۔

”ہیلو کون؟“

”میں احمد بات کر رہا ہوں میری زارون سے بات کروادیں فوراً،“ رشیدہ نے پوچھا تو احمد نے سلام دعا کے بغیر ہی اُس سے کہا۔

”جی میں بلا تی ہوں،“ کریڈل پرفون رکھتے ہی وہ دی جان کے کمرے کی جانب بڑھی۔

”چھوٹے صاحب کسی احمد صاحب کا فون ہے،“ زارون جونور کی غیر موجودگی کے متعلق اختشام صاحب کو سب سچ بتا رہا تھا احمد کا نام سنتے ہی اُس نے کلاک کی طرف دیکھا۔

”احمد اس وقت؟“ رات کے دو بجتے دیکھ کر اُس نے خود کلامی کی اور اٹھ کر باہر آتے فون اٹھایا۔

”ہیلو احمد،“

”زارون پلیز اس وقت سوال جواب کا وقت نہیں ہے۔ میں تمہیں موبائل پر ایک پتہ سینڈ کر رہا ہوں جلد از جلد اس پر پہنچ جاؤ اور اس کیلئے مت آنا اپنے گارڈ زکوساتھ لے کر آنا“، احمد نے چاروں طرف نظر کھتے رازداری سے اُس سے کہا جود و سری طرف حیرت سے ایک بار پھر سے کلاک کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہوا کیا ہے کوئی لڑائی ہو گئی ہے کیا تمہاری؟“

”دنہیں یا ربس تم سمجھو تمہاری زندگی اور عزت دونوں خطرے میں ہیں پلیز جتنا جلدی ممکن ہے پہنچ جاؤ“، احمد نے تمہینہ بیگم کو اپنی طرف آتا دیکھ کر جلدی سے فون بند کیا۔

”صاحب ہم کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور آپ ہیں کہ جب سے آئے ہیں بس فون پر ہی لگے ہیں“، تمہینہ بیگم نے اُس کے قریب آتے شکوہ کیا تو احمد نے اپنی پیشانی پر آتی پسینے کی نیخی بوندوں کو نامحسوس طریقے سے صاف کرتے ایک مسکراہٹ اچھائی۔

”بس ڈاکٹر ہیں نا، اوپر سے شادی شدہ تو سوکام پڑ جاتے ہیں“، احمد نے ہوشیاری سے تمہینہ بیگم کی جانچتی نظر وہ نے نظر ملاتے جواب دیا تو اُس نے ایک زوردار قہقهہ لگایا اور احمد کو اپنے ساتھ لان کے دوسرے حصے میں لے گئیں جہاں اب سہیل نشے میں بالکل مست ہو چکا تھا اور ایک لڑکی کے ساتھ ڈالنس کرنے میں مصروف، احمد کو دیکھتے ہی اُس سے بھی بُلانے لگا تو اُس نے تمہینہ بیگم کی نظر سے بچا کر (جسے احمد پرشک ہو چکا تھا) زارون کو وہاں کا پتہ سینڈ کیا اور ساتھ نور کے وہاں ہونے کے بارے میں بھی بتا دیا جسے پڑھتے ہی زارون کی جان میں جان آئی اُس نے جلدی سے احتشام صاحب کو سب بتایا اور انہیں گھر رک کر سب کا دھیان رکھنے کا کہتے احمد کی بتائی ہوئی جگہ کی طرف روانہ ہوا اور اپنے گارڈ زکو بھی فون کرتے وہاں جلد از جلد پہنچنے کا کہا۔

احمد کو وہاں لانے کے بعد تمہینہ بیگم مطمئن ہو گئیں اور سب کے درمیان جا کر بیٹھیں تو چنبلی اُن کا فون لیے اُن کے پاس آئی جو کب سے نج رہا تھا۔

”باجی زین صاحب کافون آرہا ہے“، رازداری سے اُس کے کان میں گھستے چنیلی نے اُسے آگاہ کیا جو چند سینڈ پہلے ہی شبنم کونور کو لینے کے لیے بچھ چکی تھی۔

”اُف اب اس کم بخت کو اس وقت میری یاد کیسے آگئی؟“، منه میں پان چباتے اُس نے خود کلامی کی اور شور کی وجہ سے ایک سائیڈ پر ہوتے کال ریسیوکی۔

”ہیلو، کہاں مر گئی تھی تم میں کب سے کال کر رہا تھا؟“، اُس کے ہیلو کہتے ہی زین نے غصے سے چلاتے ہوئے پوچھا۔

”صاحب آپ تو جانتے ہیں یہ وقت ہماری روزی روؤی کا ہے بس اسی لیے فون اٹھانے میں دری ہو گئی،“، تہمینہ بیگم نے اندر کی جانب بڑھتے ہوئے جواب دیا اور اُسے مزید وضاحتیں دیئے لگیں۔

”اچھا زیادہ بک بک نہ کرو اور نور کو تیار کرو میں آرہا ہوں کچھ دری میں پہنچ جاؤں گا“، زین نے اُس کی مسلسل چلتی زبان سے تنگ آتے مطلب کی بات کی اور ایک دو مزید ہدایت دیتے کال کاٹ دی۔

”اُف اس منحوس کو بھی آج ہی یاد آنی تھی“، سیڑھیوں سے اوپر کی جانب جاتے اُس نے زین کو گالی دی جس نے اُس کے سارے پلان پر پانی پھیر دیا تھا۔

زین کا فون سنتے ہی تہمینہ بیگم سیڑھیاں چڑھتے اوپر آگئیں تاکہ شبنم کونور کو نیچے لانے سے منع کر سکیں۔

”باجی دیکھیں اس نے کیا کیا“، شبنم نے تہمینہ بیگم کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر نور کی شکایت کی جس نے سارا میک اپ صاف کرنے کے ساتھ ساتھ تمام جیولری اُتار کر کمرے کے کونے کونے میں پھینک دی تھی۔

”میری اتنی مہنگی جیولری کا ستیانا س کر دیا“، دونوں ہاتھ چہرے پر رکھے اُنہوں نے ایک نظر فرش پر ٹکھرے پڑے اپنے سونے کے سیٹ پر ڈالی اور پھر کھا جانے والی نظر وہ سونے کو دیکھا جو بڑے سکون

سے اُس کی کسی بھی بات پر غور کیے بغیر دوپٹے کو اچھے سے اپنے گرد پھیلا کر اوڑھ چکی تھی۔

”کیا کیا ہے یہ تم نے؟؟ تمہاری جرأت کیسے ہوئی تھینہ بیگم کی چیزوں کو یوں پاؤں میں روند نے کی؟“ غصے سے پاگل ہوتے وہ اُس کے اوپر چھپٹی جواس حملہ کے لیے بالکل بھی تیار نہ تھی۔

”منہ توڑ دوں گی میں تیرا“، دونوں ہاتھوں سے اُس کے گالوں پر تھپڑوں کی بارش کرتے وہ کچھ سیکنڈز کے لیے زین کے بارے میں بالکل بھول چکی تھی۔

”منہ توڑنا مجھے بھی آتا ہے اس لیے اپنے ہاتھ اور زبان کنٹرول میں رکھو“، اُس کا ہاتھ پکڑتے نور نے غصے اور تکلیف کے ملے جلے تاثرات لیے تھینہ بیگم کو ایک زور دار دھکا دیا جس سے اس کا سر شبنم کے بروقت سنبھالنے سے دیوار پر لگتے لگتے لگتے بچا۔

”اگر زین صاحب کے آنے کا خیال نہ ہوتا نا مجھے تو تم دیکھتی کہ تھینہ بیگم کس قهر کا نام ہے؟“، غصے سے پاگل ہوتے انہوں نے پھر سے آگے بڑھتے نور کے جبڑوں کو سختی سے اپنے ہاتھ میں دبو چا تو تکلیف کی شدت سے آنسو آنکھوں سے نکلتے اُس کے گالوں پر بہہ نکلے۔

”آج جتنی زبان چلانی ہے ناچلا لے جتنا اکڑنا ہے اکڑ لو کیوں کہ کل سورج نکلنے کے ساتھ ہی زین صاحب تجھے استعمال کر کے میرے حوالے کر دیں گے پھر تو ساری زندگی میرے شر سے پناہ مانگے گی پر تجھے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا، پھر تھینہ بیگم دل کھول کر تجھ سے تیری ساری بد تیزیوں کا بدلہ لے گی“، دانت پسیتے اُس نے اپنی بات مکمل کی اور اس سے پچھے بیٹ پر دھکا دیا جس کا چہرہ تھینہ بیگم کے بھاری ہاتھ کی انگلیوں سے بالکل سرخ ہو چکا تھا۔

”اس کا دھیان رکھو بلکہ یہاں اس کے پاس ہی رہو جب تک زین صاحب نہیں آ جاتے“، شبنم کو حکم دیتے اُس نے ایک تمثیل نظر نور پر ڈالی (جو اپنے ہونٹ پر ہاتھ لگاتے اُس سے نکلنے خون کو صاف کر رہی تھی) اور کمرے سے نکل گئی۔

”زین میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی کبھی بھی نہیں اور نہ ہی زاروں تمہیں معاف کرے گا،“ سرگھٹنوں میں چھپائے نور نے سوچا اور ایک بار پھر سے روتے ہوئے احمد کے جلد آنے کی دعا کرنے لگی جو اسے آس دلانے کے بعد کہیں غائب ہو گیا تھا۔

سارہ نے کمرے سے نکلتے ہی اپنارخ سکندر صاحب کے کمرے کی جانب کیا تاکہ ان سے اپنے رویے کی معافی مانگ سکے جو پچھلے چند دنوں سے وہ ان کے ساتھ اختیار کیے ہوئے تھی۔ دستک دیتے وہ اندر داخل ہوئی تو حاشر بھی وہیں موجود تھا۔

”سارہ تم یہاں کیوں آئی ہو؟ میں نے کہا تھا نا کہ آرام کرو،“ حاشر جو سکندر صاحب کو سوپ پلا رہا تھا تاکہ انہیں میڈیسین دے سکے جو انہوں نے سارہ کی پریشانی میں راحیل کے لاکھ ملتیں کرنے پر بھی نہیں کھائی تھی۔

”ہاں، وہ میں ماموں سے بات کرنے آئی تھی،“ ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پیوست کرتے اُس نے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

”بات صحیح بھی ہو سکتی ہے اس لیے تم خاموشی سے اپنے کمرے میں جاؤ اور آرام کرو،“ پیالہ ٹبل پر رکھتے اُس نے سکندر صاحب کا منہ صاف کیا تو انہوں نے اشارے سے سارہ کو قریب بلا یا جو حاشر کے بار بار کہنے پر جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

”وہ ماموں میں آپ سے معافی مانگنے آئی تھی،“ نظریں جھکائے اُس نے سکندر صاحب کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں پکڑا۔

”ک۔۔۔س۔۔۔چ۔۔۔ج۔۔۔ز۔۔۔ک۔۔۔ی۔۔۔مع۔۔۔۔ف۔۔۔۔ی۔۔۔“، ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں انہوں نے سوال کیا تو سارہ نے جواب دینے کے بجائے ایک دم سے اُن کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتے رونا شروع کر دیا جس پر سکندر صاحب کے ساتھ ساتھ حاشر نے بھی حیرت سے اُسے دیکھا۔

”کیا ہوا؟ کچھ ہوا ہے کیا؟ میں شام سے دیکھ رہا ہوں کہ تم ایسے ہی پریشان ہو،“، حاشر نے کرسی کھینچ کر اُس کے قریب بیٹھتے کب سے اپنے ذہن میں گردش کرتے سوال کو زبان پر لاتے ہوئے پوچھا۔

”دنہیں، کچھ نہیں ہوا بس میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ ماموں پلیز مجھے معاف کر دیں میں نے پچھلے دنوں میں آپ کے ساتھ بہت بد تنبیزی کی۔ میں کچھ دیر کے لیے اپنا اصل بھول کر سود کے نشے میں یہ سمجھ بیٹھی کہ سود مجھے نفع دے گا پر درحقیقت سود تو انسان کی نسلوں تک کوکھوکھلا کر دیتا ہے اور اس دنیا میں بھی رسوائی کا سبب بنتا ہے اور آخرت میں بھی،“، نم آواز میں کہتے اُس نے آہٹ پر دروازے کی جانب دیکھا جہاں سے فریجہ بیگم اندر داخل ہوئیں۔

”پھوپھو کیا ہوا آپ کو اور یہ سارہ کیسی بتیں کر رہی ہے؟ کیا ہے یہ سب؟“، حاشر جو تمام باتوں سے انجان تھا اُس نے فریجہ بیگم کی روئی ہوئی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ٹھیک ہوں میں اور سارہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے میں نے آج تک اسے اپنوں کے بجائے پرائے لوگوں کو اہمیت دینا سکھایا اسے یہ بتایا کہ یہ رشتے کچھ نہیں ہوتے صرف دولت ہی سب کچھ ہے کیوں کہ اپنی زندگی کے ایک تلخ تجربے سے مجھے یہ احساس ہوا کہ رشتتوں کو جتنی مرضی اہمیت دے لو پروہ کبھی بھی آپ کے نہیں بنتے، جیسے کاشف نے طلاق دیتے ایک بار بھی میرے یا سارہ کے بارے میں نہیں سوچا اُس کے سر پرنی بیوی کی دولت کا ایسا نشہ چڑھا تھا کہ اُس نے میری سات سال کی ریاضتوں کو یوں خاک میں ملا دیا جیسے وہ سال نہیں بلکہ کچھ پل ہوں، تب ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بس مجھے

دولت چاہیے تاکہ میں اور میری بیٹی کبھی بھی کسی رشتے کی محتاج نہ ہوں پر میں یہ بھول گئی کہ اس دولت کے چکر میں وہ وہی سب دوہارا ہی ہوں جو کاشف نے کیا اُس نے میری زندگی بر باد کی اور میں اب اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کی زندگی بر باد کرنے چلی تھی۔ میں اپنے ساتھ کیے جانے والے ظلم کا بدلہ اپنی ہی بیٹی سے چکانے کی سوچ میں لگی یہ تک فراموش کر گئی کہ نقضان پھر بھی میرا ہی ہوگا، گھری سانس لیتے وہ سکندر صاحب کے پاؤں کے قریب بیٹھ گئیں جو حیرت سے کبھی سارہ کو اور کبھی فریجہ بیگم کو دیکھ رہے تھے۔

”بھائی صاحب مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کو بھی سب جیسا سمجھا حالانکہ آپ نے ساری زندگی سارہ کو اپنے بچوں پر فو قیت دی مجھے گھر کا سربراہ بنایا اور کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں یا سارہ آپ پر بوجھ ہیں،“ آنکھوں میں آنسو لیے انہوں نے اپنے ہاتھ سکندر صاحب کے پاؤں پر رکھ تو انہوں نے جلدی سے نفی میں سر ہلا�ا۔

”پھوپھو کیا کر رہی ہیں آپ؟ پلیز ایسا مت کریں اور اگر ابو نے آپ کا خیال کیا تو یہ اُن کا فرض تھا وہ بھائی ہیں آپ کے اور آپ نے بھی تو ساری زندگی ہمیں سن بھالا کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اس لیے پلیز آپ ایسا کر کے ہمیں شرمندہ مت کریں،“ حاثر نے اُن کے دونوں ہاتھ ہٹائے تو فریجہ بیگم اُس کے ساتھ لگتے پھوٹ پھوٹ کر روتے اپنے تمام بڑے رویوں کی معافی مانگنے لگیں۔

”کوئی بات نہیں پھوپھو آپ پلیز پریشان نہ ہوں اور چپ کر جائیں دیکھیں ابو بھی فکر مند ہو رہے ہیں،“ حاثر نے انہیں خود سے الگ کرتے سکندر صاحب کی جانب متوجہ کروایا جو اشارے سے انہیں اپنے پاس بُلا رہے تھے۔

”مجھے معاف کر دیں بھائی صاحب اگر امی ابو بھی ہوتے تو شاید مجھے اور سارہ کو اتنی سہولیات اتنا پیار نہ دیتے جتنا آپ نے دیا،“ اُن کے سینے پر سر کھتے آج جلن اور حسد سے ہٹ کر انہوں نے لجھے

میں بہنوں والا مان سموتے کہا تو سکندر صاحب نے آنکھوں میں نمی لیے اپنا ہاتھ اٹھا کر ان کے سر پر رکھا اور سارہ کو اشارے سے اپنے پاس بُلا یا جو تب سے رو رہی تھی۔

”پلیز ماموں ہمیں معاف کر دیں“، سارہ نے دوسری سائیڈ پر جاتے اپنا سر ان کے سینے پر رکھتے کہا تو سکندر صاحب نے آنکھوں میں نمی لیے حاشر کو دیکھا جو منہ بناتے خود ہی ان کے پاس آچکا تھا جو اب اپنی ٹوٹے پھولے الفاظ میں سارہ کو تسلی دے رہے تھے۔

☆☆☆

تمہینہ بیگم نے نیچے آتے ہی پروگرام کی وجہ سے زین کو کال کرتے پچھلے دروازے سے اندر آنے کا کہہ دیا جو وہاں پہنچ چکا تھا۔

”ٹھیک ہے میں بس پہنچ گیا ہوں بس تم دھیان رکھنا کوئی اوپر نہ آئے“، اُس کی بات سنتے ہی زین نے اپنی گاڑی پچھلے دروازے سے اندر لا کر گیراج میں کھڑی کی۔

”جی صاحب آپ بے فکر ہو کر اپنا کام کریں کوئی نہیں آئے گا“، شیرے کو اشارے سے اپنے قریب بلا تے اُس نے زین کو تسلی دی اور اسے اندر داخل ہوتا دیکھ کر موبائل کان سے ہٹایا۔

”زہے نصیب، شکر ہے زین صاحب آپ کی شکل دیکھنے کو ملی“، دانتوں کی نمائش کرتے اُس نے ایک ادا سے اُس کے سامنے آتے ہوئے کہا جو اپنے دھیان میں اندر آ رہا تھا۔

”پرمجھے تمہاری شکل میں کوئی دلچسپی نہیں اس لیے میرا وقت ضائع کرنے کے بجائے جو کہا ہے وہ کرو“، چند ہزار کے نوٹ اُس کے سامنے کرتے زین نے غصے سے کہا۔

”صاحب جی آپ تو ناراض ہی ہو گئے میں تو بس یونہی“، اپنی بے عزتی پر لال ہوتے تمہینہ بیگم نے وضاحت دی۔

”بس میں نے کہانا میرا وقت ضائع مت کرو اور کہاں ہے نور؟“، اُسے مزید کچھ بولنے کے لیے

منہ کھولتا دیکھ کر اس نے ٹوکا اور مطلب کی بات پر آتے سوال کیا۔

”جی اوپر ہے۔ شیرے، صاحب کو اوپر اس نئی لڑکی کے پاس چھوڑ آؤ“، بدمزہ ہوتے اس نے

شیرے سے کہا جوا ثبات میں سر ہلاتے زین کو گھر کے قدرے ویران حصے کی جانب لے گیا۔

نور کے رونے کا تسلسل شبنم کی آواز پر ٹوٹا جو اسے زین کے آنے کا بتاتے کمرے سے باہر نکل چکی

تھی۔

”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی اس نے میری زندگی بر باد کی میں اسے جان سے مار دوں گی“،

ڈرنے کے بجائے نور نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے اور کسی چیز کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی تو

بیڈ کے نیچے اسے ایک لوہے کا راؤ نظر آیا جسے اٹھاتے اس نے مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑا اور

دروازے کے پچھے جا کھڑی ہوئی جو شبنم نے ٹھیک دو منٹ بعد کھولا، جس سے اندر آتے شخص کا چہرہ

دیکھتے ہی اس کے ہاتھ میں موجود راڈ لرز۔

”کہاں ہو سویٹ ہارت؟“، ایک نظر خالی کمرے پر ڈالتے وہ مردا تو نور کو دروازے کے پاس گم صم

ساحیرت سے ہونتوں کی طرح منہ کھولے اپنی طرف متوجہ پایا۔

”تو تم بیہاں ہو، اور یہ راؤ لگتا ہے مجھے مارنے کا ارادہ رکھتی ہو“، آنکھوں میں کسی بھی قسم کی

شرمندگی کا تاثرا لائے بغیر اس نے راؤ پکڑ کر دور پھینکا۔

”تمہیں کیا لگا تھا تم اتنی آسانی سے مجھ سے نج جاؤ گی؟ زین تمہیں اتنی آسانی سے اپنی زندگی سے

جانے دے گا؟“، قدم آگے بڑھاتے اس نے نور کو چار قدم پیچھے ہونے پر مجبور کیا۔

”تم نہیں، تم زین نہیں ہو تم تو۔۔۔“، اس سے پہلے کہ نور مزید کچھ بولتی اس نے آگے بڑھتے اس

کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”نہ بے بی آج کوئی بات نہیں، آج صرف تم اور میں اور یہ رات“، اپنا چہرہ اس کے چہرے کے

قریب کرتے اُس نے اپنی بات مکمل کرتے اُس پہ جھکنا چاہا مگر اُس سے پہلے ہی نور نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے سینے پر رکھتے اُسے پیچھے کی جانب دھکیلا۔

”میرے قریب مت آنا میں تمہارا منہ توڑ دوں گی دروازے کی جانب بڑھتے اُس نے اُسے کھولتے باہر نکلنا چاہا مگر اُس سے پہلے ہی زین نے آگے بڑھتے نور کو بازوں سے پکڑتے بیڈ پر دھکا دیا اور دروازہ لاک کرتے زین سے لو ہے کاراڈ اٹھائے اُس کی جانب بڑھا جس کی آنکھوں میں اب وحشت آچکی تھی۔

”میں نے کہانا مجھ سے دور رہو، آنکھوں میں خوف لیے اُس نے راڈ کو دیکھا۔

”نہیں میری جان آج یہ ناممکن سی بات ہے کیوں کہ میں اس رات کے لیے پہلے ہی کافی انتظار کر چکا ہوں،“ زین نے آنکھوں میں سرخی لیے اُس کا پاؤں پکڑے اپنے جانب کھینچا تو دوپٹہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹتے بے ترتیب ہوا اور ایک چیخ اُس کے منہ سے نکلی جسے زین نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھتے روکا۔



”یہ زارون پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے،“ احمد نے سہیل کو سہارا دیتے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹایا جو نشے سے بالکل مددوш ہو چکا تھا۔

”کہا بھی تھا جلدی آ جانا،“ دروازہ بند کرتے اُس نے اپنا موبائل نکالتے زارون کا نمبر ڈیال کیا۔ ”یا کہاں ہوتم؟ میں نے کہا بھی تھا جلدی پہنچ جانا،“ دوسری طرف ہیلو کی آواز سنتے ہی احمد نے سوال کیا۔

”پہنچ گیا بس اُس کے قریب بریک لگاتے زارون نے موبائل ڈلیش بورڈ پر پھینکا اور اپنی گن نکالتے باہر آیا۔

”کہاں ہے نور؟“ زارون نے اُترتے ہی پوچھا تو احمد نے اپنے پچھے موجود کوٹھی کی جانب اشارہ کیا جو کہیں سے بھی کسی شریف گھر انے کی رہائش نہیں لگ رہی تھی۔

”کون سی جگہ ہے یہ؟“ زارون نے اندر کی جانب بڑھتے ہوئے سوال کیا پر احمد کے جواب دینے سے پہلے ہی وہاں موجود لوگ اور عورتیں اُسے اُس کی بات کا جواب دے گئیں۔

”نور یہاں ہے؟“ زارون نے رک کر احمد کی جانب دیکھا۔

”ہاں، وہاں اوپر،“ احمد نے شرمندگی سے سر جھکایا تو زارون کی آنکھوں میں خون اُترنے لگا اُس نے احمد کو اشارے سے چلنے کا کہا تو وہ سر جھکائے جلدی سے اندر کی جانب بڑھا اور تمہینہ بیگم بھی اُن کو اندر کی جانب جاتا دیکھ کر اپنے بندوں کو لیے اُن کے پیچھے لپکیں۔

”صاحب پروگرام وہاں چل رہا ہے اندر نہیں اور یہ ہمارا گھر ہے یہاں کوئی بھی میری اجازت کے بغیر نہیں جاسکتا،“ احمد کو دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی تھیں کہ معاملہ اُس کا ہی پھیلایا ہوا ہے کیوں کہ وہ جب سے نیچے آیا تھا تمہینہ بیگم کو وہ کچھ بے چین سا لگا۔

”میرے راستے سے ہٹ جاؤ،“ لہجے میں سختی لیے زارون نے سامنے کھڑی عورت کا لحاظ کیا اور ہاتھ کے بجائے زبان سے بات کی۔

”کیوں صاحب؟ میں کیوں ہٹوں یہ میرا گھر ہے یہاں سب میری مرضی سے ہو گا،“ آنکھوں میں تکبر لیے وہ بولی تو زارون نے گارڈز کو اشارے کیا جو تمہینہ بیگم اور اُس کے بندوں کو قابو میں کرتے ایک سائیڈ پر لے گئے تو زارون احمد کے پیچے اُس حصے کی جانب بڑھا جہاں نور کو رکھا گیا تھا۔

”اس کمرے میں تھیں،“ احمد نے اوپر آتے اشارہ کیا اور ساتھ ہی آگے بڑھتے کنڈی کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو دروازہ اندر سے بند تھا۔

”پیچھے ہٹو،“ زارون نے احمد کو مزید کسی بات کا موقع دیے بغیر ہی دروازے کو ایک زور دار دھکا مارا

تو وہ پرانے اور بوسید ہونے کی وجہ سے فوراً کھل گیا۔

”عالیان۔“ سامنے موجود شخص کو دیکھ کر جہاں زارون کی زبان ساکت ہوئی وہیں احمد نے اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے حیرت سے اُس کا نام پکارا جو ان دونوں کو وہاں دیکھ کر ہکابکارہ گیا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہ سب کرنے کی؟“ دوستی کا کوئی بھی لحاظ کیے بغیر زارون نے آگے بڑھتے اُسے گریبان سے پکڑا اور احمد نے بیڈ سے نیچے پڑا نور کا دوپٹہ اٹھا کے اُس کو تھما یا جسے اوڑھتے اُس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ آج احمد کی وجہ سے اُس کی عزت پچ گئی۔

”تمہاری جرأت کیسے ہوئی نور کو چھو نے کی؟“ اُسے گریبان سے پکڑ کے چھنجھوڑتے ہوئے زارون نے اُسے پیچھے کی جانب دھکا دیا جوا بھی تک سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا اُن دونوں کی وہاں آمد پر حیران تھا۔

”تم نے مجھ پر ہاتھ ڈالا ہوتا تو شاید میں تمہیں معاف کر دیتا پر تم نے میرے دل پر میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے جس کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا پر تمہیں سزا دینے سے پہلے میں یہ بات ضرور جاننا چاہوں گا کہ تم نے یہ سب کیوں کیا؟“ دوبارہ سے اُس کا گریبان پکڑتے زارون نے اپنے جبڑوں کو مضبوطی سے بند کرتے گن نکال کر اُس کے سر پر رکھی جوا بھی بھی پھٹی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”بولو کیوں تم اس حد تک گر گئے کہ تم نے دوستی جیسے پاکیزہ رشتے کو یوں اپنی ہوں کی نظر چڑھاتے مجھ سے اتنی بڑی غداری کی؟ کیا کمی تھی میری دوستی میں جو تم اس حد تک جانے پر مجبور ہو گئے؟ کیا گناہ کیا تھا میں نے جس کی تم نے مجھے اتنی بڑی سزا دی؟“ بولو عالیان میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔ اس سے پہلے کہ میرا دل پھٹ جائے بولو کیوں کیا تم نے ایسا؟“ آنکھوں میں نمی لیے زارون نے ایک دکھبری نظر اپنے جان سے پیارے دوست پر ڈالی جس کے لیے ان دس سالوں میں اُس نے کیا کچھ نہیں کیا

تھا۔

”زارون پلیز میری بات سنو، مجھے نہیں پتا تھا کہ بھاگھی ایسا کیوں کر رہی ہیں پر میں نے یہ سب ان کے کہنے پر کیا“، عالیان نے بڑی چالاکی کے ساتھ سارا الزام نور پر ڈالا جواب رونا بھول کے آنکھوں میں حیرت لیے اٹھی۔

”میں تو کب سے ان کو سمجھا رہا تھا پرانے کو بس ایک ہی رٹ لگی تھی کہ تم سے بدلا لینا ہے انہوں نے ہی مجھے مجبور کیا کہ میں ان کا ساتھ دوں، یہ بار بار مجھے دھمکیاں دے رہی تھیں کہ۔۔۔“ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بولتا نور نے ایک زور دار تھپڑاں کے گال پر جڑا۔

”بے شرم جھوٹے انسان اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی تمہیں سکون نہیں ملا۔ شرمندہ ہونے کے باجائے تم الٹا مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔ ٹھیک ہے اگر یہ سب میں نے کیا تو ثبوت دکھاؤ مجھے“ آنکھوں میں انتقام کی آگ لیے نور نے ایک اور تھپڑاں کے منہ پر مارا تو زارون نے آگے بڑھتے اُسے اپنے حصار میں لیا جو غصے سے پاگل ہوا رہی تھی۔

”زارون اُس دن مجھے زخم دینے والا یہی شخص تھا اسی نے تمہارے گھر میں گھس کر مجھے اتنی تکلیف دی تھی پر اُس وقت چہرے پر ماسک پہنے یا اپنی گھناوی کرت تو توں کے ساتھ اپنی شکل بھی چھپائے ہوئے تھاتب ہی میں اسے پہچان نہیں پائی پر آج میں اسے پہچان گئی اس نے تمہارے ساتھ ساتھ مجھ سے بھی گیم کھیلا، چار سال پورے چار سال اس نے مجھے اپنی دوستی کے شکنخ میں پھنسائے رکھا، آر جے زین کے نام سے اس نے میرا اعتبار جیتا اور میں پاگل اپنے گھر کے ماحول اور ہر وقت کی لعن طعن سے تنگ اس شخص پر یقین کر بیٹھی، اس سے اپنے تمام دکھشیر کرنے لگی کیوں کہ اُس وقت میرے گھروں نے مجھے اکیلا کر دیا تھا۔ میرے ابو جنہوں نے آج تک مجھے قبول نہیں کیا بچپن سے لے کر آج تک اس بات کا طعنہ دیا کہ میں اپنی ماں کو نگل گئی۔ میری پھوپھو، میرے بھائی کسی نے بھی تو آج تک میرا مان نہیں رکھا

تھا تو ان سب سے ہٹ کر مجھے اس شخص سے اپنایت ملی تو میں اس کی جانب کھنچی چلی گئی یہ سوچے اور جانے بغیر کہ یہ کون ہے، کیسا ہے میں نے تو کبھی بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے تو خود آج پتا چلا کہ یہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ تمہارا دوست ہے جس پر میں نے اعتبار کیا۔ مجھے لگا تھا یہ شخص مجھے کبھی بھی تنظیف نہیں دے گا پر میں غلط تھی اس نے آج مجھے اُس مقام پر کھڑا کر دیا ہے کہ میں زندگی میں چاہ کر بھی کبھی خود کو معاف نہیں کر سکتی، عالیان کے بتانے سے پہلے ہی نور نے سب کچھ اپنی زبان سے زارون کو بتایا جو اس انکشاف پر بس حیرت زدہ سا کھڑا نور کے چہرے کو تکتارہ گیا جواب چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپائے روانے لگی تھی۔

”زارون یہ جھوٹ بول رہی ہے میں نے اس سے کبھی بات نہیں کی یہ مجھ پر الزام ہے۔ مجھے پھنسانے کی سازش ہے، ہر طرف سے اپنے آپ کو کھرتا دیکھ کر عالیان نے جلدی سے وضاحت دی تو نور نے جہاں پوری آنکھیں کھولے حیرت سے اُسے دیکھا (جو اس بات کے ذریعے آسانی سے اپنا راستہ صاف کر سکتا تھا) وہیں زارون نے اُس کو ایک سائیڈ پر کرتے اپنارخ عالیان کی جانب کیا۔

”اب جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ جو نور نے بات کی ہے اُس کے بعد اب تم بھی جان گئے ہو کہ اب تمہاری کوئی بھی وضاحت کام نہیں آئے گی، نور کی بات سننے کے بعد بھی زارون کا اس حد تک اطمینان جہاں نور کو کسی غیر معمولی بات کا احساس دلارہا تھا وہیں احمد نے بھی اُسے حیرت سے دیکھا جو نور کے منہ سے اتنا بڑا انکشاف سُن کے بھی عالیان کے بجائے اُس پر یقین کر رہا تھا۔

”عالیان بولو کیوں کیا تم نے ایسا؟“ ضبط سے اپنی میٹھی بند کرتے اُس نے ایک بار پھر سے سوال کیا۔

”تمہیں نہیں پتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ اصل میں تمہیں پتا ہونا چاہیے تھا، ایک قہقہہ لگاتے اُس نے زارون کے چہرے کو دیکھا جو ضبط سے سرخ ہو رہا تھا۔

”وہ کیا ہے نا اگر زارون اپنی بے عزتی نہیں بھولتا تو عالیان کیسے بھول سکتا ہے؟“ شرمندہ ہونے کے بجائے اُس نے آنکھوں میں کرختگی لیے اپنے اندر کا زہر باہر نکالا۔

”اگر زارون کی عزت تھی نا تو عالیان کی بھی تھی پر زارون نے کیوں ہمیشہ اپنی عزت نفس کو بلند رکھتے ہر موقع پر عالیان کو ذلیل کیا؟ کیوں تم نے ہمیشہ مجھے سب کے سامنے نیچے دکھایا کیوں ہمیشہ مجھے پس پشت پھینکتے میری محنت کا کریڈٹ خود لیا؟ دیکھو ذرا میری بات سنو بنس کو چلانے میں کس کا ہاتھ تھا؟ میرانا؟ میری محنت تھی اُسے بلندی تک لے جانے میں پر تم نے کیا کیا؟ تم نے مجھے اونچائی پر دیکھ کر یہ سوچتے ہوئے کہ میں تم سے آگے نہ نکل جاؤں مجھے ایک معمولی سی پوسٹ پر اپنی کمپنی میں منیجر رکھ لیا اور روز مجھے اس بات کا طعنہ مارا کہ میں تمہارا دوست بعد میں منیجر پہلے ہوں، کیا میں نو کرتھا تمہارا؟ کیا میری کوئی محنت نہیں تھی؟ جو تم نے مجھے اتنا گرا ہوا سمجھ کر ہر جگہ ذلیل کیا۔ اُس دن ہسپتال میں تم نے سب لوگوں کے سامنے میرا اگر بیان پکڑا، کیا یہ تھی دوستی کہ تم جب چاہو جہاں بھی چاہو مجھے مارو۔ بے عزت کرو اور بعد میں یہ کہہ کر کہ میں دوست ہوں سب بھول جاؤں۔ نہیں زارون، نہیں تم نے پچھلے دس سالوں میں دوستی کی آڑ میں مجھے بہت بے عزت کر لیا اور میں نے بہت برداشت کر لیا اب تمہاری باری تھی تب ہی میں نے تمہاری سب سے قیمتی چیز پر ہاتھ ڈالا، بہت مان تھا نا تمہیں اپنی بیوی پہ کہ میں اُس کا نام نہ لوں اُسے دیکھوں نہ، تو دیکھو میں نے اُسے وہاں پہنچا دیا جہاں سے لے جانے کے بعد تم خود بھی اسے ہاتھ لگانے سے پہلے سو بار سوچو گے۔ طوائف بن چکی ہے تمہاری بیوی طوائف“، قہقہہ لگاتے عالیان نے اپنے اندر کی جلن کو باہر نکالا جو پچھلے دس سال سے زارون کے رویے کی وجہ سے جلن سے نفرت اور پھر انقام میں بدل چکی تھی۔

”تم اتنے گھٹیا نکلو گے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا اور اگر تمہیں اتنی ہی نفرت تھے تو تم مجھ سے بدلہ لیتے، میری جان لے لیتے زارون علی تمہیں پھر بھی معاف کر دیتا مگر عالیان تم نے میری دوستی کو نہیں بلکہ

میرے بھروسے، عزت، مان، یقین سب کو خاک میں ملا دیا، گن سیدھی اُس کی طرف کرتے زارون نے اُس کو مزید کسی بات کا موقع دیے بغیر احمد کے پکڑنے سے پہلے ہی لگاتار تین فائر کیے جو سیدھی اُس کے سینے اور پیٹ میں لگے۔

”زارون یہ کیا کیا تم نے؟“ احمد نے اُسے ہوش دلانا چاہا جس کا دماغ عالیان کی اصلیت جانتے کے بعد بالکل ماڈف ہو چکا تھا۔

”ٹھیک کیا میں نے، ایسے لوگوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے، قدم آگے بڑھاتے زارون نے اُس کا سراٹھا تے اپنی گود میں رکھا جو خون میں لٹ پڑا اپنے کی سزا بھگت چکا تھا۔

”مجھ سے ایک بار کہتے کہ تمہیں میرا یہ سب کرنا بُرالگتا ہے تو میں کبھی بھی تم سے ایسی بات نہ کرتا، میری جان مجھ سے بولتے تو سہی کہ تمہیں مینجھ نہیں بننا تو زارون کبھی تمہیں اُس جگہ نہ بٹھاتا، مجھ سے سب بولتے پر یہ سب نہ کرتے جو تم نے کیا، انتقام لینا تھا مجھ سے لیتے اس معصوم کا کیا قصور تھا جو پہلے ہی ساری زندگی بے قصور ہوتے ہوئے سزا بھگتی آئی تھی کیوں کیا تم نے ایسا عالیان؟ کیا میں اتنا بُرا تھا کہ تمہیں یہ سب کرنا پڑا؟ یا رتو میری جان لے لیتا زارون تجھے ہنسی خوشی معاف کر دیتا پر میری عزت پر ہاتھ نہ ڈالتا۔ جب تمہیں پتا تھا کہ زارون کی جان بستی ہے تم میں تو یہ سب کیوں کیا کیوں میری نظر وہ میں خود کو گرا یا؟“ اُس کا چہرہ اپنی طرف کرتے زارون نے سوال کیا تو عالیان نے با مشکل اپنی آنکھیں کھولیں جن میں درد کے ساتھ آنسو بھی تھے پر کچھ بولنے سے پہلے ہی اُس کی سانسیں اکھڑنے لگیں تو زارون کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”احمد پلیز کچھ کرو پلیز عالیان کو کچھ نہیں ہونا چاہیے،“ زارون نے تڑپتے ہوئے احمد سے کہا جو اُس کے سینے پر دباؤ ڈال رہا تھا پر برائی کا انجام ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔

”اٹھو گھر چلو،“ کچھ منٹ کو شش کرنے کے بعد بھی جب عالیان کی سانس بحال نہ ہوئی تو اُس

نے زارون سے کہا جوا بھی تک اُس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”مجھے کہیں نہیں جانا مجھے اس کے پاس رہنے دو یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے میں اپنے غصے کو قابو میں رکھتا تو آج عالیان یہ سب نہ کرتا“، اُس کے ٹھنڈے پڑتے جسم کو محسوس کرتے وہ احمد کے بتانے سے پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ عالیان مر چکا ہے۔

”پلیز یار چلو دیکھو نور کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے“، احمد نے پولیس کے آنے سے پہلے اُسے وہاں سے نکالنے کی کوشش کی پروہ بار بار عالیان کے چہرے کو دیکھتے آنسو بہار رہا تھا۔

”زارون چلو“، احمد نے نور کے زرد پڑتے رنگ کو دیکھتے (جو عالیان کے طوائف لفظ کے بعد نہ کچھ سن پائی تھی اور نہ ہی سمجھ بس بت بنے کھڑی اُس لفظ پر غور کر رہی تھی جو عالیان نے اُس کے لیے بولا تھا) زارون سے کہا تو وہ آنکھیں صاف کرتے اٹھا اور نور کا دو پہنچیک سے اُس کے سر پر اڑھاتے اُسے لیے نیچے آ گیا جہاں اُس کے گارڈ زا بھی بھی تہمینہ بیگم اور اُس کے بندوں کو قابو کیے کھڑے تھے۔

”آتے ہوئے اوپر کمرے سے عالیان کو اپنے ساتھ لے آنا کیوں کہ میں نہیں چاہتا اپنی زندگی کی طرح وہ مر کر بھی مجھ سے نفرت کرے“، اکرم سے کہتے وہ نور کو لے کر آگے بڑھا جو ایک زندہ لاش کی ماند اُس کے ساتھ چل رہی تھی۔



ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی زارون کی خاموشی نہیں ٹوٹی تھی وہ نور کو گھر لانے کے بعد اُس سے بالکل بے نیاز خود کو کمرے میں بند کیے ہوئے تھا۔ اخشم صاحب کے ساتھ ساتھ ساجدہ بیگم نے بھی کافی بار اُسے سمجھا نے کی کوشش کی (جو نور کے منہ سے سب جان چکے تھے عالیان کی یہ حرکت جہاں سب کے لیے حیران کن تھی وہیں زارون کے ہاتھوں اُس کی موت بھی ایک ناقابل فراموش بات تھی) پر وہ اپنی چپ برقرار رکھے کسی رو بوٹ کی مانند بیٹھا اُن کی باتیں اور نصیحتیں سنتا رہتا۔ نور بھی اُس دن کے

بعد سے کافی چپ تھی اور زارون کے سامنے بھی نہیں گئی حالانکہ دی جان اُسے کافی بار زارون کے پاس جانے کا بول چکی تھیں پر وہ ہر بار کل جاؤں گی بول کر ٹال دیتی۔ وہ دونوں ایک ہی گھر میں ایک ہی چھت تلے رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو چکے تھے۔ زارون جہاں اپنے ہی دکھ میں پوری دنیا کو بھلائے بیٹھا تھا وہیں نور عالیان کے الفاظ کو سوچتے شرمندگی کے باعث زارون کا سامنا کرنے سے کترار ہی تھی۔

”نور بیٹا ایسے کیوں بیٹھی ہو طبیعت ٹھیک ہے نا؟“ ساجدہ بیگم سکندر صاحب اور شہناز بیگم کو گاؤں کے لیے روانہ کرتے خود کمرے میں واپس آئیں تو انہوں نے نور کو چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔ ”جی ٹھیک ہوں میں۔ بس ویسے ہی بیٹھی تھی،“ سران کی گود میں رکھتے وہ بیڈ پر لیٹ گئی۔

”نور میری جان، اب تمہیں زارون کے پاس اپنے کمرے میں چلے جانا چاہیے کیوں کہ اس وقت اُسے کسی اپنے کی ضرورت ہے جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلاکا کر سکے اور میں جانتی ہوں وہ میرے یا احشام کے سامنے ایک آنسو نہیں بہائے گا پر تمہارے سامنے وہ سب بول دے گا اس لیے اب زیادہ دیرمیت کرو اُس کے پاس جاؤ کیوں کہ اس بار پہل تمہیں ہی کرنی پڑے گی،“ ساجدہ بیگم نے اُس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے بہت نرمی سے اپنی بات سمجھائی۔

”دی جان مجھ میں حوصلہ نہیں ہے زارون کا سامنا کرنے کا،“ سرانٹھاتے اُس نے ساجدہ بیگم کا ہاتھ اپنے سرد ہوتے ہاتھوں میں لیتے نظریں جھکائے ٹوٹے پھوٹے سے لبھ میں اپنی بات مکمل کی۔

”کیوں حوصلہ نہیں ہے؟ دیکھو نور عورت کی سب سے بڑی طاقت یہی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اُس وقت سنبھالے جب وہ ٹوٹا ہوا ہو اور زارون اس وقت جس حال میں ہے تمہارے علاوہ اُسے کوئی نہیں سنبھال سکتا۔“

”پر دی جان وہ مجھے جہاں سے لے کر آیا ہے مجھے نہیں لگتا ہے وہ اب میری شکل بھی دیکھنا چاہے ہے۔“

گا،“ ساجدہ بیگم کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نور نے اپنا خدا شہ ظاہر کیا۔

”اور مجھے لگتا ہے وہ تمہارا ہی انتظار کر رہا ہے کہ تم اُس کے پاس آؤ تو وہ اپنے اندر کی درد اور تکلیف تم سے بیان کر سکے اس لیے اپنے دل و دماغ میں شیطان کے ڈالے و سوسوں کو جگہ مت دو اور اٹھو جاؤ اُس کے پاس، سنجا لو اُس کو اور جا کر دیکھو اُس نے ایک ہی ہفتے میں اپنی کیا حالت بنالی ہے،“ آنکھوں میں نمی لیے دی جان نے اس بارا پنے لبھ کو سخت کرتے نور سے کہا جوان کی بات سنتے ہی اشبات میں سر ہلاتے اٹھی مگر کمرے سے نکلتے ہی ہزار خدشوں نے اُس کے دل میں سر اٹھایا جسے دبانے کی کوشش میں آنسو بے آواز ہی بندوق ٹرنے لگے۔

”نہیں، میں نہیں جا سکتی مجھے پتا ہے زارون مجھے اب کبھی قبول نہیں کرے گا،“ دروازے پر ہاتھ رکھتے وہ ایک بار پھر سے اپنے ارادے میں ڈگمگائی پر دی جان کی بات یاد آتے ہی اُس نے ہاتھ کی پشت سے آنسوؤں کو رگڑا اور ہمت کر کے دروازے پر دستک دیتے اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور بیڈ کی جانب قدم بڑھائے جہاں زارون دوسری طرف کروٹ لیے لیٹا تھا۔

”زارون،“ اُس کے قریب جاتے نور نے بے آواز اُسے پکارا جو آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

”زارون،“ ہمت کر کے اُس کے پاس بیٹھتے نور نے پھر سے اُسے پکارا جو پہلے کی نسبت کافی کمزور ہو چکا تھا۔

”کیوں آئی ہو تم یہاں؟“ اُس کی آواز سنتے ہی زارون نے آنکھیں کھولتے بھڑکتے ہوئے کہا۔

”وہ میں، وہ دی جان نے،“ نور نے کچھ بولنا چاہا مگر الفاظ اُس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

”کیا وہ میں، میں پوچھ رہا ہوں تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے کمرے میں آنے کی،“ اٹھ کر بیٹھ کے اُس نے نور کا ہاتھ پکڑتے اُسے بیڈ پر بٹھایا جو زارون کے غصہ کرنے پر اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”وہ مجھے دی جان نے کہا تھا،“ ڈبڈ بائی آنکھوں سے زارون کے چہرے کے سخت تاثرات دیکھتے اُس نے وضاحت دی۔

”تو مطلب تم آج بھی دی جان کے کہنے پر میرے پاس آئی ہو؟“ اُس کے بازو سے ہاتھ ہٹاتے آنکھوں میں افسوس لیے اُس نے سر جھٹکا۔  
”دنہیں میں وہ خود ہی آنا چاہ رہی تھی پر۔۔۔“

”کیا پر؟“ اُسے بات بات میں اٹکتا دیکھ کر زارون نے ابر واچکا تے پوچھا۔  
”پرمجھے لگا کہ تم اب مجھے قبول نہیں کرو گے،“ نظریں چراتے اُس نے کہا تو زارون نے پیچھے بیڈ کے ساتھ ٹیک لگاتے اُسے دیکھا جوابی بات جاری رکھے ہوئے تھی۔

”مجھے لگا کہ اب میں شاید اس قابل نہیں رہی کہ تمہارے قریب آسکوں۔ میں تمہیں اپنے کردار کی صفائی نہیں دے رہی بس تمہارا حق ہے اس لیے بتا رہی ہوں کہ مجھے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا میں جیسی پاک تھی ویسی ہی ہوں،“ اپنے آنسوؤں کو اندر اتراتے نہ چاہتے ہوئے بھی نور نے وہ بات کہی جس سے اُس سے کہیں زیادہ زارون کو تکلیف ہوئی۔

”مطلب تم مجھے ایسا سمجھتی ہو کہ میں تم سے تمہارے کردار کی صفائی مانگوں گا؟“  
”نہیں پر میں جس جگہ پر تھی وہاں سے آ کر کردار کی صفائیاں دینا بھی کام نہیں آتا،“ اُس کا سوال سنتے ہی نور نے نظریں اٹھائے اُسے دیکھا جواب سینے پر ہاتھ باندھے پوری طرح اُس کی جانب متوجہ تھا۔

”ٹھیک ہے جب تمہیں سب پتا ہے تو مجھے پھر صفائیاں دینے کا فائدہ؟ جب تم سب جانتی ہو کہ میں تمہیں قبول نہیں کروں گا تو کیوں آئی ہو میرے پاس؟“ اُس کا چہرہ اپنے چہرے کے قریب کرتے زارون نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”بس یہ کہنے کے بے شک تم مجھے کبھی مت اپنا ناپر پلیزا اپنا نام میرے نام سے الگ مت کرنا کیوں کہ میرا تمہارے سوا کوئی نہیں ہے، اُس کے سینے پر عین دل کے مقام پر ہاتھ رکھتے نور نے آنکھوں میں بے بسی لیے کہا تو زارون نے اُس کا ہاتھ ہٹاتے اپنے آپ سے دور کیا۔

”دوبارہ میرے کمرے میں مت آنا“، بید سے اٹھتے ٹیرس کے دروازے کے پاس کھڑے ہوتے ہوئے زارون نے کہا تو نور نے بے یقینی سے اُس کی پشت کو دیکھا جواب پوری زندگی کے لیے اُس سے منہ موڑ چکا تھا۔

”ٹھیک ہے نہیں آؤں گی۔ میں دی جان کے ساتھ گاؤں چلی جاؤں گی۔ تم یہاں اپنی زندگی کسی کے بھی ساتھ گزار سکتے ہو۔ نور تم سے کبھی کوئی شکوہ یا شکایت نہیں کرے گی“، اپنی بات مکمل کرتے وہ بے جان قدم اٹھاتے کمرے سے باہر نکل گئی تو زارون نے پلٹ کر دروازے کو دیکھا جہاں سے ابھی ابھی وہ دشمن جاں اپنا فیصلہ سُنا کے جا چکی تھی۔



ساجدہ بیگم کے منع کرنے اور سمجھانے کے باوجود بھی نور نے ہار نہیں مانی اور ان کے ساتھ گاؤں جانے پر بصدر ہی۔ نور کا فیصلہ ان کی سمجھ سے باہر تھا اُنہوں نے زارون سے بھی بات کی کہ وہ نور کو سمجھائے پر اُس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ، ”یہ نور کا اپنا فیصلہ ہے وہ اب اُس پر کوئی زور زبردستی نہیں کرے گا اس لیے اُس سے جیسے ٹھیک لگتا ہے وہ کرے جہاں خوشی ملتی ہے وہاں رہے“۔

اُن دونوں کی باتیں ساجدہ بیگم کی سمجھ سے باہر تھیں تب ہی اُنہوں نے بھی نور کے فیصلہ پر ہامی بھری اور اُس ساتھ لیے گاؤں آگئیں جہاں احتشام صاحب اور شہنماز بیگم جہاں نور کے آنے پر خوش تھے وہیں زارون کے نہ آنے پر خفا بھی تب ہی شہنماز بیگم نے اُسے فون کرتے ڈالنا کہ اُس نے نور کو اسکیلے گاؤں بھیج دیا۔

”وہ اپنی خوشی سے گئی ہے اور میں بھی آنا چاہتا تھا پر امی مجھے یہاں ہزار کام ہیں پچھلے دو ہفتوں سے میں نے اپنے بنس کو نہیں دیکھا بس اُسے دیکھوں گا اور کچھ ضروری کام ہیں وہ ختم کرتے ہی گاؤں آجائے گا آپ پریشان نہ ہوں،“ شہناز بیگم کو جھوٹی تسلی دیتے جہاں نور نے ساجدہ بیگم سے اپنے اور زارون کے نقچ ہونے والی باتوں کا ذکر نہیں کیا تھا وہیں زارون نے بھی اُس راز کو فاش کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

نور کو گاؤں آئے پورا ایک مہینہ گزر چکا تھا پر اس ایک مہینے میں زارون نے ایک بار بھی اُسے پلت کر نہیں دیکھا اور نہ ہی اُسے کوئی کال یا مسیح کیا۔ دن گزر نے کے ساتھ نور کی ہرامید جواب دے چکی۔ سارا دن وہ شہناز بیگم اور ساجدہ بیگم کے ساتھ باتوں اور مختلف کاموں میں مصروف رہتی پر رات ہوتے ہی ایک بار پھر سے تمام پرانی یادیں تازہ ہونے لگتیں تو انہی غلطیوں پر پچھتنا نے کے علاوہ اُس کے پاس کچھ نہ بختا۔ آج بھی وہ تحکم ہار کر اپنے کمرے میں آئی تو بیڈ پر لیتے ہی اُسے زارون کی یاد ستانے لگی جس نے اُس سے ایسا منہ موڑا کے ہر رابطہ ہی ختم کر دیا۔

”کاش میں نے خدیجہ کا اعتبار نہ کیا ہوتا، کاش میں نے زارون کی بات مان لی ہوتی تو آج میرے ساتھ ایسا نہ ہوتا،“ ہر رات کی طرح آج بھی آنسو بند توڑتے اُس کے بالوں میں جذب ہونے لگے تو دل کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے اُس نے اٹھ کر وضو کیا اور جائے نماز بچھاتے گڑ گڑاتے ہوئے اپنے رب کے حضور زارون کا دل نرم پڑنے کی دعا کرنے لگی۔



پچھلے ایک مہینے میں اپنے کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود بھی زارون نے نور کو ہر پل یاد کیا تھا، اُس کے پاس جانے کی خواہش ہر روز دل میں جوش مارتی پر اُس کی بے اعتباری نے ایسے قدم باندھے کے دل کو سختی سے خاموش کرواتے وہ اُس کے حال پر چھوڑ چکا تھا پر آج آج آفس سے آنے

کے بعد اسے کچھ زیادہ ہی نور کی یادستائی تو اس نے اپنے موبائل سے دی جان کا نمبر ڈائل کیا تاکہ اس دشمن جان کی کوئی توبات اس کے کانوں کو ٹھنڈک دے پر بار بار فون ملانے کے باوجود بھی جب دی جان نے کال ریسیو نہیں کی تو وزارون کو پریشانی ہوئی تب ہی اس نے گھر کے نمبر پر فون کیا جس پر بھی اتنی بیل جانے کے بعد کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”مجھے پتا ہے یہ سب مجھے ہو یہی بلانے کی سازش ہے پر میں بھی کسی کے بہکاوے میں نہیں آنے والا“، شہناز بیگم کا نمبر ٹرائی کرنے کے بعد وہ ان سب کی چال سمجھ چکا تھا تب ہی خود کلامی کرتے موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھ کے باہر آیا تاکہ کچھ کھاپی سکے پر کچن میں قدم رکھتے ہی بیرونی دروازے پر ہونے والی بیل نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”اُفف یہ کون آگیا اس وقت“، واپس ملٹتے اس نے جھنجھلاتے ہوئے سوچا اور کچن سے باہر آتے دروازے کی جانب بڑھا تو پرنسز پہلے ہی دروازے کے پاس کھڑی تھی۔

”کون؟“

”تم تو پیچھے ہٹ جاؤ“، اُسے دروازے کے آگے بیٹھا دیکھ کر زارون نے اپنی گود میں اٹھایا اور دوسری طرف کوئی جواب نہ پا کر دروازہ کھولا تو سامنے سکندر ر صاحب کے ساتھ حارت، حاثر، فریجہ بیگم اور سارہ کو دیکھ کر ایک دم بوکھلا سا گیا۔

”السلام علیکم“، حارت آگے بڑھتے مصافحہ کرنے کے بجائے اس سے بغل گیر ہوا تو زارون نے پرنسز کو چھوڑتے حیرت سے اُسے دیکھا۔

”اندر آنے کا نہیں کہو گے؟“، حاثر نے بھی آگے بڑھتے حارت کی ہی طرح اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے پوچھا جو دروازے کے سامنے جم کر کھڑا تھا۔

”جی آئیں“، ہوش میں آتے ہی اس نے انہیں گزرنے کا راستہ دیا۔

”بہت مشکل سے ملا ہے آپ کا گھر“، حارت نے صوف پر بیٹھتے نور کی تلاش میں نظر دوڑاتے ہوئے بتایا۔

”جی جو رشتہ اور راستے انسان اپنے ہاتھوں سے گناہ دے اُن کا ملنا تھوڑا مشکل ہی ہوتا ہے“، حارت کی بات سنتے ہی زارون نے لمحے میں کسی قسم کا کوئی طنز یا شکوہ لیے بغیر نرمی سے کہا۔

”ہاں اگر کوشش کی جائے تو راستے مل جاتے ہیں اور رشتے بھی۔ جیسے ہمیں مل گئے“، حارت نے اُس کے انداز میں جواب دیا تو زارون نے اُس کی بات سنتے ہلکی سے مسکراہٹ چہرے پر سجا تے ہوئے سر ہلا کیا۔

”نور کہاں ہے؟ نظر نہیں آ رہی“، حاشرنے بے صبری سے سوال کیا۔

”وہ میری دادی جان کے ساتھ گاؤں گئی ہے میرے والدین اور دادی گاؤں میں رہتے ہیں اور میں اپنے بزرگسست کے سلسلے میں یہاں ہوتا ہوں“، زارون نے بتانے کے ساتھ ہی ایک نظر فریجہ بیگم پر ڈالتے کچن کارخ کیا تاکہ اُن کے لیے جوں وغیرہ لا سکے تو سارہ فریجہ بیگم کے کہنے پر اٹھ کر اُس کے پیچھے آ گئی۔

”بھائی لا نیں میں ڈال دیتی ہوں“، سارہ نے کچن میں آتے ہی نرمی سے کہا تو زارون کو اُن سب کے اتنے میٹھے اور بد لے ہوئے لمحہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔

”پریشان نہ ہوں میں کرلوں گی“، سارہ نے اُسے اپنی جانب دیکھتا پا کر کہا تو زارون نے نفی میں سر ہلا کیا۔

”نہیں، کوئی بات نہیں میں کرلوں گا آپ مہمان ہیں۔ انسان اب مہمانوں سے کام کرواتے اچھا تھوڑی لگتا ہے“، جلدی جلدی تمام گلاسوں میں جوں ڈالتے اُس نے سارہ کا دل توڑنے کے بجائے نرمی سے کہا۔

”میں مہماں تھوڑی ہوں اور میرے ہوتے ہوئے آپ کام کریں گے تو مجھے اچھا نہیں لگے گا،“  
ٹرے اُس کے ہاتھ سے پکڑتے اُس نے کہا تو زارون نے کندھے اچکائے اور باہر کی جانب بڑھا تو  
سارہ نے ٹرے لا کر ٹیبل پر رکھتے سب کو جو سر و کیا۔

”کب تک آئے گی نور؟“، زارون کے بیٹھتے ہی فریحہ بیگم نے پوچھا۔

”یہ نہیں پتا، ہو سکتا ہے کچھ دن رکے ابھی،“، اپنے رویے سے نور کی اور اپنی کوئی بھی ناراضی ظاہر  
کیے بغیر اُس نے جواب دیا تو فریحہ بیگم نے اُس سے اپنے اُس دن کے رویے کی معافی مانگی۔

”کوئی بات نہیں آنٹی بس پرانی باتوں کو چھوڑ دیں اب،“، زارون نے اُن کے ساتھ ساتھ سکندر  
صاحب کا بھی دل ہلکا کیا جو اپنے کیے پر شرمندہ تھے۔

”پھر بھی ہمیں سمجھنا چاہیے تھا میں نے تم سے کافی بد تمیزی کی حالانکہ قصور و ارتاؤ ہم بھی تھے کہ ہم  
نے کبھی نور کو اتنی اجازت ہی نہیں دی کہ وہ ہم سے اپنے دل کی کوئی بات کر سکے،“، حاشر نے بھی اپنی غلطی  
کا اعتراف کیا تو زارون نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

”کوئی بات نہیں یا قصور میرا تھا۔ میں نے غلط طریقے سے نور کو حاصل کرنا چاہا اور اُسے آپ سب  
کی نظروں میں بُرا بنادیا حالانکہ اُس کا کوئی قصور بھی نہیں تھا،“، زارون نے نظریں جھکائے کہا تو سب نے  
گزری باتوں پر مٹی ڈالنے کا کہتے اُسے معاف کر دیا اور حارث کی شادی کا بتاتے اُسے نور کے ساتھ گھر  
آنے کا کہا جس پر زارون نے ہامی بھرتے مزید ایک گھنٹہ ان سے باقی کیس جو کچھ دریٹھرنے کے بعد  
وہاں سے چلے گئے تو زارون نے کھانے کا ارادہ ترک کرتے کمرے کا رخ کیا اور موبائل اٹھاتے نور کی  
تصویر زکا می۔

”آج جب سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے تو تم میرے پاس نہیں ہو۔ کاش کہ تم نے مجھ پر تھوڑا سا اعتبار  
کیا ہوتا مجھے بتایا ہوتا تو میں تمہیں کبھی اُس دلدل میں سچنسنے نہ دیتا۔ کاش تمہیں اپنے آر جے پر تھوڑا سا

یقین ہوتا تو تم اتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتیں، بیڈ پر لیٹتے ہی زارون نے موبائل اپنے سینے سے لگاتے اُس سے شکوہ کیا جو وہ پچھے گزرے ہوئے دنوں میں ہزار بار کر چکا تھا۔



اگلی صبح زارون نے اپنے کچھ کام ختم کیے اور ڈی ایس پی اقبال (اختشام صاحب کے دوست) کے پیغام پر اُن سے ملنے پولیس اسٹیشن کی جانب بڑھا جنہوں نے عالیان کی موت کو پولیس مقابلے کی شکل دیتے زارون کو آسانی سے اُس مسئلے سے نکال دیا تھا۔

”السلام علیکم“، اُن سے مصافحہ کرتے وہ سامنے والی چیز سنبھالتے بیٹھ گیا۔

”کیسے ہو؟“ سلام کا جواب دیتے ڈی ایس پی اقبال نے سوال کیا۔

”جی ٹھیک ہوں“، مختصر سا جواب دیتے زارون نے اُن کی طرف دیکھا جو کریڈل سے فون اٹھاتے دوسری طرف کا نشیبل کو دو کپ چائے لانے کا بول چکے تھے۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی انکل“، زارون نے انہیں فون واپس رکھتا دیکھ کر کہا تو ڈی ایس پی اقبال نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کیا۔

”ضرورت تھی، کیوں کہ بات کافی لمبی ہے اس لیے مجھے لگا تمہیں میری باتیں سننے کے بعد چائے کی ضرورت پڑے گی“، آنکھوں میں تجسس لیے انہوں نے پھر سے فون اٹھایا اور امجد کو کسی لڑکی کو اندر لانے کا کہا۔

”سب خیریت ہے نا؟“ چہرے پر فکرمندی کے آثار لیے زارون نے پوچھا تو ڈی ایس پی نے جواب دینے کے بجائے دروازے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے ایک لیڈی کا نشیبل کے ساتھ خدیجہ کو اندر آتا دیکھ کر زارون حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات چہرے پہ سجائے کرسی سے اٹھا۔

”بیٹھ جاؤ اور اپنے غصے کو قابو میں رکھو“، زارون کے چہرے پر سختی دیکھ کر ڈی ایس پی اقبال نے

لیڈی کا نشیبل کو خدیجہ کو لے جانے کا کہا جس نے زارون کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔

”یہ کہاں سے ملی آپ کو؟“ غصے کے باعث آنکھوں میں سرخی لیے زارون نے پوچھا تو ڈی ایس پی اقبال اپنی چیئر چھوڑتے اٹھ کر اُس کے قریب آئے جس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خدیجہ کو وہیں کھڑے کھڑے زمین میں گاڑ دیتا۔

”پانی پیا اور اپنے غصے کو تھوڑا اٹھنڈا کروتا کہ میری تمام باتیں سن کے سمجھ سکو،“ جگ سے پانی گلاس میں انڈیلتے انہوں نے زارون کے آگے رکھا تو اُس نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر ڈالا۔

”یہ ہمیں کراچی کے ایک فاشی کے اڈے سے ملی ہے جس پر ابھی کچھ دن پہلے ہی کراچی پولیس نے چھاپا رہا تھا۔ میں نے تمام بڑے تھانوں میں اس کی تصویر بھی تھی اسی لیے اس کے ملتے ہی ان لوگوں نے مجھے انفارم کیا تو میں نے اسے اُس تھانے سے بیہاں شفت کروالیا تاکہ اپنے طریقے سے سب کچھ اگلوں سکوں پر جو کچھ اس نے بتایا تھیں وہ جان کر دکھ بھی ہو گا اور شاید تمہارا دل بھی مطمئن ہو جائے کہ تم نے عالیان کو مار کر کوئی غلطی نہیں کی،“ اپنی چیئر سنبھالتے ڈی ایس پی اقبال نے بات کا آغاز کیا تو زارون پوری طرح سے اُن کی طرف متوجہ ہوا۔

”مطلوب کیسا اطمینان؟ کیسا دکھ؟“ نامجھی سے اُن کی جانب دیکھتے زارون نے آنکھوں میں الجھن لیے سوال کیا۔

”دکھ اس بات کا کہ عالیان اپنی ہوس میں آ کر تقریباً بیس سے پچس لڑکیوں کی زندگی تباہ کر چکا تھا۔ وہ بھی اس خدیجہ کے ذریعے جو پہلے معصوم لڑکیوں سے دوستی کرتی اور پھر اسے اسی طرح کسی فاشی کی جگہ پر لے جاتی جہاں عالیان انہیں استعمال کرنے کے بعد آگے نچ دیتا اور یہ سلسلہ پچھلے ایک سال سے چل رہا تھا جس کا پورا ریکارڈ میں عالیان کی سم اور کائز سے اکٹھا کر چکا ہوں،“ پورے ثبوت کے

ساتھ زارون کے سامنے عالیان کی سم اور ان تمام لڑکیوں کا بائیوڈیٹار کھتے (جن کو عالیان اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد تھمینہ بیگم کے علاوہ چار مختلف جگہوں پر نیچ چکا تھا) ڈی ایس پی اقبال نے اُسے تمام تفصیل سے آگاہ کیا جس کی آنکھیں بے یقینی اور حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا میں نہیں مانتا عالیان ایسا کیسے کرسکتا ہے۔ ہاں جب ہم باہر تھے تو اُسے ایسی عادت تھی وہ ہر لڑکی پر مرٹتا، پر وہ ایسا نہیں تھا۔ میرا دل نہیں مانتا۔ یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے،“، زارون نے بے یقینی کی سی کیفیت میں اپنے سامنے پڑے ثبوتوں کو درگزرا کرتے ڈی ایس پی اقبال سے کہا جو اُس سے ایسے ہی کسی جواب کی توقع کر رہے تھے۔

”مجھے بھی یہی لگا تھا پران لڑکیوں میں سے تقریباً چار سے میں مل چکا ہوں اور اب وہ میرے پاس ہی ہیں۔ اُن کی عمر تقریباً اٹھارہ سے بیس سال کے درمیان ہے اور انہوں نے عالیان کی تصویر دیکھتے ہی اپنے منہ سے سب بتایا ہے اگر تم سننا چاہو تو میں انہیں یہاں بلا سکتا ہوں،“، پورے یقین کے ساتھ تمام خفاائق اُس کے سامنے رکھتے انہوں نے زارون سے اُس کی مرضی پوچھی جواب بھی تک بے یقینی کی سی کیفیت میں گھرا یہ سوچ رہا تھا کہ عالیان کو اتنے قریب سے جاننے اور اتنا عرصہ اُس کے ساتھ رہنے کے باوجود بھی وہ یہ سب کیوں نہیں جان پایا کہ اُس کا دوست بار بار کراچی اور دوسرے شہروں میں کیوں جاتا ہے۔ وہ رات رات بھر باہر کیوں رہتا ہے اور جس سے وہ فون پہ گھنٹوں بات کرتا تھا وہ کون ہے؟

”کیا ہوا زارون تم ٹھیک ہونا؟“، اُسے کسی گھری سوچ میں گم دیکھ کر ڈی ایس پی اقبال نے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی، ٹھیک ہوں، بس یہ سوچ رہا ہوں کہ جب وہ روز کسی نئی لڑکی سے بات کرتا تھا تو میں نے پوچھا کیوں نہیں؟ کیوں میں نے اُسے اس دلدل میں اُترنے دیا؟ حالانکہ اُس نے تو مجھے کئی بار سختی سے اپنا موبائل چیک کرنے سے روکا تھا کافی بار تو ہمارا اس بات پہ جھگڑا بھی ہوا پر میں نے اس بات پہ کبھی

غور، ہی نہیں کیا،“، زارون نے سوچتے ہوئے اپنے دماغ میں چلنے والی باتوں سے ڈی ایس پی اقبال کو آگاہ کیا جو اس کی حالت دیکھ کر اس کی اندر کی تکلیف کا اندازہ لگا سکتے تھے۔

”ہو جاتا ہے ایسا، کبھی کبھی ہم اپنے اندر کے انسان کو پہچان نہیں پاتے تو وہ تو پھر بھی تم سے ایک الگ جسم الگ روح کا مالک تھا جس نے حسد، جلن اور انتقام کی آگ میں آ کر اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ آخرت بھی خراب کر لی۔ بس اللہ پاک ہم سب کو ایسی موت سے بچائے جس کے بعد بھی لوگ ہمیں ہماری اچھائیوں سے نہیں بلکہ برا نیوں سے یاد کریں،“ ڈی ایس پی اقبال نے دعا کی تو زارون نے آمین کہتے اُن سے اجازت طلب کی جو چائے آنے پر اُسے دوبارہ سے بٹھا چکے تھے۔

☆☆☆

”نور ادھر آؤ میرے پاس،“ دی جان صحیح سے ہی اُسے دیکھ رہی تھیں جس کی سوجی ہوئی آنکھیں ساری رات جا گئے اور رونے کی چغلی کھارہ تھیں۔

”کیا ہوا طبیعت ٹھیک ہے؟“ اُس کو تخت پر اپنے پاس بٹھاتے ہی انہوں نے سوال کیا تو نور نے زبان کے بجائے سر ہلانے ہرا کتفا کیا۔

”مجھے نہیں لگ رہا کہ تم ٹھیک ہو یا پھر میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ جب سے تم یہاں آئی ہو مجھے ایک بھی دن نہیں لگا کہ تم ٹھیک ہو،“ ساجدہ بیگم نے جانچتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا جو چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجانے میں بُری طرح ناکام ہو چکی تھی۔

”کیا ہوا زارون کی وجہ سے پریشان ہو؟“ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر ساجدہ بیگم نے اندازہ لگایا تو نور نے جواب دینے کے بجائے اُن کے گلے لگتے رونا شروع کر دیا۔

”نور میری جان کیا ہوا ہے؟ ایسے کیوں رور، ہی ہو کسی نے کچھ کہا ہے؟ شہناز نے تو کچھ نہیں کہا؟ مجھے بتاؤ میں اُس کے کان کھینچوں گی جس نے میری بیٹی کا دل دکھایا،“ ساجدہ بیگم نے اُسے اس

طرح روتا دیکھ کر فکر مندی سے پوچھا۔

”کسی نے کچھ نہیں کہا دی جان“، نور نے رونے کے درمیان اٹکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”تو پھر یہ آنسو کیسے کیا ہوا ہے زارون نے کچھ کہا ہے؟“

”نہیں، وہ تو مجھ سے اپنا ہر تعلق توڑ چکے ہیں جب سے میں یہاں آئی ہوں انہوں نے مجھے ایک بھی کال نہیں کی بلکہ کبھی مسیح کر کے بھی میرا حال نہیں پوچھا۔ دی جان میں مانتی ہوں میری غلطی تھی جو میں نے اُس خدیجہ پہ اعتبار کیا پر آپ بتائیں کیا میں چاہتی تھی کہ میرے ساتھ وہ سب ہو؟“، آنکھوں میں شکوہ لیے اُس نے ساجدہ بیگم سے پوچھا جو پہلے سے جانتی تھی کہ اُس دن زارون نے ضرور کوئی بات کی تھی جس کی وجہ سے نور نے اُن کے ساتھ یہاں آنے کا فیصلہ کیا اور تب سے اب تک وہ اُن سے جھوٹ بولتی اُن کو تسلی دیتی آئی تھی کہ زارون اُسے روز کاں کرتا ہے۔

”وہ غلطی تم نے انجانے میں کی تھی پر یہ غلطی تم نے جان بوجھ کے کی ہے۔ تمہیں مجھے شہر میں ہی بتا دینا چاہیے تھا کہ زارون نے تم سے کیا کہا پر لگتا ہے تمہیں اپنی دی جان پر اعتبار نہیں تھا جو پچھلے ڈریٹھ مہینے سے یہ دکھا پنے اندر لیے پہنچی ہو۔“

”نہیں دی جان ایسی بات نہیں ہے میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی مجھے لگا کہ میں کچھ دن دور رہوں گی تو زارون خود ہی مجھے منا نے آجائے گا پر۔۔۔“ اپنی بات ادھوری چھوڑتے اُس نے افسوس سے نظریں جھکا لیں۔

”پر یہ کہ میں نے تمہیں اُس وقت بھی سمجھایا تھا کہ اس بار پہل تمہیں ہی کرنی پڑے گی پر تم نے ایک ہی بار میں ہار مان لی اپنے حق کے لیے تو لوگ آخری سانس تک لڑ جاتے ہیں مگر میری جان تم نے زارون کے وقتی غصے کو یہاں آ کر اور ہوادے دی۔ میں نے کتنا سمجھایا تھا تمہیں کہ ہمارے ساتھ مت آؤ لیکن تم نے کیا کیا“، گھری سانس لیتے انہوں نے نور کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں ایک بار پھر سے

اشک بہانے لگیں۔

”میں بات کروں گی زارون سے تم پر پیشان مت ہو اور یوں رورو کر خود کو ہلکا ن مت کرو ان شاء اللہ جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا“، اُسے اپنے ساتھ لگاتے ساجدہ بیگم نے تسلی دی اور آج ہی زارون کی کلاس لینے کا سوچتے نور کو چپ کروانے لگیں جوان چند دنوں میں ہی پر پیشانی سے آدھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

دی جان کے سامنے رونے کے بعد نور کا دل کافی ہلکا ہو چکا تھا تب ہی وہ اُن کے کہنے پر نہ انے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد نیچے آگئی جہاں اب احتشام صاحب بھی زمینوں سے واپس آچکے تھے۔ ”السلام علیکم بابا سائیں“، اُن کے آگے سر جھکاتے نور نے احترام سے کہا تو احتشام صاحب نے مسکراتے ہوئے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”وعلیکم السلام، کیسی ہے میری بیٹی؟“ سلام کا جواب دیتے انہوں نے خوشدلی سے پوچھا۔

”جی بابا میں ٹھیک ہوں پر آپ آج دوپھر کے کھانے پر کیوں نہیں آئے؟“ رشیدہ کو جانے کا اشارہ کرتے نور نے خود چائے کا کپ اٹھا کر احتشام صاحب کو تھماتے ہوئے سوال کیا۔

”وہ بس زمینوں پر تھوڑا کام تھا ویسے بھی آج موسم کے تیور کچھ ٹھیک نہیں ہیں، لگتا ہے بارش ہوگی اسی لیے بس پانی کی نکاسی وغیرہ کا انتظام کرواتے تھے اتنا وقت لگ گیا“، چائے کا گھونٹ لیتے انہوں نے نور کے سوال کا جواب دیا جواب شہنماز بیگم اور ساجدہ بیگم کو چائے دیتے اپنا کپ لیے اُن کے قریب ہی بیٹھ چکی تھی۔

”اچھا میں نے تو آج آپ کی فیورٹ چکن کڑا ہی بنائی تھی سوچا آج آپ سے اپنی کتنی ساری تعریفیں سنوں گی پر آپ نے نہ آ کر میرا سارا موڈ خراب کر دیا“، منه بسو رتے اُس نے مان کے ساتھ شکوہ کیا۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی احتشام صاحب اور شہنماز بیگم نے بالکل اُسے بیٹیوں کی طرح رکھا

ہوا تھا اسی لیے وہ اتنی جلدی اُن سے اتنا گھل مل گئی کہ ہر بات اور شکوہ آسانی سے کر لیتی تھی۔

”او تو یہ بات ہے تب ہی میں سوچوں آج میرے نہ آنے پر اتنی بے چینی کیوں اور اگر تم نے بنائی ہے تو لے آؤ میں ابھی کھا کر تعریفیں کر دیتا ہوں،“ نور کے منہ ب سور نے پرانہوں نے چائے کا کپ واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا تو اُس نے آنکھوں میں چمک لیے اخشم صاحب کو دیکھا جنہوں نے اُسے سکندر صاحب کی ساری بے رخی اور باتیں بھلا دی تھیں۔

”جی بابا میں ابھی لائی،“ اُن کی بات سنتے ہی وہ خوشی خوشی اٹھ کر کچن کی جانب بڑھی تو ساجدہ بیگم اخشم صاحب سے انماج کے بارے میں پوچھنے لگیں جو کل ہی انہوں نے غریبوں میں باٹنے کے لیے تیار کروایا تھا۔



شام کے سائے ڈھلنے کے ساتھ ہی اخشم صاحب کے مطابق بارش شروع ہو چکی تھی تب ہی نور نے دی جان کے منع کرنے کے باوجود بھی سب کام چھوڑ کر باہر کا رخ کیا کیوں کہ اب اُسے نہ تو بارش سے خوف آتا تھا اور نہ ہی بادلوں کے گر جنے سے، بلکہ بارش کے ساتھ جڑی کچھ خوبصورت یادیں اُسے اپنی سمت کھینچتی تھیں تب ہی وہ بے فکر ہو کر گاؤں کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ وہاں کی ہر بارش کو انجوائے کرنے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اُس نے اپنے اندر کے ہر ڈر کو باہر نکال دیا تھا کیوں کہ زاروں کی جدائی کا خوف اس قدر شدید تھا کہ اُسے ہر ڈر اُس کے آگے معمولی اور بے وقعت سالگنے لگا پر دی جان کے صبح کے دلساں اور تسلیوں نے اُس کے اندر ایک امید پیدا کی تھی تب ہی آج کافی دنوں بعد وہ بارش کو ادا سی کے بجائے دل کی خوشی سے انجوائے کرنے کے بعد مغرب کی اذان کی آواز سنتے ہی اندر آئی تاکہ کپڑے وغیرہ چینچ کرنے کے بعد نماز ادا کر سکے۔

نماز ادا کرنے کے بعد اُس نے نیچے جانے کا ارادہ ترک کیا اور کچھ دیرا آرام کی غرض سے لیٹ گئی

پر ابھی اُسے لیٹے کچھ دیر ہی گزری تھی جب رشیدہ نے دروازے پر دستک دیتے اُسے ساجدہ بیگم کا پیغام دیا جو اُسے نیچے اپنے کمرے میں بُلارہی تھیں۔

”ٹھیک ہے آپ جائیں میں آتی ہوں“، اُس سے کہنے کے ساتھ ہی نور نے اپنے بال سمیٹے جو ابھی تک گلے تھے اور دو پڑھے ٹھیک سے اوڑھتے اپنے کمرے سے نکل کر نیچے آگئی جہاں ساجدہ بیگم اُسی کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

”دی جان آپ نے بُلایا تھا“، نور نے دستک دیتے اندر قدم رکھا تو وہاں موجود شخص کو دیکھ کر اُس کے لفظوں کے ساتھ قدم بھی ساکت ہوئے۔

”ہاں، بیٹھا دھرا آؤ میرے پاس“، ساجدہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اپنے پاس بُلایا تو زارون (جو شہنماز بیگم کے منہ سے دی جان کی سخت خرابی طبیعت کا سنتے سارے کام چھوڑ کر فوراً ہی حوالی پہنچا تھا جہاں دی جان کو بالکل ٹھیک اور خوش باش دیکھ کر اُسے اپنی بے وقوفی اور جلد بازی پر افسوس ہوا) نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر اُسے دیکھنا گوارا نہیں کیا جس کی نظریں مسلسل اُس کے غصیلے چہرے کا طواف کرنے میں مصروف تھیں۔

”دی جان میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں آپ پلیز میرے لیے چائے اوپر ہی بھجوادیجیے گا“، نور کے بیٹھتے ہی اُس نے کھڑے ہوتے کہا اور ساجدہ بیگم کا جواب سنے بغیر ہی کمرے سے نکل گیا۔

”یہ کب آئے؟“ اُس کے جاتے ہی نور نے حیرت سے پوچھا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے ہی آیا ہے اور تم ان باتوں کو چھوڑ دا اور جاؤ، جا کر اُسے کپڑے وغیرہ نکال کر دو۔ میرا بچہ بے چارہ سارا بھیگ گیا بارش میں“، دی جان نے فکرمندی سے کہا تو نور ان کی بات سنتے ہی سوچ میں پڑ گئی۔

”آپ نے بلوایا ہے انہیں؟“ دی جان کے سامنے زارون کو احترام سے پکارنا اُس کی مجبوری تھی

تب ہی اُس نے اسے کے بجائے انہیں کا استعمال کیا۔

”انہیں بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی تھی بُلانے کی میں نے تو شہناز سے بس اتنا کہا تھا کہ اسے بتا دے کہ تمہاری دی جان بیمار ہیں ضرورت ہو تو آکر دیکھ جاؤ،“ ساجدہ بیگم نے آنکھوں میں شرارت لیے کہا تو نور نے فکرمندی سے اُن کی طرف دیکھا۔

”آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا کیوں کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ زارون یہاں زبردستی یا کسی کے بلانے پر آئے،“ نور نے نظریں جھکائے مایوسی سے کہا تو دی جان نے اُس کا ہاتھ تھامتے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”جب کوئی اپنا راستہ بھٹک جائے نا تو اُسے یوں بے سہارا اور بے لگام نہیں چھوڑتے کہ وہ تنگ آکر اپنے لیے کسی دوسرے راستے کا انتخاب کر لے اور میں نے بھی وہی کیا تاکہ کل کو زارون تنہائی کا عادی ہو کر تم سے بالکل بے نیاز نہ ہو جائے اور اپنے لیے اُس زندگی کا چنانچہ کر لے جو نہ تو اس کے حق میں تھی نہ ہی تمہارے اور بڑوں کا فرض ہوتا ہے کہ جہاں چھوٹے غلطیاں کریں انہیں سمجھایا جائے اور میں نے بس اپنا فرض پورا کیا اس لیے بہتر ہے کہ تم یہاں بیٹھ کر اس طرح کی فضول باتوں پر غور کرنے کے بجائے اُس کے پاس جاؤ اور جو کام تم آج سے ڈیر ڈھونینے پہلے نہیں کر پائیں اب کرو۔ نور میری بیٹی مرد کو عورت کے لاپرواہونے یا اُس سے دور رہنے پر تباہ فرق پڑتا ہے جب عورت نے اُسے اتنا مان اور پیار دیا ہو جس کی اُس کو ضرورت تھی اور تم دونوں کا معاملہ اس سے کچھ ہٹ کر ہے۔ پہلے تم نے اپنے رشتے میں لاپرواہی بر تی اور اب زارون بر تر رہا ہے تاکہ تم اُسے سمجھو تم کسی کے کہنے میں آکر اُس کے قریب مت جاؤ وہ اپنے رشتہوں میں بہت اناپسند ہے اور تمہارے معاملے میں تو وہ انہا پسند بھی ہو گیا ہے اس لیے اُسے خود سے دور رکھ کر مزید تکلیف مت دو تم نے آج اُسے نہ سن بھالا تو وہ ہمیشہ کے لیے پھر بن جائے گا،“ بہت نرمی اور پیار سے ایک ماں کی طرح انہوں نے نور کو سمجھایا جو ان کی باتیں پوری توجہ سے

سُن رہی تھی۔

”ٹھیک ہے دی جان آپ جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گی“، اُن کی بات مکمل ہوتے ہی نور نے انہیں زارون کو جلد راضی کر لینے کی تسلی دی اور اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی تاکہ اوپر جا کر اُس کھڑوس کو دیکھ سکے جو پچھلے ڈیڑھ مہینے سے اُس سے منہ موڑے بیٹھا تھا۔

☆☆☆

کمرے میں آتے ہی زارون کو شدت سے اپنی بے وقوفی پہ غصہ آیا کہ کیوں اُس نے شہناز بیگم کی بات پر یقین کیا۔

”یہ عورتیں ہوتی ہی چالاک ہیں۔ ہم مرد معصوم ان کی باتوں میں آجاتے“، الماری سے اپنے کپڑے نکالتے وہ مسلسل بڑھتا ہا تھا جب کسی نے دروازے پر دستک دی۔

”آجائیں“، زارون کو لگا شاید خانسماں چائے لے کر آیا ہے تب ہی بے فکری سے اجازت دیتے اپنی شرط پہننے لگا۔

”تم، تم یہاں کیوں آئی ہو؟“، نور کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے شرط کے بُن بند کیے جو اُسے دیکھتے ہی جلدی سے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ رخ پھیر چکی تھی۔

”کیا مطلب کیوں آئی ہوں، آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب یہ میرا کمرا ہے اور پچھلے ڈیڑھ مہینے سے میں یہیں قیام پذیر ہوں“، کہنے کے ساتھ ہی نور نے قدم آگے بڑھائے اور زارون کی یقین دہانی کے لیے الماری کا دوسرا حصہ کھولا جس میں اُس کے کپڑے اور چیزیں ترتیب سے رکھی تھیں۔

”تو ٹھیک ہے ناب میں یہاں آگیا ہوں اس لیے اپنی چیزیں سمیٹو اور یہاں سے نکلو“، زارون پہلے ہی اُس کی چیزیں دیکھ چکا تھا پر خود کو انجان ظاہر کرتے اُس نے الماری میں سے اُس کے کپڑے نکال کر بیڈ پر پھینکے۔

”کیا مسئلہ ہے تمہیں؟ اور میں کہیں نہیں جاؤں گی بلکہ تم بھی کہیں نہیں جاؤ گے اب،“ آنکھوں میں چمک لیے وہ اُس کے قریب آئی جو اُس کے بد لے ہوئے رنگ دیکھ کر دنگ رہ گیا پر کچھ بھی اُس پر ظاہر کیے بغیر اُس نے ایک نظر نور کے ہاتھوں کو دیکھا جواب اُس کے سینے پر دھرے تھے۔

”تمیز سے رہولڑ کی اور اپنی حد کراں کرنے کی کوشش مت کرو،“ اپنے سینے پر رکھے اُس کے ہاتھ کو جھٹکتے زارون نے غصے سے کہا تو نور نے پیچھے ہٹنے کے بجائے اپنے بازو اُس کی گردان میں حائل کیے۔

”حد میں ہی ہوں اور شاید تم بھول رہے ہو کہ میں اڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ تمہاری بیوی ہوں اور تمہارے قریب آنے اور تمہیں چھوٹے کا حق رکھتی ہوں،“ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے نور نے پوری جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کرتے زارون کے ماتھے پر پڑتی تیوریوں کو ہاتھ سے مٹانے کی کوشش کی۔

”مجھے پتا ہے میں نے زندگی میں بہت سی بے وقوفیاں کی ہیں پر اب تمہیں مزید ناراض رکھ کر میں ان تمام بے وقوفیوں کو پھر سے دوہرانا نہیں چاہتی اس لیے تمہیں جتنا غصہ کرنا ہے جتنا مجھے ڈالننا ہے ڈالنٹ لو پر پلیز مجھے یوں خود سے دور مت کرو، میرے پاس تمہارے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے،“ آہستگی سے سر اُس کے سینے سے لگائے نور نے اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کی۔

”سوری، میں نے سنا نہیں کہ تم نے کیا کہا، ہم شاید تم نے کہا کہ میں تمہیں ڈالنٹ لوں غصہ کروں پر کس حق سے؟ تم نے تو کبھی آج تک مجھے اتنا حق بھی نہیں دیا کہ اپنی زندگی میں تھوڑی سی اہمیت تھوڑی سی جگہ دے سکو بلکہ تمہیں تو مجھ سے زیادہ اُس دوست کو اہمیت دینا بہتر لگا جو تمہیں اُس دلدل تک لے گئی جہاں اُس دن اگر احمد نہ پہنچتا تو۔“ اُس کے بازو اپنی گردان سے نکالتے زارون نے بات کو ادھورا چھوڑا اور نور کو خاموش دیکھ کر کمرے سے باہر نکل گیا جو اُس کی ادھوری بات کا مطلب اچھے سے سمجھ چکی تھی اور جو بھی سمجھی تھی وہ کسی اذیت سے کم نہیں تھا تب ہی اُس نے زارون کے جاتے ہی بیڈ پر پڑے

اپنے کپڑوں کو دیکھا جن کی بالکل اُس کے وجود کی طرح نہ تو اس کمرے میں کوئی جگہ تھی اور نہ ہی اس گھر میں۔



زارون کو ہولی آئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا پر اُس نے نور کو دوبارہ اپنے قریب آنے یا بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ دی جان اور باقی گھروالوں کی وجہ سے رات اُس کے سونے کے بعد کمرے میں آتا اور اُس کے انٹھنے سے پہلے ہی کمرے سے نکل جاتا اور سارا دن اختشام صاحب کے ساتھ باہر رہتا تاکہ نور کو اُس سے بات کرنے کا کوئی موقع نہ ملے اور دوسری طرف نور نے بھی اُس دن کے بعد سے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا کیوں کہ اُس کے روکھے اور سخت رویے نے اُسے کافی دلبر داشتہ کیا تھا اس لیے رات اُس کے آتے ہی وہ نیند نہ آنے کے باوجود بھی سوتی ہوئی بن جاتی تاکہ اُس کے احساس کو کچھ دیر کے لیے ہی سہی پر اپنے قریب محسوس کر سکے۔

آج زارون کی طبیعت صحیح سے ہی کچھ خراب تھی شاید موسم کی تبدیلی تھی جس کی وجہ سے اُسے جسم میں درد کے ساتھ بخار بھی محسوس ہو رہا تھا تب ہی وہ اختشام صاحب کے ساتھ جانے کے بجائے گھر پر ہی رک گیا تاکہ آرام کر سکے۔

”یہ زارون کہاں ہے؟ آج صحیح سے نظر نہیں آیا“، ساجدہ بیگم نے اپنے کمرے سے باہر آتے لاونچ میں آ کر اپنے تخت پر بیٹھتے ہوئے شہناز بیگم سے پوچھا جو نور کے ساتھ مل کر دوپھر کا کھانے بنانے میں مصروف تھیں۔

”طبیعت خراب ہے اُس کی صحیح اختشام نے بلوایا تھا پر اُس نے آگے سے طبیعت کی خرابی کا کہتے آج گھر پر ہی رک کر آرام کرنے کا کہہ دیا“، اپنا کام چھوڑ کر انہوں نے باہر آ کر ساجدہ بیگم کو بتایا جنہوں نے سنتے ہی فکر مندی سے اپنی چھڑی انٹھائی۔

”کیا ہوا میرے لعل کوارکسی نے مجھے کیوں نہیں بتایا، رشیدہ رشیدہ کہاں ہو؟“ ساجدہ بیگم نے کہنے کے ساتھ ہی رشیدہ کو آواز دی جو شہناز بیگم کا کمرا صاف کرنے میں مصروف تھی۔

”کچھ زیادہ نہیں بس بخار ہے شاید موسم کی تبدیلی کی وجہ سے ہے اس لیے آپ پریشان نہ ہوں میں ابھی کچھ دیر پہلے ہی ناشتہ کروا کے دوائی دے کر آئی ہوں ان شاء اللہ جلدی ہی ٹھیک ہو جائے گا،“ ساجدہ بیگم کو اٹھتا دیکھ کر شہناز بیگم نے تسلی دی اور انہیں زارون کے سونے کا بتا کروا اپس تخت پر بٹھایا۔ ”اچھا پر میں ایک نظر دیکھ لیتی تو دل کو سکون مل جاتا پتا نہیں میرے بچے کی خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی کچھ ہی دنوں میں بالکل مر جھا سا گیا ہے۔“

”ہمم مجھے بھی یہی لگ رہا ہے تب ہی میں نے سوچا ہے کہ ہم زارون اور نور کی ولیمے کی تقریب رکھ لیں تاکہ گھر کے ماحول میں کچھ تبدیلی آئے،“ شہناز بیگم نے اپنے ذہن میں چلنے والے ارادے سے ساجدہ بیگم کو آگاہ کیا تو انہوں نے اُن کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے میں بھی کافی دنوں سے نوٹ کر رہی ہوں کہ جیسے نور اور زارون ہمیں دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں ویسا کچھ نہیں ہے بلکہ ان کے درمیان کچھ بھی ٹھیک نہیں،“ ساجدہ بیگم نے بھی اپنے خدشے کو ظاہر کیا تو شہناز بیگم نے اُن کی بات کی تصدیق کی۔

”جی مجھے بھی یہی لگتا ہے تب ہی میں نے سوچا کہ ہم یہ تقریب رکھ لیں تاکہ ان دونوں کے نیچ جو یہ دوریاں ہیں وہ ختم ہوں،“

”ٹھیک ہے پھر میں آج ہی اخشمام سے بات کر کے کوئی ڈیٹ فلکس کرتی ہوں اور تم جاؤ نور سے کہو کہ کاموں کو چھوڑے اور زارون کے پاس جائے اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کسی چیز کی ضرورت پڑے،“ اُن کی بات پر غور کرتے ساجدہ بیگم نے کہا تو شہناز بیگم اثبات میں سر ہلاتے کچن کی جانب بڑھیں تاکہ نور کو زارون کے پاس جانے کا بول سکیں۔

☆☆☆

دو پھر سے رات ہو چکی تھی پر زارون کا بخار کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ چکا تھا تب ہی احتشام صاحب نے ڈاکٹر کو کال کی جو کچھ ہی دیر میں زارون کو چیک کرنے کے بعد میڈیسین دے کر چلا گیا۔ دی جان شہناز بیگم اور احتشام صاحب شام سے ہی زارون کے پاس اُس کے کمرے میں موجود تھتہ تب ہی نور نے ان سب کو اپنے ہونے کا یقین دلاتے آرام کرنے کا کہا کیوں کہ وقت کافی ہو چکا تھا۔

”ٹھیک ہے امی، شہناز اُجھیں اب نور کو بھی آرام کرنے دیں زارون اب ٹھیک ہے“، احتشام صاحب نے ان دونوں کو تسلی دی اور اپنے ساتھ لیے نیچے آگئے تو نور نے ان کے جاتے ہی اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور زارون کے قریب آبیٹھی جو کچھ دیر پہلے ہی سویا تھا۔

”پتا نہیں کیوں پر تمہاری اتنی نفرت اتنی ڈانٹ بھی مجھے تم سے دور نہیں کر سکی بلکہ تمہارا یہ مغرب و رانہ رو یہ تمہاری یہ اکٹھ مجھے تمہارے اور قریب لے آئی ہے، ہاں نور کو تم سے محبت ہونے لگی ہے۔ تمہاری ہر چیز ہر بات مجھے اچھی لگنے لگی ہے بس اب تم بھی یہ ناراضی چھوڑ دوتا کہ ہم دونوں پچھلی تمام باتوں کو بھول کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکیں ایسی زندگی جس میں صرف تم ہو، میں ہوں اور ہماری چھوٹی سی دنیا“، اس کے قریب بیٹھتے نور نے اُس کی بخار سے پتی ہوئی پیشانی پر بوسہ دیا تو زارون نے اُس کے پہلے لمس پر با مشکل خود کو آنکھیں کھولنے سے روکا۔

”مجھے پتا ہے کہ جب سے میں تمہاری زندگی میں آئی ہوں میں نے تمہیں بہت تنگ کیا ہے بہت سی غلطیاں کیں جس کے لیے تم نے مجھے معاف کر دیا کیوں کہ وہ صرف میری اور تمہاری ذات تک محدود تھیں مگر اس بار میں نے جو غلطی کی ہے وہ نہ تو معمولی تھی اور نہ ہی ہم دونوں کی ذات تک محدود، تب ہی شاید تم اب تک مجھے معاف نہیں کر پائے یا یہ کہنا بہتر ہو گا کہ اس بار میں نے صحیح معنوں میں تمہارا دل دکھایا اسی لیے تم میرے معاملے میں اتنے پتھر دل ہو گئے ہو کہ میری کوئی انتباہ کوئی معافی حتیٰ کہ میرا کوئی

آنسو تمہیں نظر نہیں آرہا، کہنے کے ساتھ ہی ایک موتی ٹوٹ کر زارون کے گال پر گرا جسے جلدی سے صاف کرتے اُس نے وہاں سے اٹھنا چاہا مگر زارون نے فٹ سے آنکھیں کھولتے اُس کا ہاتھ تھاما۔

”تمہارے معاملے میں زارون علی کا دل کبھی بھی پتھر نہیں ہو سکتا اگر وہ محبت کرنا اور اسے پانا جانتا ہے تو نجھانے کے لیے اپنی جان تک دے سکتا ہے بس تم کبھی حق سے مانگ کر دیکھو اگر کبھی انکار کرو تو جو سزاد یا چاہو گی مجھے منظور ہے، اُس کا ہاتھ اپنے سینے پر دل کے مقام پر رکھتے زارون نے اُس کے اقرار محبت پر اسے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر محبت کے اقرار پر انسان کو خالی ہاتھ لوٹا دیا جائے تو وہ تکلیف نہ تو لفظوں میں بیان ہوتی ہے اور نہ ہی اُس کا علاج کوئی طبیب کر سکتا ہے۔ بس زندگی بھر کی کسک رہ جاتی ہے جو انسان کو آہستہ آہستہ اندر ہی اندر ختم کرتے دیک کی طرح چاٹ کر اُس کی روح تک کا سفر طے کر لیتی ہے جو بہت تکلیف دہ ہوتا ہے اور وہ نور کو کبھی بھی وہ تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا جس سے وہ خود کافی بارگز رچکا تھا۔

”مطلوب تم میرے ساتھ ابھی بھی محبت نبھاؤ گے یہ جانتے ہوئے کہ تم مجھے جہاں سے لے کر آئے تھے اُس جگہ پر کوئی سات پردوں میں بھی اپنا وجود چھپا کر رکھے پر کھلائے گانا پاک ہی، آنکھوں میں ایک آس لیے اُس نے زارون سے وہ سوال کیا جو ایک بار پہلے بھی اُن کے رشتے میں دراڑ ڈال چکا تھا۔

”میں نے کہانا کہ تم مجھ سے مجھے حق سے مانگو تو زارون علی کبھی انکار نہیں کرے گا اور دوسری بات پوری دنیا بھی ایک طرف ہو جائے تمہیں بُرا کہے تو زارون علی تمہیں اپنے ساتھ کھڑا ملے گا۔ وہ تب بھی تمہیں کبھی بُرانہیں کہے گا کیوں کہ اُس نے تمہیں جانا ہے، پر کھا ہے تم بہت معصوم ہو نور جو اس ظالم دنیا کو پہچان نہیں پائی اور یہ سب ہماری قسمت میں لکھا تھا اسے ایسے ہی ہونا تھا اس لیے خود کو مزید تکلیف مت دو یہ سوچ کے کہ میں کبھی تم سے تمہارے کردار کی صفائی مانگوں گا اور جس دن میں مانگوں سمجھ لینا زارون

علی بدل گیا، تم بے شک میری محبت کو الوداع کہہ کر چلی جانا، اُس کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگاتے وہ نرمی سے اُسے اپنے حصار میں لے چکا تھا جس کے آنسو قطار در قطار اُس کے گالوں پر بہہ نکلے۔

”نور صرف تمہاری ہے وہ تم سے کبھی بے وفائی نہیں کرے گی،“ سوں سوں کرتے اُس نے آنسوؤں کے درمیان اپنی بات مکمل کی تو زارون نے اُسے اپنے ساتھ لگایا۔

”جاننا ہوں تم بد تیز ہو چڑیل ہو پر باوفا ہو،“ نم آنکھوں سے مسکراتے زارون نے اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا جواب اُس کے سینے میں منہ چھپائے سکنے لگی تھی۔

”نور یا ریس کرو کیا سارے آنسو آج ہی بہادوگی اور میری جان میں تمہیں یاد لا دوں کہ مجھے پہلے ہی بخار ہے جس کی وجہ سے میرے سر میں درد ہے اور اب تمہارے اس رو نے دھونے سے مزید ہو گیا ہے اس لیے پلیز چپ کرجاؤ،“ زارون نے اُسے کھل کر آنسو بہانے دینے کے بعد ٹوکا تو اُس نے اُس کے سینے سے سراٹھا یا جہاں سے اُس کی ساری شرط وہ اپنے آنسوؤں سے ترکر چکی تھی۔

”چپ ہو جاؤ اب کس بات کا رونا ہے جوتب سے آنسو بہار ہی ہو،“ سائیڈ ٹیبل پر رکھے ٹشوکے ڈبے سے ٹشوں کا لتنے زارون نے خود ہی اُس کے آنسوؤں کو صاف کیا۔

”بس مجھے ڈرگ رہا تھا کہ اگر تمہاری یہ ناراضی کچھ اور دن قائم رہتی یا تم آج میری محبت کا جواب محبت سے نہ دیتے تو میرے ساتھ ساتھ میرا دل بھی ما یوس ہو جاتا،“ سوں سوں کرتے اُس نے ٹشو اُس کے ہاتھ سے لیتے خود اپنا چہرہ صاف کیا۔

”تو میں نے تمہیں اور تمہارے دل کو اس ما یوسی سے بچالیا ہے نا جس کا تمہیں ڈر تھا تو بس پھر اب سارے ڈر اور خوف اپنے دل سے نکال دوا اور وہاں صرف مجھے جگہ دوتا کہ تمہیں ہر پل یا احساس رہے کہ زارون علی کبھی بھی تم پر کوئی تکلیف، کوئی دکھنیں آنے دے گا،“ اُس کے بال پچھے کرتے وہ نرمی سے اُس کے گال سہلا نے لگا جو آج بھی رو نے سے سرخ ہو چکے تھے۔

”اگر زارون علی مجھے تکلیف نہیں دے سکتا تو پچھلے دو مہینوں سے ایسا رویہ کیوں؟ اور تم نے اُس دن مجھے اپنے کمرے سے کیوں نکالا کیوں تم مجھے دیکھ کر اتنا غصہ ہوئے؟ اور جب میں نے دی جان کے ساتھ گاؤں آنے کا کہا تو تم نے مجھے روکا کیوں نہیں؟“ اُس کی بات سنتے ہی نور نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ ڈالے۔

”پتا نہیں شاید اُس وقت عالیان کی بے وفائی کا زخم اتنا تازہ تھا کہ میں پچھ سوچ ہی نہیں پایا اور مجھے اُس وقت تمہاری سب سے زیادہ ضرورت تھی جب تم نے سارا وقت یہ باتیں سوچنے میں لگا دیا کہ میں تمہیں قبول نہیں کروں گا۔ دیکھو نور اگر میں نے تمہیں قبول نہ کرنا ہوتا تو میں کیوں تمہیں اُس جگہ سے واپس لاتا؟ اور دوسری بات جب تم نے اپنے کردار کی گواہی دی مجھے اپنا آپ، بہت معمولی لگا اپنی محبت ہوں زدہ اور منافق لگی۔ تم مجھے اُس بات کی گواہی دے رہی تھی جس سے میں پچھلے پانچ سالوں سے واقف تھا۔ بس مجھے غصہ تھا ساتھ یہ بھی احساس کہ تم اب کی بار بھی خود سے میرے پاس نہیں آئی بلکہ دی جان کے کہنے پہ آئی ہو مجھے اور تکلیف دہ اور بُرالگا جس کی وجہ سے میں نے اب تک تمہیں خود سے دور رکھا تاکہ تم کسی اور کی وجہ سے میرے قریب مت آؤ بلکہ تم بھی اُس جذبے اُس احساس کو محسوس کرو جو میں تمہارے لیے کرتا ہوں۔ تمہیں پتا ہے محبت کا جواب محبت میں نہ ملے تو انسان برداشت کر لیتا ہے پر بے انہما محبت کے بد لے آپ کو دوسری طرف سے بے رخی اور بے اعتباری ملے وہ بھی تب جب آپ اپنا سب کچھ ایک انسان کے لیے وقف کر چکے ہوں تو یقین جانو انسان کہیں کا نہیں رہتا وہ اُس دعا کی طرح بن جاتا ہے جونہ تو فرش پر پلٹتی ہے اور نہ ہی عرش تک پہنچتی بلکہ نیچ راستے میں اٹک کر انسان کو یہ وہم دلاتی ہے کہ وہ قبول ہو چکی ہے یا ہو جائے گی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اب میں ساری زندگی اُس دعا کی طرح گزاروں تب ہی میں نے تمہیں وقت دیا سوچنے کا سمجھنے کا تاکہ تم خود فیصلہ کرو کہ تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے یا نہیں، اُس کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگاتے زارون نے بے حد نرمی سے اپنی بات سمجھائی۔

”اگر میں نہ رہنا چاہتی تو؟“ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے نور نے ایک اور سوال کیا۔

”تو بھی میں تم سے دست برداز نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ میں یہ تو برداشت کر سکتا کہ تم مجھ سے دور رہو مجھ سے بات نہ کرو پر میری نظروں سے اوچھل ہو یہ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا،“ اُس کے سوال کا جواب دیتے زارون نے اُسے خود سے مزید قریب کیا تو نور نے اُسے ایک گھوری سے نوازا۔

”زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ میں ابھی بھی ناراض ہوں، کیسے تم نے اتنے دن مجھ سے بات نہیں کی مجھ پہ غصہ کیا ساتھ اتنی بار مجھے ڈانٹا بھی،“ منه ب سورتے نور نے اپنے لاڈ انٹھوانا ضروری سمجھا۔

”ٹھیک ہے میں منالوں گا پرا بھی نہیں ابھی سو جاؤ بہت وقت ہو گیا ہے ویسے بھی ہمیں صبح جلدی نکلنا ہے،“ اپنے ہونٹ اُس کی پیشانی پر رکھتے زارون نے کمفر ٹرائس کے اوپر دیا۔

”کہاں جانا ہے؟“ آنکھوں میں تجسس لیے اُس نے سوال کیا۔

”بس یہ سر پرائز ہے اس لیے کل تک کا انتظار کرو بے بی،“ اپنے ہونٹ اُس کے رخسار سے مس کرتے زارون نے اُسے کشمکش میں ڈالا۔

”زارون پلیز بتا دو نا مجھ سے انتظار نہیں ہوتا،“

”اُف میری جان سر پرائز کا مطلب ہوتا ہے راز اور راز وقت سے پہلے بتا دیا جائے تو سارا مزہ خراب ہو جاتا ہے۔ اس لیے صبر کرو صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے،“

”پر تھوڑا اسا اشارہ ہی دے دو کہ کہاں جانا ہے،“ اُس کی پوری بات سنتے نور نے کہا تو زارون نے ابر واچکا تے اُسے دیکھا جو مسکین سی شکل بنائے اُس کے جواب کی منتظر تھی۔

”کیا کروں میں تمہارا قسم سے بہت ہی بد تینیز ہو،“ اپنی مسکراہٹ چھپاتے زارون نے اُس کی ناک دبائی جو بد تینیز لفظ سنتے ہی پوری آنکھیں کھولتے اُسے گھورتے ہوئے دوسرا طرف کروٹ لے کر

خاموشی سے لیٹ گئی۔

”سو جاؤ دیکھنا صبح جب تم اچانک اُس جگہ کو دیکھو گی تو تمہیں بہت خوشی ہو گی اور میری جان رونے کا پروگرام تم نے وہاں بھی شروع کرنا ہے اس لیے اب اپنی آنکھوں کو سکون دو،“ اپنے حصار میں لیتے اُس نے نور کے کان کے قریب سرگوشی کی تodel میں کشمکش لیے وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر آنکھیں موندے سونے کی کوشش کرنے لگی تو زارون نے لیمپ کی ہلکی سی روشنی گل کی تاکہ خود بھی سو سکے۔

☆☆☆

صحح ہوتے ہی زارون نے اپنے ایک قریبی دوست کی شادی میں جانے کا بتایا اور سب کو تیار ہونے کا کہا تو نور نے بھی خاموشی سے کوئی بھی سوال و جواب کیے بغیر شہناز بیگم کا لا یا ہوا ڈر لیں پہنا جو انہوں نے اُسے پکھ دن پہلے ہی لا کر دیا تھا۔

”زارون دیکھو میں ٹھیک لگ رہی ہوں نا؟“ اُسے کمرے میں آتا دیکھ کر نور نے چہرے پر فکر مندی سجائے سوال کیا۔

”ہمم اچھی لگ رہی ہو،“ سرتاپاؤں اُس کا جائزہ لیتے جو سرخ گلر کے سمبل سے قیمص شلوار میں (جس کے بازوؤں اور گلے پر ڈل گولڈن گلر سے کیا گیا ہلا نفیس کام اُسے مزید خوبصورت بنارہا تھا) کہ ساتھ گولڈن گلر کا دوپٹہ لیے (جس کے پلوؤں پر قیمض کی ہی طرح کا کام ہوا تھا) ہلکے میک اپ کے ساتھ بالوں کو ڈھیلے سے جوڑے کی شکل دے کر، کانوں میں گولڈن گلر کے ٹاپس اور گلے میں نازک سی چین پہنے کھڑی زارون کی اتنی سی تعریف پر منہ پھلا چکی تھی۔

”بس ٹھیک لگ رہی ہوں؟“ اُس کے جواب کو دو ہرا کر نور نے سوال کیا تو زارون نے اُس سے نظریں ہٹاتے اثبات میں سر ہلا کیا۔

”میں نے کہا اچھی لگ رہی ہو بلکہ بہت اچھی، بس اب مزید ٹائم ضائع مت کرو اور آ جاؤ نیچے

سب لوگ تیار بیٹھے ہیں، اپنا والٹ اور موبائل اٹھاتے اُس نے نور سے کہا جو ویسے ہی منہ پھلانے کھڑی تھی۔

”کیا ہوا جانا نہیں کیا؟“ اُسے وہیں کھڑا دیکھ کر زارون نے پلٹ کر پوچھا۔

”نہیں جانا مطلب کہ حد ہے تمہیں تو ٹھیک سے کسی کی تعریف بھی کرنی نہیں آتی۔ میں اتنی محنت سے تمہارے لیے تیار ہوئی اور تم نے ایک سرسری سی نظر ڈال کر کہہ دیا کہ اچھی لگ رہی ہو۔ بھاڑ میں جاؤ تم،“ دانت پیستے اُس نے اپنے غصے کا اظہار کیا تو زارون نے اُس کی بات سنتے ہی گھری سانس لی اور قدم واپس اُس کی جانب بڑھائے جو چھرے پر بارہ بجائے کھڑی تھی۔

”اچھی مطلب ہوتا ہے، بہت پیاری لگ رہی ہو، اپنا ہاتھ اُس کی کمر پر رکھتے زارون نے اُسے خود سے قریب کرتے اپنی بات کو جاری رکھا۔

”بالکل پری جیسی بلکہ بے بی ڈال لگ رہی میری جان،“ اُس کی پیشانی پر بوسہ دیتے زارون نے تعریف کی تو نور نے شرماتے ہوئے پلکیں جھکاتے شکریہ ادا کیا۔

”تمہینک یو۔“

”بس اتنا بہت ہے یا ارجھوٹ بولوں؟“ آنکھوں میں شرارت لیے اُس نے نور سے پوچھا جو شرمانے کے چکر میں اُس کی بات کا مفہوم سمجھے بغیر ہی اثبات میں سر ہلا گئی۔

”مطلب ارجھوٹ بولوں؟“ زارون نے تصدیق چاہی تو نور نے اُس کے لفظوں پر غور کرتے اُسے پیچھے کی جانب دھکیلا۔

”تم ہو ہی بد تمیز،“ غصہ سے لال ہوتے اُس نے زارون کو مزید چند القابات سے نوازا اور ایک کشن اٹھا کر اُس کی جانب اچھاتے اپنا پاؤچ اٹھاتے کمرے سے نکل گئی تو زارون بھی مسکراتے ہوئے اُس کی پیچھے ہی باہر کی جانب بڑھا۔

☆☆☆

”یہ، یہاں یہ تو۔“ زارون نے سکندر صاحب کے گھر کے سامنے گاڑی روکی تو نور نے حیرت سے اپنے سامنے موجود گھر کو دیکھا جہاں روشنیوں کے ساتھ کافی چھل پہل بھی تھی۔

”ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ مجھے نہیں جانا یہاں پلیز زارون گھر چلو،“ ایک نظر اس جگہ کو دیکھنے کے بعد نور نے آنکھوں میں نمی لیے زارون سے کہا جواب گاڑی ایک سائیڈ پر لگاتے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور گھوم کر اس کی جانب کا دروازہ کھول چکا تھا۔

”کیوں نہیں جانا؟ نور دیکھو بیٹا زندگی میں بہت سی رنجشیں ایسی آتی ہیں جنہیں بھولنا انسان کے بس میں نہیں ہوتا پر اگر انہیں یاد رکھنے سے تکلیف ہو تو مجھے لگتا ہے ان کو بھول جانا ہی بہتر ہے، باقی تمہارے گھروالوں کا عمل زارون کے عمل کا جواب تھا اس وقت حالات ایسے تھے کہ وہ نہ تو تم پر اعتبار کر سکتے تھے نہ زارون پر اس لیے جہاں تک تمہیں لگتا ہے کہ تم بے قصور ہو تو میری جان قصور وار وہ بھی نہیں،“ دی جان نے بہت نرمی سے اُسے سمجھایا جس کی آنکھیں ضبط سے سرخ ہو چکی تھیں۔

”پردی جان یہ لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں میں یہاں نہیں جاؤں گی،“ پوری بات سننے کے بعد نور نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

”نفرت نہیں کرتے بس کچھ غلط فہمیوں کی پڑی تھی جو کچھ وجوہات کی وجہ سے ان سب کی آنکھوں پر بندھ گئی تھی جسے اللہ پاک نے بہت طریقے سے اُتار دیا ہے تب ہی تمہارے ابو اور بھائی زارون کے پاس آئے تھے تم دونوں کو منانے۔“

”مطلوب آپ یہ سب جانتی تھیں کہ زارون ہمیں کہاں لے کر جا رہا ہے؟“ حیرت سے اُن کا چہرہ دیکھتے اُس نے سوال کیا تو ساجدہ بیگم نے اثبات میں سر ہلا�ا۔

”ہاں ہم سب ہی جانتے تھے اور تم بھی اب جان لو کہ تمہارے ابو کے ساتھ ساتھ تمہارے بھائی

اور پھوپھو بھی اپنے کیے پر شرمندہ ہیں اور ان سب کو اپنی کی ہوئی زیادتی کی سزا مل چکی ہے اس لیے اب تم بھی انہیں معاف کر دو اور اپنادل صاف کر کے ان تمام خوشیوں کی جانب قدم بڑھاو جو تمہاری منتظر ہیں، اُس کے آنسو صاف کرتے دی جان نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا تو نور نے ایک نظر شہناز بیگم اور اخشم صاحب کو دیکھا جو اُس کے فیصلے کے انتظار میں تھے۔

”ٹھیک ہے،“ اثبات میں سر ہلاتے اُس نے زارون کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھاما اور گاڑی سے باہر نکل کر ان سب کے ساتھ ہی اندر کی جانب بڑھی جہاں حارث اور حاشر نے اُسے دیکھتے ہی اپنے سینے سے لگایا اور تمام پرانی رنجشوں کو ختم کرتے اندر کی جانب لے کر بڑھے جہاں سکندر صاحب صحیح سے اُسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

فریجہ بیگم اور سارہ سے ملنے کے بعد اُس کے اندر کے باقی شکوئے شکایات بھی ختم ہو گئے تب ہی اُس کی نظر وہیل چیز پر بیٹھے اپنے باپ پر پڑی جو آج بے بسی کی تصویر بنے اشارے سے اُسے اپنی جانب بُلارہے تھے۔

”ابو یہ سب کیسے ہوا؟“ نور نے اُن کے قریب نیچے زمین پر بیٹھتے اُن کے لاچار وجود کو دیکھا تو سکندر صاحب کی آنکھیں اشکبار ہوئیں انہوں نے اپنے ہونٹ ہلاتے کچھ کہنے کی کوشش کی پر آج اُن کے الفاظ اُن کا ساتھ چھوڑ چکے تھے تب ہی با مشکل اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے انہوں نے نور کے سامنے جوڑے جس نے تڑپ کر اُن کے ہاتھوں کو اپنے چہرے سے لگایا۔

”میں نے آپ کو معاف کیا بس آپ بھی مجھے معاف کر دیں،“ آنسو بہاتے آج وہ اپنے رشتؤں کے نیچے خود کو جتنا بھی خوش نصیب سمجھتی کم تھا۔

”لبس اب یہ رونے دھونے کا پروگرام ختم کرو یا پہلے ہی میری شادی آپ سب کی وجہ سے پورے نو مہینے لیٹ ہو چکی ہے اب بھی کیا آپ لوگ چاہتے ہیں کہ میں پھر سے کچھ مہینے انتظار

کروں،”، حارت نے نور کے چپ ہونے کے کوئی آثار نہ دیکھ کر خفگی سے کہا تو سکندر صاحب کے ساتھ ساتھ نور کے چہرے پر بھی مسکرا ہٹ آئی کیوں کہ وہ آج سمجھ چکی تھی کہ غلطیوں کو معاف کر دینا اور ان سے سبق سیکھنا ساری عمر بیٹھ کر ان پر ماتم کرنے یا خود کو تکلیف دینے سے بہتر تھا۔

☆☆☆

ایک بھر پور شام کے بعد تقریباً رات دس بجے ختم ہوئی تو زارون نے واپسی کی تیاری پکڑی تب ہی ساجدہ بیگم نے ان سب کو زارون اور نور کے ولیے کی تقریب کا بتاتے گا اُن آنے کی دعوت دی۔

”ٹھیک ہے ہم ضرور آئیں گے پر ہمارا تو خیال تھا کہ ہم نور کو یہاں سے اپنے گھر سے رخصت کریں تاکہ جو ہمارے دل میں اس کی خوشیاں دیکھنے کی کسک ہے وہ ختم ہو،“ فریجہ بیگم نے اپنے خیال کا اظہار کیا تو حارت اور حاشر کے ساتھ ساتھ سکندر صاحب نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”جی میرا بھی یہی خیال تھا اگر آپ لوگ بُرانہ منا آئیں تو،“ حارت نے بھی اپنی خواہش کا اظہار کیا تو زارون نے دی جان کو اشارے سے منع کیا۔

”ٹھیک ہے ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں تھا پر مجھے لگتا ہے اب زارون اور نور کو اعتراض ہو سکتا ہے،“ ساجدہ بیگم نے ساری بات ان دونوں پر ڈالی۔

”نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں،“ نور نے زارون کے منع کرنے کے باوجود ہامی بھری۔

”پر مجھے ہے کیوں کہ مجھے لگتا ہے کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے وہ اپنے مناسب وقت پر ہی ہو تو اچھا لگتا ہے اور اب جب کہ سب کو اس شادی کا پتا ہے ہم بھی اپنے رشتے داروں کو مناسب الفاظ میں بتا چکے ہیں ایسے ایک دم خصتی کرنا لوگوں کی بندز بانوں کو دوبارہ سے بتیں کرنے کا موقع دینے کے متزadف ہوگا،“ اخشم صاحب نے زارون سے پہلے ہی اپنی رائے کا اظہار مناسب الفاظ میں کیا۔

”بات تو ٹھیک ہے آپ کی بس پھر ٹھیک ہے ہم و یہے کے فنکشن کو، ہی بارات کا فنکشن سمجھ کر انجوائے کر لیں گے،“ فریحہ بیگم نے اُن کی بات سمجھتے غصہ کیے بغیر کہا تو حاشرا اور حارث نے بھی احتشام صاحب کی بات کو اہمیت دی اور پچھدیر مزید اُسی خوشگوار ماہول میں با تین کرنے کے بعد اجازت طلب کرتے واپسی کے لیے نکل پڑے۔



گاؤں کا سفر لمبا ہونے کی وجہ سے زارون اُن سب کو اپنے ساتھ اپارٹمنٹ لے آیا تاکہ رات وہاں گزار کر صحیح سکون سے گاؤں جاسکیں۔ اپارٹمنٹ پہنچتے ہی احتشام صاحب الگ کمرے میں اور، شہنماز بیگم، ساجدہ بیگم کے ساتھ اُن کے کمرے میں تھکاوت کا بولتے آرام کرنے چلی گئیں اور نور بھی سارا دن سفر اور تقریب کی تھکاوت پر ڈھال ہو کر اپنے کمرے میں جا کر لیٹتے خالدہ بیگم کے بارے میں سوچنے لگی، جن کے بارے میں اُسے فریحہ بیگم نے بتایا تھا کہ کیسے انہوں نے ملائکہ کو قتل کیا اور اب خود پچھلے تین مہینوں سے کو مہے میں ہیں تب ہی جنید اور سلیم صاحب تقریب میں شرکت کے لیے نہیں آئے۔ اُن کے انعام کو سوچتے ابھی اُسے لیٹے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ اُسے اپنے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تب ہی اُس نے اپنا دوپٹہ لیتے اٹھ کر چاروں طرف نظر دوڑائی جہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

”اُف یہ زارون کو اس کو اس وقت ہی کام یاد آنا تھا،“ نور نے دل میں خوف زدہ ہوتے اُسے کو سا جو ابھی کچھ دیر پہلے ہی ایک کام کا بولتے باہر گیا تھا۔

”میں نے کہا بھی تھا ٹیرس کا دروازہ بند کر دینا پڑھیں میری تو کوئی بات سمجھ، ہی نہیں آتی،“ خود کلامی کرتے وہ ٹیرس کا دروازہ بند کرنے کے لیے اٹھی اور جیسے ہی اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو کسی نے پچھپے سے اُسے اپنی جانب کھینچا۔

”تمہیں کیا لگا کہ تم اتنی جلدی مجھ سے دور ہو جاؤ گی؟“ اُس کے منہ پر ہاتھ رکھتے اُس شخص نے اُس کے کان کے قریب ہوتے سرگوشی کی تو خوف سے نور کا پورا وجود کا نپنے لگا۔

”تمہیں کیا لگا تم مجھ سے اتنی جلدی پیچھا چھڑ والوگی اور میں تمہیں اتنی آسانی سے زارون کا ہونے دوں گا تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے زین کبھی بھی تمہیں نہیں چھوڑے گا،“ آہستگی سے ہونٹ اُس کی گردن پر رکھتے اُس نے بوسہ دیا تو نور کو وہ لمس جانا پہچانا سالگا اور ساتھ آواز بھی، تب ہی اُس نے خوف کے باوجود بھی اُس کا ہاتھ ہٹاتے اپنا رخ دوسری جانب کیا جہاں کھڑے انسان کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”زارون تم زین کیسے ہو سکتے ہو؟ نہیں تم نہیں ہو، وہ تو عالیاں تھا،“ خود کو پیختے سے روکتے اُس نے اٹکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”کیوں میں کیوں نہیں ہو سکتا اور عالیاں نے تمہارے ساتھ جھوٹ بولاتا کہ تم اپنی غلطی کو چھپانے کے لیے مجھے کچھ نہ بتاؤ اور وہ اپنا کام آسانی سے کر سکے،“ دو قدم اُس کی جانب بڑھاتے زارون نے اُسے پیچھے دیوار کے ساتھ لگایا جو بھی تک آنکھوں میں خوف لیے کانپ رہی تھی۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا اُس نے مجھے خود بتایا تھا کہ وہ زین ہے،“ نور نے نفی میں سر ہلاتے اُس کی آنکھوں میں دیکھا جو اپنا موبائل آن کرتے اُس کے تمام میسجر نکال کر اُس کے سامنے کر چکا تھا۔

”رشتے میں بے اعتباری کا یہی انجام ہوتا ہے کہ دشمن آسانی سے وار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جیسے کہ عالیاں نے کیا اور تمہیں تو اُسی دن سمجھ لینا چاہیے تھا جب اُس نے زین ہونے سے انکار کیا حالانکہ اُس کے پاس موقع تھا اگر وہ زین ہوتا تو وہ بہت آسانی سے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکتا تھا،“ اُس کا ہاتھ پکڑ کے بیٹھ پر بٹھاتے زارون نے اُس کے ڈر کوم کرنے کی کوشش کی جو ایک دم سے زین کا نام سنتے اور اُس کا وجود محسوس کرتے اُس کے چہرے پر آچکا تھا۔

”پرتم نے یہ سب کیوں کیا مطلب پہلے زین اور اب زارون، تم زین بن کر آسانی سے مجھ سے نکاح کر سکتے تھے پھر یہ زارون بن کر اتنا کچھ کیوں کیا؟“ نور نے اپنے ذہن میں چلتے سوالوں کو زبان پر لاتے اُسے دیکھا جواب اُس کے قریب ہی بیٹھ چکا تھا۔

”اس لیے، کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم زین سے بدگمان ہو اور اپنی زندگی میں ایک واحد رشتے سے بھی تمہارا اعتبار اٹھ جائے جس پرتم نے زندگی میں سب سے زیادہ اعتبار کیا۔ میں چاہتا تھا کہ تمہارے دل میں محرم بن کر اپنی جگہ بناؤں اور میں کیسے زین کی صورت تمہارا اعتبار توڑ سکتا تھا؟ کیسے میں تمہیں تمہارے ایک واحد رشتے سے بدگمان کر سکتا تھا جس پر تمہیں یقین تھا مان تھا کہ جو بھی ہو جائے پر آر بھ مجھے تکلیف نہیں دے گا اسی لیے میں نے زارون بن کر تم سے نکاح کیا کیوں کہ میں خود سے ہی جیلیس تھا مجھے اپنا آپ نامحرم کی صورت تمہارے دل میں بستا اچھا نہیں لگا، میں چاہتا تھا کہ تم محرم کی صورت مجھ سے محبت کرو، اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے زارون نے جواب دیا تو نور نے شکوہ کنال نظروں سے اُسے دیکھا۔

”پر پھر بھی تم زین کو میری نظروں میں اچھا نہیں بن سکے کیوں کہ وہ بے شک تم ہی تھے پر تھے تو نامحرم اور اللہ نے مجھے اُسی بات کی سزا عالیان کی شکل میں دی میں تب سے اب تک اپنے دل میں یہ کسک لیے بیٹھی ہوں کہ کاش میں اُس سے بات نہ کرتی تو میرے ساتھ ایسا نہ ہوتا“، اپنا ہاتھ آہستگی سے اُس کے ہاتھ کے نیچے سے نکالتے نور نے گھری سانس لیتے خود کو پر سکون کیا۔

”عالیان نے بس میری دوستی کا، میرے بھروسے کافائدہ اٹھایا، ٹھیک کہتی ہیں دی جان کبھی کسی کو اپنے دل کے راز سے آگاہ نہ کرو کیوں کہ جب انسان کسی کو اپنے دل کے راز سے آگاہ کر دیتا ہے تو وہ اُس کی مٹھی میں قید ہونے لگتا ہے جیسے میں ہوا۔ میں نے اپنی اور تمہاری ہر بات عالیان کو بتائی مطلب میں تم سے بات کرتا ہوں یہ سب عالیان کو پتا تھا تب ہی اُس نے ان سب سے فائدہ اٹھاتے تمہیں

تکلیف دی کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ تم میرے لیے سب سے قیمتی ہو، پھر سے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے وہ اُس کے سامنے زمین پر بیٹھ چکا تھا جو آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں ہلاکا ہو رہی تھی۔

”تم نے یہ بات مجھے تب کیوں نہیں بتائی جب عالیان نے زین ہونے سے انکار کیا تھا؟“ پلکیں اٹھاتے اُس نے اپنے دل میں اٹھنے والے طوفان کو روکا جو یہ راز جانے کے بعد بہنے کے لیے تیار تھا۔

”تب موقع نہیں تھا ایسی باتوں کا اور تمہیں پتا ہے اُس دن تمہاری اسی بات کی وجہ سے عالیان پھنسا تھا اگر تم یہ بات نہ کرتی تو شاید میں اُس پر اعتبار کر لیتا پر دیکھو میرا تمہیں یہ سب نہ بتانا ہمارے کام آگیا وہ کہتے ہیں ناہر بات اور کام کے پچھے اللہ کی مصلحت ہوتی ہے اور اس کے پچھے بھی تھی تب ہی جب تم نے آخری میسح کیا کہ تم اب مجھ سے بات نہیں کرو گی کیوں کہ تم اپنے شوہر کو دھوکا نہیں دے سکتی، قسم سے دل کیا فوراً جا کر تمہیں بتا دوں تمہارا دل ہلکا کر دوں پر پتا نہیں کس چیز نے مجھے روکا میں کیوں تمہیں بتا نہیں پایا، نم آنکھوں سے مسکراتے اُس نے نور کو دیکھا جس کا ضبط جواب دے چکا تھا ایک گناہ کا احساس کہ وہ عالیان تھا اُس سے بات کرنے کی وجہ سے یہ سب ہوا اُس کے دل سے دھل چکا تھا۔“

”قسم سے مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنی نادان ہو کہ میرے اتنے ثبوت چھوڑنے کے باوجود بھی نہیں سمجھی کہ میں ہی زین ہوں۔ اس دن یونی میں تمہیں میسح کیا کہ کہاں ہو، تم نے کہا یونیورسٹی ہوں اور اُس کے فوراً بعد میرا آنا نکاح کرنا تمہیں سمجھنہیں آیا تھا کیا اور جب تم زین سے بات کر رہی تھی اُسی وقت میرا وہاں آنا تمہیں تب بھی سمجھنہیں آیا؟ اُف اللہ کس بے قوف کے پلے باندھ دیا مجھے، سردونوں ہاتھوں میں لیتے اُس نے نور کو بہت سی باتوں سے آگاہ کیا جو اُس کے سامنے ہونے کے باوجود بھی اُس سے سمجھنہیں آئی تھیں۔“

”ہونہہ میں نے بس ایک بار تمہاری فون پر آوازنی تھی مجھے کیا پتا تھا کہ تم زین ہو اور عالیان نے جب کہا تو مجھے یقین آگیا، آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے رکڑتے اُس نے جواب دیا تو زاروں نے ہاتھ

اپنے سر پر مارا۔

”نور میری جان پتا مسئلہ کیا ہے؟“ زارون نے سوالیہ نظر وں سے اُسے دیکھا۔

”کیا؟“

”یہی کہ باتوں کو سمجھنے کے لیے دماغ کی ضرورت ہے جو تمہارے پاس ہے نہیں اور میری جان بعض دفعہ کہانی کے کردار جو ہمیں دکھائے جاتے ہیں یا نظر آتے ہیں وہ ویسے نہیں ہوتے کیوں کہ لکھنے والا ہمارے دماغ سے کھلیتا ہے وہ اُس کردار کو ہمیشہ پردے میں رکھتا ہے جو سب سے اہم ہوتا ہے اور زین کا کردار سب سے اہم تھا جس نے اپنی منزل پر پہنچ کر ہی تمہارے سامنے آنا تھا تو بس دیکھو میں تمہارے سامنے ہوں اب جو سزادی ہے دے دو،“ اُس کے قریب بیٹھتے زارون نے آنکھوں میں چمک لیے کہا تو نور نے کچھ کہنے کے بجائے اُس کے سینے سے سر ٹکایا۔

”تم صرف میری ہو بس زارون علی کی، نور کا نام اس دنیا میں بھی میرے نام کے ساتھ آئے گا اور آخرت میں بھی،“ اُسے اپنے حصار میں لیتے زارون نے محبت سے چور لبھے میں کہا تو نور نے سر اٹھاتے اُس کی پیشانی پر اپنے لب رکھے تو زارون نے اُسے اپنے حصار میں لیا۔

”میں نے یہ کہا تھا کہ یہ آنسو تمہیں اور خوبصورت بنادیتے ہیں پرمجھے نہیں پتا تھا کہ تم میری بات کو اتنا سیر لیں لے لوگی،“ ہونٹ اُس کی آنکھوں میں رکھتے زارون نے شکوہ کیا تو نور نے مسکراتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں بس محبت ہی محبت تھی۔



ختم شد